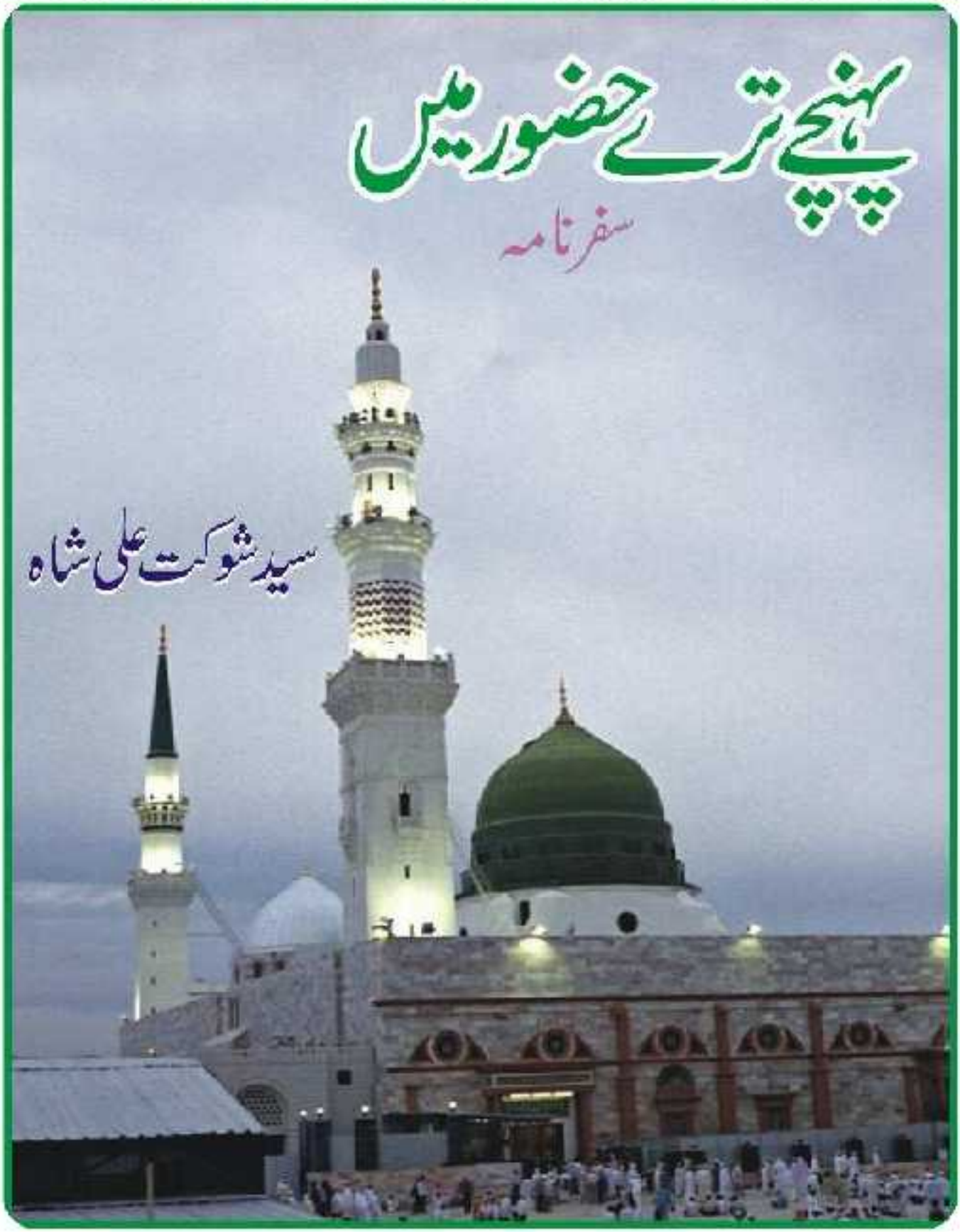
پہنچے ترے حضور میں
سفرنامہ
سید شوکت علی شاہ

سوئے حجاز چل

میں نے حج بیت اللہ کا کبھی سوچا تک نہ تھا۔ یہ نہیں کہ خواہش نہ تھی۔ کسی بھی مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہو سکتی ہے۔ اکثر لوگ سوچتے ہیں کہ ابھی کیا جلدی ہے۔ چند برس اور سہی۔ ویسے بھی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ معاشی ناہمواریاں' معاشرتی ناصبوریاں' دنیا کے جھمیلے' زندگی کے موج میلے' یہ سوچ بھی قائم رہتی ہے اور کاروان حیات بھی غیر محسوس انداز میں آگے بڑھتا رہتا ہے حتیٰ کہ اچانک ایک دن چار سو گھنٹیاں بجنا شروع ہو جاتی ہیں۔ وقت کا غلام در وجود پر دستک دیتا ہے اور سرپٹ دوڑتا ہوا رہوار زیست لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔ اس وقت' ان آخری لمحوں میں آدمی کو احساس ہوتا ہے کہ بڑی دیر ہو گئی۔ اس طرح سب حسرتیں' خواہشیں' آرزوئیں اور ارادے بھی انسان کے ساتھ دفن ہو جاتے ہیں۔

مجھے کسی قسم کی بشارت بھی نہ ہوئی تھی، نہ کسی مجذوب سے پالا پڑا تھا جس نے لٹھ مار کر حج کا راستہ آسان بنا دیا ہو' نہ کسی پیر فقیر نے اپنے روایتی مبہم اور زو معنی الفاظ میں یہ مژدہ سنایا تھا اور نہ کبھی خواب میں نورانی چہرے' سبز لباس پہنے' کسی گھڑ سوار بزرگ سے ملاقات ہوئی تھی جنہوں نے تھاپڑا مار کر فرمایا ہو' "اٹھ اے غافل انسان' دیکھ تو سہی یہ روشن راستے کس منزل کی طرف جا رہے ہیں..... خواب بھی آتے تھے تو بڑے اوٹ پٹانگ اور بے ہنگم قسم کے۔ کبھی چیف سیکرٹری صاحب ناراض ہو رہے ہیں کہ امن عامہ کی صورت بگڑتی جا رہی ہیں تو کبھی گورنر صاحب کی جھڑکیاں سہنی پڑتیں جو تعمیراتی منصوبوں کی بروقت تکمیل کے خواہاں تھے..... شاید دنیادار اور گنہگار انسانوں کو اچھے خواب نہیں آتے۔ جب زہد و تقویٰ کے جاگنے کا وقت ہوتا ہے اس سے تو یہ سوتے ہیں۔

لیکن کیسا ہی گنہگار اور دنیادار انسان کیوں نہ ہو' ندامت کا عنصر وجود کے کسی کونے کھدرے میں ضرور چھپا رہتا ہے۔ میرے لیے یہ بات ہی سوہان روح تھی کہ بجز ندامت رب کعبہ اور رسالت مآب کے حضور کیا لے کر جاؤں گا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خود غرضی' منافقت' لالچ' تنگ نظری اور تعصب نے ہماری زندگیوں کو داغدار کر دیا ہے۔ محض نماز پنجگانہ نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ حقوق العباد بھی عبادت کے زمرے میں آتے ہیں اور دین مبین کا یہی وہ اعلیٰ و ارفع تصور حیات ہے جو اسے دیگر مذاہب سے منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔ دیگر مذاہب میں عبادت بھی ہے' لیکن اسلام میں عبادت ہی ہے۔ ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کی رضا یا اس کے بندوں کی فلاح کے لیے کیا جائے' عین عبادت ہے۔

دراصل ہوا یوں کہ میں لاء اینڈ آرڈر کانفرنس کے سلسلے میں لاہور آیا ہوا تھا..... بڑی اہم کانفرنس تھی۔ فرقہ وارانہ تشدد اور خونریزی کے واقعات نے انتظامیہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا..... امام بارگاہوں' مساجد اور دیگر مقامات پر لوگ مذہبی منافرت کا شکار ہو رہے تھے۔ جوان' بزرگ' عورتیں' بچے سب لقمہ اجل بن رہے تھے۔ انسان انسان کو بھون رہا تھا' آدمی' آدمی کا شیطان بن گیا تھا۔ انسان اس قدر وحشی ہوسکتا ہے!'' گورنر صاحب کے لہجے میں تاسف تھا۔ ''ایک قلزم خون تھا جسے عبور کر کے ہم آزادی کی منزل تک پہنچے۔ انگریز سے نجات اور ہندوؤں سے چھٹکارا حاصل کیا۔ اب اور کتنے دریا ہمیں عبور کرنا ہوں گے؟'' ان کی درد بھری باتیں سن کر میرا ذہن بہت پیچھے چلا گیا۔ ہلاکو خان کی فوجیں بغداد پر دستک دے رہی ہیں اور شہر کے اندر مسلمان فرقہ وارانہ فسادات میں ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔ اس کا انجام..... ''تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ اس خونچکاں داستان کو گبن (GIBBON) کا ماہر قلم ہی رقم کرسکتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

''جب منگول بھیڑیے شہر میں داخل ہوئے تو قتل عام شروع ہوگیا۔ خون بارش کے پانی کی طرح گلیوں میں بہنے لگا۔ خون آلود لوتھڑے چار سو بکھرنے لگے۔ سراسیمگی کے عالم میں عورتیں اور ننھے ننھے بچے قرآن ہاتھوں میں لیے باہر نکل آئے اور رحم کی بھیک مانگنے لگے۔ ان وحشیوں نے بچوں کو نوک نیزہ پر دھر لیا۔ وہ عزت ماب عورتیں جنہوں نے کبھی ہجوم کی جھلک تک نہ دیکھی تھی سر عام برہنہ ہو کے رسوا ہوئیں..... وہ علمی اور ادبی خزانے جنہیں مسلمان خلفا نے صدیوں کی محنت سے جمع کیا تھا' صرف چند گھنٹوں میں جلا دیئے گئے..... تین دن تک خاک اور خون کی بارش ہوتی رہی۔ دجلہ سرخ ہوگیا اور مچھلیوں کی جگہ کٹے ہوئے انسانی اعضا موجوں کے زیر و بم کے ساتھ ڈوبتے ابھرتے رہے..... اس کے بعد بھی چھ ہفتوں تک رقص ابلیس جاری رہا۔ کھیت کھلیان' بستیاں اور مکان' مساجد اور مزار کچھ بھی تو باقی نہ بچا..... محلات مسمار کر دیئے گئے' بیماروں کو ہسپتالوں میں چن چن کر مارا گیا۔ تعلیمی درسگاہوں کے اساتذہ کی داڑھیاں نوچ کر جڑ سے اکھاڑ دی گئیں حتیٰ کہ مردے بھی ان کے عتاب سے نہ بچ سکے۔ ہڈیوں اور پنجروں کو قبروں سے نکال کر ان پر کوڑے برسائے گئے..... کتابوں کو نذر آتش کیا گیا اور جو بچ گئیں انہیں دریا برد کر دیا گیا۔ اس طرح پانچ سو سال کی محنت شاقہ' عرق ریزی' تجسس و تحقیق' تہس نہس ہو گئے اور قومی زندگی کا گلاب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مرجھا گیا ..... کس قدر بے سروسامانی تھی' کوئی ویرانی سی ویرانی تھی..... خلیفہ مستعصم بید مجنوں کی شاخ کی طرح لرزتا ہوا اور رواں دریائے خوں شہزادیوں کے دیدہ تر سے۔

امام حنبل کو سر بازار کوڑے مارے جا رہے ہیں۔ ان کے جسم سے رستے ہوئے خون پر مکھیاں اور مچھر جھپٹ رہے ہیں

.....امام اپنے مسلک سے ذرا بھی انحراف کے لیے تیار نہیں..... رئیس وقت کی سوچ سے متفق نہیں..... قرآن خالق ہے یا مخلوق' انسان آزاد ہے یا مجبور محض' وقدر کی اس فلسفیانہ سوچ نے سارے ملک کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے..... حیران کن بات یہ ہے کہ جس دین مبین کے ہم داعی ہیں' جس خدا اور رسول کو مانتے ہیں انہوں نے تو رواداری کا درس دیا۔ آنحضور کی ساری زندگی تحمل' برداشت اور رواداری سے عبارت تھی۔ من حیث القوم ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ یوم حساب ہم کیا جواب دیں گے؟ میں انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ بہاولپور سے میرا پی اے بلال بول رہا تھا۔ ''حج کے لیے قرعہ اندازی ہو رہی ہے' کیا آپ کا نام بھی ڈال دیا جائے؟''

''ہاں'' میں نے مختصر سا جواب دیا.....

جب میں بہاولپور واپس پہنچا تو سب سے پہلی خبر جو مجھے سنائی گئی یہ تھی کہ میرا نام قرعہ اندازی میں نکلا ہے۔ خوشی کے ساتھ ساتھ فوراً ایک فکر بھی دامن گیر ہو گئی۔ لوگ کیا کہیں گے' کمشنر تھا اس لیے نام تو نکلنا ہی تھا..... گھبراہٹ میں میں نے سارے سٹاف کو طلب کر لیا۔ اس مجسٹریٹ کو بھی بلوا لیا جس نے قرعہ اندازی کروائی تھی سب نے بیک آواز کہا کہ قرعہ اندازی منصفانہ تھی اور آپ کو اوپر سے بلاوا آیا ہے..... اس پر بھی میری تسلی نہ ہوئی اور میں خفیہ پولیس کے ایک انسپکٹر کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ اپنے طور پر تحقیق کرے..... تحقیق کے بعد اس نے رپورٹ دی کہ قرعہ اندازی ضابطہ کے مطابق اجلاس عام میں ہوئی ہے اور پہلی جماعت کے ایک بچے نے پرچی نکالی تو سب سے پہلے آپ کا نام نکلا..... میری تسلی تو ہو گئی لیکن ایک بے نام سی خلش مجھے اب بھی بے چین کیے جا رہی تھی..... جب فائل آخری منظوری کے لیے میرے پاس آئی تو میں نے اس پر نوٹ لکھا کہ میری جگہ کسی اہلکار کو بھیج دیا جائے میں اپنا بندوبست خود کر لوں گا۔ اس پر آفس سپرنٹنڈنٹ نے جو جوابی نوٹ لکھا وہ خاصا سخت تھا۔ اس نے لکھا کہ قواعد وضوابط سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کی جگہ کسی دیگر شخص کو نہ تو بھیجا جا سکتا ہے اور نہ آپ کو یہ اختیار ہے کہ کسی کو نامزد کر سکیں۔ میں نے نوٹ پڑھ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ''لبیک اللھم لبیک'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں سجدہ ریز ہو گیا۔

میرے حج پر جانے کی خبر احباب نے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ سنی۔ محبت کے پھول اور رقابت کے خار یکجا ہوئے۔ کئی طنز آلود مبارکیں بھی ملیں۔ وہ گھسا پٹا نو سو چوہوں والا محاورہ بھی سننا پڑا..... ''یار جہاں تمہارے حج پر جانے کی خوشی ہوئی ہے وہاں ایک فکر بھی دامن گیر ہے!'' میرے دوست حفیظ کھوکھر کہنے لگے:

''وہ کونسی فکر ہے جو آپ نے یہاں ابھی سے پال لی ہے؟''

''آخر تمہیں واپس بھی تو آنا ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرائے۔

''تو کیا واپس آنے پر پابندی ہے؟''

''واپس آنے کی تو نہیں باقی ہر قسم کی پابندی ہے!'' انہوں نے فقرے کو ادھورا چھوڑ دیا۔

''آپ کے ہوتے مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''میرے لیے روضہ رسول پر دعا کرو گے؟'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔

''کیا آپ کو یقین ہے کہ ایک گنہگار انسان کی دعا قبول ہو گی؟'' میں نے پوچھا

''یقیناً! خاص طور پر جب دوسرے گنہگار کے لیے مانگی جائے۔'' ان کی آنکھیں لبریز ہو گئیں۔

''کیا آپ کو علم ہے کہ آنکھوں سے پانی کب ٹپکتا ہے؟ میں نے ان کو اس کرب انگیز کیفیت سے نکالنے کی شعوری کوشش کی۔

''نہیں تو!'' انہوں نے قدرے حیرت کے ساتھ مجھے دیکھا۔

''سیانے کہہ گئے ہیں کہ آنکھ سے پانی اس صورت میں گرتا ہے جب اس کا بے جا استعمال کیا جائے یا پھر جب یہ احتجاج کرتی ہے۔'' اپنی روایتی خوشدلی سے بولے۔

''وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کونسی وجہ ہے..... ہو سکتا ہے دونوں ہوں۔'' ان کے چہرے کی پرانی بشاشت عود کر آئی۔

پھر دعوتوں اور مباروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس قدر مٹھائی کے ڈبے میں نے اپنے گھر میں بیک وقت کبھی نہ دیکھے تھے..... انواع واقسام کی رنگ برنگی سوئیٹس..... کالج کے دنوں میں ہم نے ایک فلم سات لاکھ دیکھی تھی جس میں وکیل اپنے موکل کو کہتا ہے'' یہ سات لاکھ روپے تم دیکھ اور گن سکتے ہو خرچ نہیں کر سکتے۔''

وہ مٹھائیاں جنہیں صرف دیکھا جا سکتا تھا کھا نہیں سکتے تھے۔ یہی انسانی زندگی کا المیہ ہے۔ جب کھانے کے دن ہوتے ہیں تو ماکولات کی کمی ہوتی ہے اور جب ان کی فراوانی ہوتی ہے تو برفی کی ہر قاش کے ساتھ ڈاکٹر کی سرزنش کرتی ہوئی انگلی اٹھتی دکھائی دیتی ہے..... اتھارٹی اور پراسپیرٹی Prosperity کے بھی اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ ارب پتی راک فیلر ایک سالم آلو کھانے سے پہلے دس مرتبہ ڈاکٹر سے اس کے مضمرات پوچھتا ہے۔

کھانوں کا سلسلہ ملک اقبال صاحب کے گھر سے شروع ہوا اور اختتام اظہر حسن ندیم نے کیا۔ ہم تینوں گوجرانوالہ میں اکٹھے

رہے ہیں۔اس کے بعد ملک صاحب میرے ساتھ بطور ڈی۔آئی۔جی بہاولپور بھی رہے ہیں..... ملک صاحب نہایت نیک اور زیرک انسان ہیں اور ایک کامیاب پولیس آفیسر سمجھے جاتے ہیں۔کئی عمرے کر چکے ہیں اور ان کی بیگم صاحبہ نے تو دو مرتبہ حج کیا ہے۔انہوں نے کافی معلومات فراہم کیں اور ساتھ ہی ایک کتاب روڈ ٹو مکہ بھی پڑھنے کے لیے دی۔یہ کتاب ایک نومسلم یہودی نے لکھی ہے جس کا اسلامی نام محمد اسد ہے۔اس نے سفر کے علاوہ واردات قلب بیان کی ہیں کہ وہ کونسے عوامل تھے جنہوں نے اسے دین مبین کی طرف راغب کیا.....

اظہر حسن ندیم ملک کے معروف ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ان کی کئی کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔انہیں دیکھ کر ان سے مل کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وردی کے اندر بھی ایک آدمی ہے جس کے سینے میں عام انسان کا سا دل ہے جو دھڑکتا ہے اور دھڑک کر اپنی خوشیوں' غموں' مسرتوں اور آرزوؤں کا اظہار کرتا ہے۔

ہر دعوت میں' ہر ملاقات پر احباب' عزیز رشتہ داروں کا صرف ایک ہی مطالبہ ہوتا کہ روضہ رسول پر ان کے لے دعا کی جائے ..... گڑگڑا کر' عجز و انکسار کے ساتھ' دست بستہ! یا مظہر العجائب! میں نے سوچا..... تو نے یہ کیسا انسان کامل بھیجا ہے جس نے قلوب کو منور کیا' اذہان کو جلا بخشی۔فکر کو آزاد کیا۔بتان رنگ وخوں کو پاش پاش کیا۔زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا' مرنے کے آداب بتائے۔آدمیت کو معراج بخشی۔ثبوت حق بھی پیش کیا اور پیغام حق بھی ذہن نشیں کرایا۔وہ جو کاروان انبیا کا قافلہ سالار تھا..... وہ جو افواج دیں کا شہسوار تھا' وہ جو علم وحکمت کا خزانہ تھا' وہ جو جرات وشجاعت کا سکندر تھا۔پیکر جود وسخا' مرکز صدق وصفا' کتاب اللہ کی زندہ تفسیر' آسمان رسالت کے بدر منیر۔چودہ سو برس بیت گئے' چودہ ہزار برس بیت جائیں گے' چودہ لاکھ صدیاں گزر جائیں گی۔اتباع رسول میں کمی نہیں آئے گی۔عجز وعقیدت کے چشمے کبھی خشک نہیں ہوں گے۔کروڑوں' اربوں انسان اپنی صبح کا آغاز ذات باری تعالیٰ کے بعد اس کے نام سے کریں گے۔اپنی شامیں اس کی یاد سے مشکبار کریں گے..... ایک لاکھ احادیث امام بخاری کو زبانی یاد تھیں۔مولانا عبداللہ درخواستی کے بارے میں ایسا ہی کہا جاتا ہے۔جو انہوں نے کہا' جو انہوں نے کیا جو دیکھا۔جو محسوس کیا' جس پر خوش ہوئے' جس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ماکولات' مشروبات' معمولات زندگی' اگر دو دندان مبارک شہید ہوتے ہیں تو لوگ اپنے جبڑے توڑ دیتے ہیں' اگر خون کا ایک قطرہ گرتا ہے تو لاکھوں اشک پیازی ہو جاتے ہیں۔موئے مبارک مرجع خلائق بن جاتا ہے۔پاپوش' تخت پوش چومتے ہیں۔دریدہ کالی کملی جو عقیدت کا استعارہ بن گئی۔مدینہ جو جذبوں کا نگینہ ہو گیا۔آدم سے لے کر ایں دم تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر گزرے۔شاہان پرغرور' سکندر و دارا آئے اور پیوند خاک ہو گئے۔

لاکھوں سالوں میں' اربوں انسانوں کے بیچ کیا کوئی ایسا انسان پیدا ہوا ہے؟ چشم فلک حیراں ہے۔ دھرتی نازاں' ملائیک انگشت بدنداں' ماورائے فہم وادراک' شہنشاہ لولاک' دریتیم..... امی' جو مدینتہ العلم تھا۔ سراسر حلم تھا۔ ماہر فن حرب تھا۔ سید المرسلین..... امام اولین وآخرین.....!

حج یقیناً مشکل عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے۔ ان کی ہمت' استقامت' حوصلہ' خلوص اور نیت کا' احرام' طواف حرم۔ سعی صفاومروہ' منازل' منیٰ' عرفات ومزدلفہ..... رمی' حلق..... عبادت' سفر درسفر' مادی فاصلے' روحانی مدارج' ایک بے نام سا خوف جو ہر امتحان کے وقت ذہن پر سوار رہتا ہے۔ روح کانپ اٹھتی ہے۔ جسم لرزہ براندام ہو جاتے ہیں..... لیکن ان لوگوں کی لغت میں معافی نام کا کوئی لفظ نہیں ہوتا' کوئی خانہ نہیں ہوتا۔ اس کار خیر کا آغاز تو محکمہ حج کرتا ہے اور انجام سراسر منطقی ہوتا ہے۔ کار پردازان حج کی طرف سے ہمیں جو ہدایت نامہ ملا اس کا اگر تفصیلاً ذکر کیا جائے تو پھر شاید اس رپورتاژ کی ضرورت نہیں رہے گی..... البتہ چند لطائف کا بیان نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔

18 نومبر کو محکمہ کی طرف سے اطلاع ملی کہ اگر آپ اپنی رہائش کا ازخود بندوبست کرنا چاہتے ہیں تو 19 نومبر تک ڈائریکٹر حج مکہ سے سرٹیفکیٹ حاصل کر کے بھجوائیں کہ آپ نے واقعی بندوبست کر لیا ہے۔ بصورت دیگر محکمہ کو یہ ناخوشگوار فریضہ ادا کرنا پڑے گا جو آپ کی جمع شدہ پونجی سے ۲۷ ہزار روپے کاٹ لیے جائیں گے..... بالفرض حضرت سلیمان علیہ السلام کا دور ہوتا اور وہ ملکہ بلقیس کی بجائے' تخت سلیمانی کسی حاجی کو بکمال شفقت مستعار دے دیتے تو بھی ایک دن میں محکمہ کو سرٹیفکیٹ نہ بھجوایا جا سکتا تھا۔ ان کے جنات بے شک تخت کو تو چشم زدن میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لے جا سکتے تھے لیکن پاکستان مشن کے ڈائریکٹر حج تک رسائی یقیناً ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ اگر کسی حیلے بہانے سے مل بھی لیتے تو بعد میں اپنی بے حیثیتی پر کف افسوس ملتے ..... ہم نے مکہ کے ایک ہوٹل میں اپنی ریزرویشن کا سرٹیفکیٹ بھی بھجوایا لیکن اسے قبول نہ کیا گیا۔ قانون کی اصطلاح میں ہم سے Dismissed in Limine کہتے ہیں۔

ہدایت نامہ کا دوسرا باب خطرات سے آگاہی کا تھا۔ دشوار سفر' سعودی کسٹم کا تند خو عملہ..... جو سوٹ کیس کاٹ دیتا ہے۔ جوتوں کا دولخت کر دیتا ہے..... ٹوتھ پیسٹ نہ لے جائیں۔ خضاب کی ممانعت ہے۔ قینچی' ریزر' نیل کٹر' کلون' آفٹر شیو لوشن' خطرہ ہی خطرہ۔ 11 ستمبر نے انسانی رویوں اور سوچ کو کس قدر بدل ڈالا ہے..... نیل کٹر سے جہاز اغوا کیا جا سکتا ہے۔ قینچی پائلٹ کی شہ رگ کاٹ سکتی ہے۔ کلون سے ائیر ہوسٹس اگر بے ہوش نہیں تو مدہوش ضرور ہو جاتی ہے۔ ذاتی طور پر ہمیں ان پابندیوں پر گہری طمانیت کا

احساس ہوا۔ روز شیو کرنا ایک بڑا ہی بورنگ عمل ہے اور دانتوں پر اوپر نیچے آگے پیچھے بار بار برش کو گھمانا اور گھسانا بھی کچھ ایسا خوشگوار نہیں ہوتا..... اگلے وقتوں کے لوگ کس قدر آرام سے رہتے تھے۔ کھانے کے بعد بس ایک آدھ کرّ کرّ کلی کر لی۔ اور ہاتھوں کو ڈاڑھی پر پھیرا۔ سبحان تیری قدرت کا نعرہ بلند کیا اور پھر خواب استراحت کے مزے لوٹنے لگے۔ آخر میں سرخ جلی حروف میں ایک تنبیہ بھی تھی..... منشیات خصوصاً ہیروئن لے جانے کی سزا موت ہے۔ احتیاط لازم است.....!

''کیا حجاز مقدس میں بھی لوگ منشیات لے جاتے ہیں؟'' میں نے ایک دوست سے پوچھا۔

''تم منشیات کی بات کرتے ہوئے' خانہ کعبہ مین جیبیں کٹتی ہیں۔''

''تو کیا ان کی پکڑ نہیں ہوتی؟'' مجھے واقعی حیرانی ہو رہی تھی۔

''اللہ تعالیٰ کی رسی بہت دراز ہے۔ شاید اپنی مخلوق کی اس جسارت پر ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی!..... وہ مسکرا پڑے۔

نشے سب برے ہیں' لیکن ہیروئن ام المنشیات ہے۔ دنیا کے کسی ملک میں چلے جائیں' سبز پاسپورٹ دیکھتے ہی امیگریشن کے عملے کو جھٹکا سا لگتا ہے..... اہلکار ایسی نظروں سے ہمیں دیکھتا ہے جیسے ہم گوشت پوست کے نہیں بلکہ پوڈر کے بنے ہوئے انسان ہیں۔ پوچھ گچھ کا سلسلہ اکتا دینے کے حد تک طویل ہوتا ہے۔ سامان کی تلاشی اس انہماک سے لیتے ہیں جیسے تلاش نہیں ریسرچ کر رہے ہوں۔ کچھ لوگوں کو تو ائیر پورٹ سے ہی واپس بھیج دیتے ہیں..... تقسیم سے قبل جو لوگ ولایت جاتے تھے وہ واپسی پر اپنے نام کے ساتھ بڑے اہتمام کے ساتھ انگلینڈ ریٹرنڈ لکھتے تھے اور اسے بھی ایک قسم کی کوالیفیکیشن سمجھا جاتا تھا۔ ایک سردار جی بڑے فخر سے لکھتے تھے۔ ریٹرن بائی انگلینڈ۔ احباب نے حیرانی کے ساتھ اس کا مطلب پوچھا۔ تو بولے۔ مجھے بندرگاہ سے ہی واپس بھیج دیا گیا تھا۔

مسافر شب سے اٹھتے ہیں.....

اگر سفر طویل ہو' کٹھن ہو' پر آشوب ہو تو پھر تیاری بھی اسی حساب سے کرنی پڑتی ہے۔ کئی اندیشہ ہائے دور دراز' دامنگیر ہوتے ہیں۔ سود و زیاں کا حساب رکھنا پڑتا ہے اور زاد راہ بھی اسی حساب سے لینا ہوتا ہے۔ میں طبعاً ایک جہاں گرد انسان ہوں۔ ہر سال دنیا کا اس طرح چکر لگاتا ہوں جس طرح لوگ باغ میں سیر گل کرتے ہیں۔ کوئی لمبا چوڑا اہتمام نہیں کرنا پڑتا' بلو پاسپورٹ کئی ویزوں سے نجات دلا دیتا ہے۔ ٹکٹ کوئی نہ کوئی دوست بھیج دیتا ہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے معمول ہے کہ ناروے گئے وہاں چودہ اگست کے

حوالے سے لیکچر دیا اور پھر یورپ کے ممالک میں گھومتے گھومتے امریکہ جا نکلے۔ ایک عدد کوٹ' چند پتلونیں اور قمیضیں' کسٹم کے عملہ کی خونخوار نگاہوں سے بچنے کے لیے دو چار کتابیں اور کڑکڑاتے ہوئے چند سو ڈالر..... کہ فی زمانہ یہی سکہ رائج الوقت ہے۔ شرح آرزو ہے۔ حاصل جستجو ہے۔ یہ اپنی شناخت خود ہے۔ اسے دیکھتے ہی چہرے کھل اٹھتے ہیں۔ آنکھیں مسکرانے لگتی ہیں اور دل گھڑی کے پنڈولم کی طرح سینے کی پسلیوں سے جا ٹکراتے ہیں۔

امریکہ بہادر نے ہماری زندگیوں کو کس قدر متاثر کیا ہے! سوچ کے انداز بدل ڈالے ہیں۔ اگر منی مارکیٹ میں اس کی طبیعت ذرا سی بھی ناساز ہوتی ہے تو ساری دنیا اختلاج قلب کا شکار ہو جاتی ہے۔ ان گنت جبینیں عرق آلود ہو جاتی ہیں۔ ذکر سفر کا ہو رہا تھا پتہ نہیں یہ کمبخت کہاں سے ٹپک پڑا!..... شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ خود بھی بہت بڑا مسافر ہے..... عرب کے ریگزاروں میں' یورپ کے مرغزاروں میں' افریقہ کے خارزاروں میں' اس کا سفر جاری رہتا ہے۔ یہ واحد مسافر ہے جو کسی غریب الوطن نہیں ہوتا۔ ہر ملک میں اس کی شان و شوکت' رعب و دبدبہ' جاہ و جلال دیدنی ہوتا ہے۔ شاہ و گدا' غنیم و بے نوا سب اس کو سلام کرتے ہیں.....!

لیکن یہ سفر عجیب تھا' جس کا مقصد حصول لذت نہیں بلکہ نفی ذات تھا۔ اپنے مادی سکون اور آرام کو تج دیتا تھا۔ حجاز مقدس کر رخ کرتے ہوئے ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو کمرہ امتحان میں داخل ہوتے وقت محسوس ہوتی ہے۔ کڑا امتحان' سخت ممتحن!.....

محکمہ حج نے جو ہدایت نامہ بھیجا تھا اس میں دعاؤں کا ایک طویل سلسلہ بھی تھا۔ سفر پر روانگی سے قبل کونسی دعا مانگی ہے' دوران سفر کیا پڑھنا ہے۔ کھانے سے قبل کھانے کے بعد' سونے سے پہلے' سوتے جاگتے وقت کیا کہنا ہے۔ طواف کے وقت سات پھیروں کی الگ الگ دعائیں' صفا مروہ میں کیا مانگتا ہے..... دماغ چکرا گیا۔ اس قدر دعائیں اتنے کم عرصے میں یاد کرنا میرے بس کا روگ نہ تھا۔ پھر یہ سلسلہ یہیں ختم نہ ہوتا تھا بلکہ منیٰ' عرفات اور مزدلفہ پھیلا ہوا تھا۔ رمی کے وقت ابلیس ملعون کو کن القابات سے نوازنا ہے ..... شرک کیا ہے؟ الحاد کی سرحد کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ کونسا آنسو بہانا جائز ہے؟ تضیع آب سے اجتناب..... ایسے پتہ چلتا تھا کہ اس کتاب کو ہماری وزارت حج اور سعودی علما نے مل کر لکھا ہے یا سوچ ان کی اور تحریر ہماری ہے..... دعاؤں کے ساتھ اردو تراجم بھی تھے جو با آسانی یاد ہو سکتے تھے۔ ہم نے چیدہ چیدہ دعاؤں کو حفظ کرنے کی کوشش کی' باقی کے تراجم کو ترتیب کے ساتھ بیگ میں ڈال لیا تاکہ پڑھتے وقت مقام اور دعا میں رابطہ رہے..... احرام باندھنے کے بعد محتاط رہنے کی جو تاکید کی گئی تھی اس سے جسم میں جھرجھری سی آ گئی۔

ذرا سی غفلت یا لغزش سے دم دینا پڑتا ہے جو کہ فی لغزش ایک دنبے کی قربانی ہے۔ وہاں دنبے کی قیمت پانچ ہزار روپے کے

قریب ہے۔ ڈر صرف اس بات کا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوتاہیاں بڑھ جائیں اور جیب ساتھ چھوڑ دے.....

ہم نے ہدایت نامے کو کئی بار پڑھا۔ جہاں کہیں مشکل پیش آئی تو احباب سے استفادہ بھی کیا۔ لبیک اللّٰھم لبیک کا ہزار بار ورد کیا کیونکہ یہی وہ اسم اعظم تھا جس نے سفر کی صعوبتوں کو آسان بنانا تھا اور سالہا سال سے بند دل کے دروازوں کو کھولنا تھا۔ دنیوی امور سے فارغ ہوئے تو دنیا پر توجہ دی۔ پتہ چلا کہ سامان حج کوئی عنایت اللہ نامی تاجر ہیں ان کی دوکان سے ملتا ہے۔ لبرٹی مارکیٹ چونکہ گھر سے نزدیک پڑتی تھی اس لیے ایک شام بیگم کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ سلیز مین نے بڑے غور سے ہمیں دیکھا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے شکل سے زیادہ جیب کا معائنہ کر رہا ہے..... بولا ''یہ حج ہے یا اس سے پہلے بھی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔

''پہلی مرتبہ جا رہے ہیں۔'' ہم نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا دونوں جا رہے ہیں؟'' اس نے استفسار کیا۔

''صرف مجھے بلاوا آیا ہے؟'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''کچھ پینا پسند کریں گے؟''

''کیا یہ اختلاج قلب کے لیے ضروری ہے؟''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ میرے طنز کو سمجھتے ہوئے مسکرایا۔

''آج کل مہنگائی کا دور دورہ ہے۔ قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ اب اس احرام کو ہی دیکھ لیں۔ ساڑھے پانچ سو روپے کا ہے۔ کہنے کو تو یہ دو سفید چادریں ہیں لیکن ہم نے انہیں خصوصی آرڈر پر بنوایا ہے۔ ٹاول کلاتھ' اس سے ٹکرا کر تو مکہ کی گرمی بھی پناہ مانگتی ہے لیکن یہ ٹھنڈا رہتا ہے۔ حاجی یوں محسوس کرتا ہے جیسے اس نے برف کا گالا اوڑھ رکھا ہو..... نرم' ملائم' دیدہ زیب!..... خصوصی رعایت..... آخر ہم نے بھی تو کچھ نہ کچھ ثواب کمانا ہے۔''

سیلز مینوں کی چرب زبانی کوئی نئی بات نہیں۔ وہ کھاتے ہی زبان کا ہیں۔ گاہک کو شیشے میں اتارنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

''اگر اس طرح ہر مال رعایتی نرخوں پر بیچتے رہے تو کسی دن تمہارے مالک کنگال ہو جائیں گے۔'' ہم نے اسے متنبہ کیا۔

بولا ''مالک کا بھی ایک مالک ہے۔ نیلی چھتری والا جو کیڑے کو پتھر میں روزی دیتا ہے وہ ان کی بھی رکھوالی کرتا ہے۔''

اتنے میں اس کا نائب سامان لے کر آ گیا۔ بولا ''آپ کو کتنے احرام چاہئیں۔ پانچ' دس....؟

''کیا مطلب؟'' ہم حیران ہوتے ہوئے بولے ''ہمارا ارادہ حج کا ہے مکہ میں تجارت نہیں کرنی!''

کہنے لگا''اسی لیے میں نے استفسار کیا تھا' آپ ناتجربہ کار ہیں۔پہلی مرتبہ عازم حجاز ہو رہے ہیں..... احرام پر سالن کا قطرہ گر جائے' کوئی نجس چھینٹ پڑ جائے یا کچھ اور ہو جائے تو اسے بدلنا پڑتا ہے۔گرمی کا موسم' بس کا سفر' پی آئی اے کے جہاز..... یہ تعداد بھی میں نے کم بتائی ہے۔'' مکے کے اس حروش میں اول تو ڈرائی کلینر نہیں ملتا۔بالفرض مل بھی جائے تو اس کے چارجز احرام کی قیمت سے کم نہیں ہوتے۔''

ہم نے کہا''جس طرح تمہارے مالک کا مالک ہے اسی طرح ہمارا بھی وہی کارساز ہے۔تم دو احرام باندھ دو ہم انہیں ملوث نہیں ہونے دیں گے۔''

''جو آپ کی مرضی!''اس نے عجیب نظروں سے ہمیں گھورا۔''لیکن یہ پیٹی ضرور لے کر جائیں۔یہ نہ صرف احرام کو اپنی اصل حالت میں رکھتی ہے بلکہ حاجی کے مبلغات کی بھی محافظ ہے۔جیب تراش کا تیز سے تیز استرا بھی اس کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔یہ ہم نے خصوصاً جرمنی سے منگوائی ہے۔''اس نے ایک بے ہنگم کالے رنگ کی چوڑی سی بیلٹ ہمارے سامنے رکھ دی..... ہم نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔مصری اور نائجیرین جیب تراشوں کے قصے تو ہم نے سن رکھے تھے۔ویسے بھی ہمیں کش سے زیادہ احرام کی استقامت منظور تھی لہٰذا ہم نے اسے خریدنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

''اب بل بنوالاؤ!''بیگم کہنے لگیں۔

''ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے!''وہ چہرے پر مصنوعی حیرانی طاری کرتے ہوئے بولا..... حج بہت مشکل ہوتا ہے۔اس میں کئی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔منیٰ' عرفات خصوصاً مزدلفہ میں رات کو قیام کے وقت چار سو بکھرے ہوئے پتھر جسم کو کچوکے دیتے ہیں۔یہ بستر بند ہم نے فرانس سے خصوصاً منگوایا ہے۔آپ کی خوش قسمتی سے ایک ہی باقی بچا ہے۔قیمت صرف پانچ ہزار ہے اور یہ ربڑ کا تکیہ' جس پر سر رکھتے ہی نیند کی دیوی آدمی کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔آپ یوں خواب استراحت کے مزے لوٹیں گے جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار.....!''

''ہم وہاں آرام کرنے نہیں بلکہ اسے تج کرنے جا رہے ہیں۔ایک طویل خواب غفلت سے بیدار ہونا چاہتے ہیں۔ان پتھروں کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے۔چودہ سو سال سے یہ اپنی قسمت پر نازاں ہیں۔انہوں نے رسالت مآب کے پاؤں چومے تھے۔انہوں نے صحابہ کرام کے دلوں کی دھڑکنیں سنی تھیں۔تم ہمیں ان کی قربت سے محروم کرنا چاہتے ہو؟ یہ آخری بستر بند اپنے مالک کے لیے بچا کر رکھ لو۔شاید اسے چالیسویں حج پر اس کی ضرورت پڑ جائے۔''

خجالت سے اس نے اپنا سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر بعد بل بنوا کر لے آیا۔

ہر چند کہ وزارت حج ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ معلومات فراہم کر رہی تھی لیکن تاریخ کی روانگی کا علم نہ تھا۔ کئی بار ان سے فون پر رابطہ کیا لیکن ایک ہی جواب ملتا۔ اس کا فیصلہ کمپیوٹر کرے گا۔ فی زمانہ کمپیوٹر بڑے کام کی چیز ہے اور کافی حد تک یہ اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔ یعنی سفارش نہیں مانتا اور محمود و ایاز کو بھی ایک ہی مکینیکل نظر سے دیکھتا ہے۔ لیکن جب سے یہ وطن عزیز میں آیا ہے کچھ پریشان سا لگتا ہے۔ اس کی خود مختاری پر حرف آنے لگا ہے۔ ہم اس کے کان مروڑ کر یا گدگدیاں کر کے اس سے اپنے مطلب کی چیز اگلوا لیتے ہیں۔ ہمارے کئی جاننے والے بااثر لوگ پہلے ہی پیش گوئی کر چکے تھے کہ کمپیوٹر ان کے لیے آنے جانے کی کونسی تاریخ نکالے گا۔ ہم شروع ہی سے کمپیوٹر کی مہارت سے زیادہ محکمے کی کرامات کے قائل تھے۔ وزارت حج میں چن چن کر بڑے کام کے آدمی لگائے جاتے ہیں۔ جہانیدہ' گرم و سرد چشیدہ' گرگان بارادیدہ.....! رمز شناس' سخن فہم۔ زود ہضم.....! میرا مسئلہ یہ تھا کہ مجھے حکومت پنجاب سے چھٹی لینی تھی اور درخواست حتمی تاریخ کی اطلاع ملنے کے بعد ہی دی جا سکتی تھی..... خیر خدا خدا کر کے یہ جانگسل مرحلہ بھی ختم ہوا اور مراسلہ آ ہی گیا کہ میری تاریخ روانگی 12 فروری ہے اور واپسی اٹھائیس مارچ کو ہوگی۔

اس اثنا میں ارباب بست و کشاد نے کمشنریاں ختم کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ کمشنر' ڈپٹی کمشنر' سطوت شاہی کی زندہ نشانیاں' برطانوی سامراج کی آخری کہانیاں..... کالونیل دور کی باقیات۔ اس عوامی دور میں ان کا بھلا کیا کام! یہ اس قوم کی خوش قسمتی ہے کہ آزادی کے گزشتہ پچپن برس میں ہر دور عوام کا دور رہا ہے۔ ہر حکمران قوم کے غم میں گھلتا رہا ہے۔

میرا تبادلہ بطور ممبر بورڈ آف ریونیو لاہور ہو گیا..... علم دوست گورنر رخصت ہوئے اور عمل پسند۔ گورنر نے ان کی جگہ لے لی۔ انہوں نے طوفانی دورے کئے اور ہر چیز طوفان کی زد میں آ گئی۔ گورنر ہاؤس میں سیکرٹریوں کی میٹنگ بلائی تو اہداف میں بورڈ آف ریونیو سرفہرست تھا..... مقدمات کا جلد تصفیہ۔ ''میں اس کو صحیح معنوں میں بورڈ آف ریونیو بنا دوں گا۔'' ہم نے ان کی ہدایت کو حرز جاں بنا لیا کہ بات اصولی طور پر درست تھی..... ایک مشہور مقولہ ہے کہ ''کردیوانی' ہو دیوانہ''۔۔۔۔۔۔۔ مقدمات کی طوالت فریقین کو ہلکان کر دیتی ہے۔ ان کی صعوبتیں قید و بند کی صعوبتوں سے کم نہیں ہوتیں..... ہر تین ماہ کے بعد پیشی۔ ہر پیشی پر التوا۔ وکیل کی فیس۔ منشی کا منشیانہ۔ اہلکاروں کا نذرانہ..... ساتھ آئے ہوئے دوستوں کے لیے مرغن کھانا۔ عزت سادات بھی ہو تو لٹتی نظر آتی ہے۔

اس تناظر میں جب چالیس دن کی چھٹی کی درخواست دی تو ایس۔ ایم۔ بی۔ آر سے گھبرائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔

بولے۔ ''گورنر کی تقریر تم سن ہی چکے ہو۔ ایک ممبر ریٹائر ہوگیا ہے۔ دوسرا اسٹاف کالج میں پانچ ماہ کا کورس کر رہا ہے۔ تیسرا نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب اگر تم بھی چلے گئے تو لوگ رل جائیں گے.....'' ایک لمحے کے توقف کے بعد خود ہی کہنے لگے ''حج بیت اللہ سے روکنا بھی سوظن ہے اور مجھ جیسا گنہگار اس کی جسارت نہیں کر سکتا۔ تم دن کم کرو' گورنر سے منظوری میں لے دوں گا۔''

''دن کیسے کم کئے جا سکتے ہیں؟'' میں نے سوچنا شروع کیا۔ جو کمپیوٹر وزارت حج نے اسلام آباد میں نصب کر رکھا تھا اس کی کنجی میرے پاس نہ تھی۔ پھر وہ اپنا یکطرفہ فیصلہ سنا چکا تھا اس لیے اس مشینی عدالت میں کسی اپیل یا دلیل کی کوئی گنجائش نہ تھی..... میں انہیں سوچوں میں غلطاں تھا کہ اتفاق سے ایک دن وزیر حج سے لاہور ائیر پورٹ پر ملاقات ہوگئی۔ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے۔ ''آپ سے پہلے بھی کہیں ملاقات ہوئی ہے؟''

''بالکل۔ میں نے انہیں یاد دلایا۔'' چند ہفتے قبل بہاولپور میں تین دن تک مجھے آپ کی میزبانی کا شرف حاصل رہا ہے۔''

''آئی۔سی!'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرائے اور اخلاقی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بولے Any thing that I can-do for you مولوی صاحبان انگریزی بولتے ہوئے بڑے پیارے لگتے ہیں۔ وزیر موصوف بھی بنیادی طور پر عالم دین ہیں اس لیے ان کے لبوں سے شستہ انگریزی سن کر بڑی مسرت ہوئی..... عرض کیا ''ایک چھوٹی سی تکلیف دے رہا ہوں۔ میں بھی آپ کی طرح حج بیت اللہ کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اٹھائیس مارچ تک چھٹی دینے میں حکومت پس وپیش کر رہی ہے اگر آپ اس سلسلے میں کچھ کر سکیں تو میری مشکل آسان ہو جائے گی۔

فرمانے لگے ''ہر کوئی جلد آنے کی خواہش رکھتا ہے۔ حالانکہ سرزمین حجاز میں تو ایک دن کی عبادت برسوں پر محیط ہوتی ہے۔''

''عرض کیا'' ''آپ کا کتنے دن ٹھہرنے کا ارادہ ہے؟''

منسٹر صاحب نے بیزار کن نظروں سے مجھے دیکھا اور کہنے لگے ''آپ کا کام ہو جائے گا۔ آپ میرے پرائیویٹ سیکرٹری سے رابطہ قائم کریں۔'' چند دن بعد پرائیویٹ سیکرٹری سے رابطہ کیا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ کہنے لگا ''وہ بڑے مصروف آدمی ہیں' ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں انہیں کہاں یاد رہتی ہیں۔'' بعض اوقات چھوٹے آدمی بھی بڑے پتے کی بات کر جاتے ہیں۔ اس لیے میں نے ایک مصروف وزیر کو دوبارہ یاد کرانا مناسب نہ سمجھا۔

اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہوگئی:

حاجی کیمپ دیال سنگھ کالج کے سابقہ ہوسٹل مجیٹھیا ہال میں لگایا گیا تھا۔ یہ حاجیوں کا ٹریننگ سنٹر ہے اور ہر حاجی کو ہدایت کی جاتی

ہے کہ وہ چند دن جا کر ٹریننگ حاصل کرے۔ جب حسب ہدایت میں کیمپ میں داخل ہوا تو ذہن کو ایک زبردست جھٹکا لگا..... ایک رند خرابات نے جبہ و دستار پہن لیا تھا۔ ایک مست قلندر' مجذوب بن گیا تھا..... ایک من موجی زہد و تقویٰ کے بوجھ تلے دب گیا تھا ..... آزادی اور بے راہ روی کی جگہ شرح و آئین نے لے لی تھی..... انسانوں کی طرح عمارتوں کا بھی تشخیص ہوتا ہے۔ میرا ذہن ماضی کے پردے چیرتا ہوا بہت پیچھے دوڑ گیا۔ زمانہ طالب علمی..... لاہور میں ہر قسم کے ہوسٹل تھے۔ نیو ہوسٹل جس کا وارڈن ڈاکٹر عظیم بہت سخت گیر انسان تھا۔ نو بجے کے بعد چوکیدار علم دین بغیر کے۔ ٹوکی ڈبیا اور زردالو پان کے کسی لڑکے کو اندر نہیں گھسنے دیتا تھا۔ کسی آؤٹ سائیڈر کے آنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ایف۔ سی کالج کے یو انگ ہال میں اتنی سختی تو نہ تھی لیکن لڑکے بنیادی طور پڑھاکو تھے اس لیے کسی نے وہاں جا کر کیا کرنا تھا۔ لاء کالج کا پرنسپل ڈاکٹر امتیاز بڑا ڈشکرا تھا..... بڑے فخر سے کہتا تھا کہ میں سو غنڈوں کا ایک غنڈا ہوں۔ لڑکے اس سے ڈرتے تھے' جب کبھی چھاپہ مارتا تو دو چار گردنیں دبوچ کر ہی ٹلتا.....

ان معروضی حالات میں مچھیا ہال ہی ایسا تھا جو رندوں' جواریوں' درویشوں اور سیاست دانوں کی آماجگاہ تھا۔ بڑا کشادہ دل رکھتا تھا۔ ہر کسی کو کھلی چھٹی تھی۔ کمروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا۔ ہر طرف تار عنکبوت کے جال' صحن سے اٹھتی ہوئی گرد غول بیابانی کی طرح کمروں کا طواف کرتی تھی۔ چھت کے پنکھے ٹرک کے انجن کی طرح گڑگڑاتے تھے۔ اور میس میں سارا سال ایک ہی مینو۔ صبح کو آلو گوشت اور شام کو گوشت آلو..... باایں ہمہ سر شام ہی مختلف ہوسٹلوں کے خلیفے شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے ہوئے اندر داخل ہو جاتے۔ میں یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کا صدر تھا اور ہم نے خود بھی سیاست کے تانے بانے اسی تاریخی عمارت میں بنے۔

اب جبکہ پینتیس سال بعد میں اس تاریخی عمارت میں داخل ہوا تو ہم نے فوراً ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا..... ''ارے تم یہاں کیسے گھس آئے ہو۔'' اس نے اپنی نورانی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''اور تم نے یہ کیسا حلیہ بنا رکھا ہے بہروپئے۔''

گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی آیات قرآنی کا چار سو ورد ہوتا ہوا نظر آیا۔

لبیک اللّٰھم لبیک' درود شریف' اللہ اکبر' الحمدللہ اور سبحان اللہ کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔ نورانی داڑھیوں والے لوگ چار سو گھوم رہے تھے۔ بائیں ہاتھ بینکوں کے کاؤنٹر تھے۔ دائیں ہاتھ پی آئی اے نے اپنا دفتر قائم کر رکھا تھا۔ سامنے مسجد میں لوگ عبادات میں مشغول تھے۔ گیٹ کے باہر گلاب کے ہار تھے۔ ان گنت لوگوں کا ہجوم تھا۔ عمارت کے اختتام پر بائیں ہاتھ محکمہ حج کے دفاتر تھے۔ پہلے دفتر میں کڑا پہنایا گیا جس پر نام' پتہ اور پاسپورٹ نمبر درج تھے۔ مکہ پہنچ کر حاجی اور ایک بچے میں کوئی فرق نہیں رہتا

اور گمشدگی کی صورت میں شرطے اس کو مطلوبہ کیمپ تک پہنچا دیتے ہیں۔ اگلے کاؤنٹر پر اسی قسم کا ایک تعویز پہنایا گیا' اس کا تعلق بھی براہ راست شناخت سے تھا۔ تیسرے کاؤنٹر پر گردن توڑ بخار کا ٹیکہ لگایا گیا۔ حج کے عملے کے پاس ویکسین ختم ہو چکی تھی اور اکثر حاجیوں کے وہ مشورہ دے رہے تھے کہ بازار سے جا کر ٹیکہ لگوالیں..... جب ڈاکٹر نے ٹیکہ لگایا تو مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے بغیر دوائی لگایا گیا ہو اور محض سوئی میرے بازو میں چبھو دی گئی ہے۔ میں نے اس کا اظہار کیا تو قدرے گھبراہٹ کے ساتھ کہنے لگا: ''یہ آپ کا وہم ہے ہم کیسے جسارت کر سکتے ہیں؟''

اگلے کاؤنٹر پر ہمیں کونسی دی گئی۔ ٹریولرز چیکس.....

ہر کام ایک ضابطے کے ساتھ ہو رہا تھا۔ ان تمام مراحل سے گزر کر جب میں مقامی ڈائریکٹر زیدی صاحب کے کمرے میں پہنچا تو انہوں نے نہایت خوشدلی کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ Any thing that I can do for you. جب انہوں نے بھی اس فقرے کو دہرایا تو لامحالہ مجھے وزیر موصوف یاد آئے..... میں دوبارہ شرمندگی نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ بااین ہمہ وزیر صاحب سے مجھے کوئی خاص گلہ بھی نہ تھا۔ اس وزارت میں پچاس سال سے اسی طرح کام چل رہا ہے۔ اگر مولانا عبدالستار نیازی آ گئے تو بریلی تک تاریں کھڑک گئیں۔ دوسرے فریق کو موقعہ ملا تو دیوبند کا ہر بند کھلے گا..... اگر کوئی شیعہ وزیر مقرر ہوا تو تہران کے فاصلے سکڑ گئے۔ ایک وزیر صاحب نے تو اپنے حلقے کی پوری پولیس کو اس سعادت سے نواز ڈالا تھا۔ کسی دوست نے از راہ تفنن کہا'' حاجی صاحب آپ نے ابھی سے الیکشن کی تیاری شروع کر دی ہے۔'' تو مسکرا کر کہنے لگے'' پولیس کا محکمہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ ان کو حج کرانا اور راہ راست پر لانا بھی ایک قسم کا حج ہی ہے۔''

''فی الحال تو وہ آپ کی راہ پر چل رہی ہے!'' دوست کی تسلی نہ ہوئی تھی۔ میں نو تھینکس کہنے ہی والا تھا کہ یکدم مرزا نوشہ کا کوہیولا ابھر جو دھیمے مگر صاف سروں میں گنگنا رہے تھے.....

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

لہٰذا سیر کوہ طور میں کوئی حرج نہ تھا۔ جب میں حرف مدعا زبان پر لایا تو انہوں نے جھٹ سے میز کی دراز کھولی اور تمام فلائیٹوں کی فہرست میرے سامنے رکھ کر بولے' کسی بھی مناسب تاریخ پر انگلی رکھ دیں' انشاءاللہ تعمیل ہو گی۔ چنانچہ وہیں بیٹھے بیٹھے اٹھائیس کی جگہ نو مارچ کی واپسی کی سیٹ کنفرم ہو گئی۔

سفر سے چند یوم قبل چھٹی منظور ہوگئی۔ حکومت کتنی ہی سخت گیر کیوں نہ ہو اس سلسلے میں ''ناں'' کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خوف چھپا جاتا ہے دل پہ رب العالمین کا۔ جس دن چھٹی منظور ہوئی اسی روز قاری حنیف جالندھری صاحب کا ملتان سے فون آ گیا کہ مکہ میں میری پرائیویٹ رہائش کا بندوبست ہو گیا ہے۔ کہنے لگے ''مولانا مکی صاحب' خطیب حرم نے آپ کو مہمان نوازی کا شرف بخشا ہے اور وہ آپ کی آمد کا بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں....'' قاری حنیف جالندھری مدرسہ خیر المدارس کے مہتمم ہیں۔ نہایت ملنسار اور خوش اخلاق انسان ہیں اور اپنے جوان کندھوں پر ایک بوڑھا سر رکھتے ہیں۔ ملتان میں تعیناتی کے دوران مجھے ان کا بھرپور تعاون رہا۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے دیگر علمائے کرام کے ساتھ مل کر ہم نے ''میثاق ملتان'' لکھا۔ اس میں اشتیاق حسین جعفری اور وزیر غازی پیش پیش تھے۔ ایک ضابطہ اخلاق' جس میں تمام مسالک کے لیے حدود و قیود مقرر کر دی گئیں...... پیار' محبت' اخلاق اور یگانگت اس کے بنیادی نکتے تھے۔ اپنے مسلک کو مت چھوڑو۔ دوسرے کے مسلک کو مت چھیڑو' اس کا مرکزی خیال تھا...... ہر ماہ علمائے کرام میرے گھر اکٹھے ہوتے۔ کھانے سے پہلے ایک دوسرے کے گلے شکوے سنتے۔ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جاتا۔ افہام و تفہیم اور یگانگت کی فضا میں سب ایک دوسرے سے گلے ملتے اور اس طرح شکوک و شبہات کے بادل چھٹ جاتے۔ مسائل' مصائب کا روپ اسی وقت دھارتے ہیں جب ان سے صرف نظر کیا جائے۔ ایک فعال انتظامیہ کا یہ بنیادی فرض ہے کہ نفرت کے پودے کی شروع سے ہی بیخ کنی کر دی جائے اور اسے ایک تن آور درخت نہ بننے دیا جائے۔ ہر چند کہ دیگر مدارس کی طرح قاری صاحب کے مدرسے نے بھی چند انتہا پسند لوگ پیدا کیے ہیں لیکن یہ ذاتی طور پر بڑے معتدل انسان ہیں۔ ملتان میں جب ہم نے عالمی اردو کانفرنس اور عالمی مشاعرے کا اہتمام کیا تو چند سراٹیکی نواز لوگوں کو ناگوار گزرا۔ ہندوستان سے ہم نے مسلمان اور ہندو شعرا کو بلایا تھا۔ بالخصوص گوپی چند نارنگ' جگن ناتھ آزاد اور لکھنو یونیورسٹی کے ڈاکٹر خلیق انجم تشریف لائے تھے۔ ہندوؤں کے حوالے سے انہوں نے علمائے کرام کو بھڑکانے کی کوشش کی لیکن جب انہیں پتہ چلا کہ قاری صاحب اس محفل کی روح رواں ہیں تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

پاکستان میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جس نے حج کیا ہو اور مولانا مکی صاحب کا نام نہ سنا ہو...... خطیب حرم' لسان العصر' ممتاز عالم دین' فن خطابت کے شہسوار مولانا خیر محمد مکی الحجازی گزشتہ چالیس برس سے مسجد الحرام میں درس دے رہے ہیں۔ نماز فجر کے بعد عربی زبان میں اور بعد از نماز مغرب اردو میں.... سچے عاشق رسول ہیں۔ حیات طیبہ پر ان کے لیکچرز پر مشتمل ساٹھ کیسٹیں مارکیٹ میں آ چکی ہیں۔ اذہان میں کلبلاتے ہوئے تکلیف دہ سوالات کا جواب یوں دیتے ہیں جس طرح کوئی جراح اپنے نشتر سے

دماغ میں چمٹی ہوئی جونک نکالتا ہے.... مولانا صاحب سے میری پرانی یاداللہ ہے۔ ضلع رحیم یار خان کے ایک قصبے ٹھل حمزہ کے رہنے والے ہیں۔ میں 86 تا 90 تک وہاں ڈپٹی کمشنر رہا۔ تقسیم سے قبل ان کے والد صاحب نے جو ایک جید عالم دین تھے مکہ معظمہ میں رہائش اختیار کر لی.... اس وقت مولانا صاحب جوان رعنا تھے۔ صاحب ثروت تھے لیکن ایک دن انہوں نے عیش و آرام پر لات ماردی اور بیت اللہ پہنچ کر سر بہ سجود ہو گئے۔ چالیس برس کا طویل عرصہ گزر گیا' لیکن مولانا صاحب کی استقامت' زہد اور ایقان میں کوئی فرق نہیں آیا..... حیران کن بات یہ ہے کہ انہوں نے چالیس حج کئے ہیں۔ یہ تمام عرصہ زہد و تقویٰ میں گزرا ہے لیکن زاہد خشک نہیں ہیں۔ خلق خدا سے پیار کیا ہے انہیں آزار نہیں پہنچایا۔ شعر و شاعری کے رسیا' حلقہ یاراں میں بریشم کی طرح نرم' بذلہ سنج مگر غیور و خوددار..... صاحب ثروت ہونے کے باوصف ان کا طریق فقیری ہے۔ رئیس وقت ان کی چوکھٹ پر حاضری دیتے ہیں۔ شاہان پر غرور ان کی دعا کے طالب ہوتے ہیں۔ قاری صاحب کے فون کے چند دن بعد مولانا صاحب کا خط بھی مل گیا۔ انہوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ یہ سعادت تمہیں ایک نہ ایک دن نصیب ہونی تھی۔ خط کا اختتام اس فقرے پر کیا.....

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

یہی بیت اللہ کا اعجاز ہے کہ وہاں دیوانگی اور فرزانگی کی حدیں خلط ملط ہو جاتی ہیں۔ چار سو شان خداوندی نظر آتی ہے..... اکثر اوقات یہ سلسلہ روانگی سے قبل ہی شروع ہو جاتا ہے۔ آخری سات یوم گزارنے مجھے بھی مشکل لگے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار گھر سے باہر قدم رکھنے والا ہوں۔ عربی کہاوت ہے کہ انتظار کی شدت موت کی طرح کٹھن ہوتی ہے۔ آئین سٹائین نے اپنی تھیوری آف ریلٹیوٹی کی بنیاد اسی مفروضے پر رکھی تھی۔ اگر محبوب سے ملاقات ہو تو گھڑیاں گزرنے کا احساس نہیں ہوتا بصورت دیگر وقت رینگتا ہے' سسکتا ہے' مورنا تواں کے مانند چلتا ہے۔ جوں جوں وقت زیادہ قریب آ رہا ہے' شوق اپنی انتہا کو پہنچنے لگا۔ رگ رگ میں سمیا بیت سی بھر گئی۔ ایک بے نام سا جذبہ جو بے کل کئے جا رہا تھا..... ان سات دنوں کی تفصیل لکھی جائے تو نہایت طویل ہو گی۔ عدالت میں وکلا صاحبان حج کی قبولیت کی پیشگی مبارک باد دیتے اور پھر جیسا کہ اس پیشے میں ہوتا ہے' ریلیف مانگتے۔ آپ کو ماشاءاللہ حج کی سعادت نصیب ہو رہی ہے۔ جاتے جاتے اس غریب (موکل) آدمی کا کام کر جائیں۔ آپ کو دعائیں دے گا اور سفر آسان ہو جائے گا۔ فیصلہ سناتے وقت ایک سائل نے بے جا ناراضگی کا اظہار کیا۔ میں اس کو توہین عدالت میں سزا دینے والا تھا کہ چند وکیل آ گئے۔ کہنے لگے' جناب والا! سوچ لیں! اس سے بڑی بھی ایک عدالت ہے۔ اس میں حاضری دینے والے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس غریب آدمی کی بددعائیں آپ کا پیچھا کریں۔ میں واقعی سوچ میں پڑ گیا۔ جسم میں ایک کپکپی سی طاری ہوئی اور میں نے ملزم کو

بری کر دیا..... دوست احباب کے مشوروں کی پوٹلی بہت بھاری تھی مگر مجھے بہر طور اسے بھی اٹھانا تھا۔ ایک ناصح کہنے لگے "حج پر جانے سے قبل یہ ضروری ہے کہ آئینہ دل صاف ہو اور لیے دل پر جمع سب میل اتار دو۔ جتنے دوستوں' عزیز رشتہ داروں سے ناراضی ہے سب کو راضی کرو..... خود گھر جا کر گلے ملو۔ اگر معافی نہیں مانگ سکتے تو معذرت کرو۔ کسی کا دل دکھایا ہے تو اس کی آزردگی پر ندامت اور تاسف کا پھاہا رکھ دو۔" ان کی بات سن کر میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا' اپنے اندر جھانکا۔ سب زخم' سب چرکے مجھے اپنے ہی دل پر لگے نظر آئے۔ یہ درست ہے کہ ادیب بنیادی طور پر بڑی ہی حساس اور زود رنج ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا بے جا اثر لیتا ہے۔ یہ باتیں عام حالات میں نظر انداز کر دینی چاہئیں لیکن آئینہ جتنا شفاف ہوتا ہے اس پر میل بھی اتنی ہی سرعت سے آتا ہے۔ ذرا سے دھچکے سے تڑخ جاتا ہے۔ کسی نے درست کہا ہے کہ تعلقات بنانے میں ایک عمر صرف ہوتی ہے' بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ لیکن کیا کیا جائے! شاید یہی انسانی زندگی کا المیہ ہے۔ نت نئے تجربے نہیں کئے جا سکتے۔ صراط مستقیم پر چلنے کے لیے اندرونی روشنی درکار ہوتی ہے جو اکثر دستیاب نہیں ہوتی۔ مادیت کے گھپ اندھیروں میں' شکوک وشبہات کی فضا میں' نفسانفسی کی تیز آندھیوں میں' ہر چراغ نہیں جلتا۔ ویسے بھی سب احباب کو راضی کرنے میں سات یوم کا عرصہ بہت کم تھا۔ یہ مہم سات ماہ میں بھی سر نہ ہو سکتی تھی..... ایک طویل فہرست تھی۔ پھر ناراضگی کی کوئی ظاہری وجہ بھی ہونی چاہیے!..... باتوں باتوں میں رنجش ہو جاتی ہے۔ کسی نے کام کہا اور آپ سے نہ ہو سکا یا ٹکا سا جواب دے دیا۔ غیبت' چغل خوری' حسد یا کوئی اور وجہ.....! کوئی بھی تو ایسی بات نہ تھی۔ صرف باڈی لینگویج' جب تعلق بوجھ بن جائے تو اعضاء بولنے لگتے ہیں' غیر محسوس انداز میں لب ولہجے میں سرد مہری آ جاتی ہے۔ آنکھوں سے اجنبیت ٹپکتی ہے۔ ہینڈ شیک میں وہ گرمجوشی نہیں رہتی۔

ملاقاتیں بتدریج کم ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ ہر چیز گنتی کی زد میں آ جاتی ہے۔ باتیں تلنے لگتی ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ تعلقات کی خلیج وسیع ہوتی جاتی ہے۔ فاصلے بڑھنے لگتے ہیں اور آخر میں بعد المشرقین کا مرحلہ آ جاتا ہے۔

حلہ گنگ سے چھوٹے بھائی کا فون آیا کہ سب عزیز رشتہ دار تیار ہیں۔ آپ کو الوداع کہنے کے لیے لاہور آنا چاہتے ہیں ..... مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اتنے لوگوں کی رہائش کا بندوبست کہاں ہوگا۔ ان کے لیے وقت کدھر سے نکلے گا۔ برادری کے معاملات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ سب زود رنج ہیں..... یہ نہ ہو کہ آزردہ خاطر ہوں۔ حلہ گنگ میں بہت بڑا محلہ سادات ہے۔ ہمدانی سیدوں کا گڑھ۔ ہمارے جد امجد امیر کبیر سید علی ہمدان آج سے پانچ سو سال قبل ہمدان سے کشمیر آئے۔ وادی میں پہلی مرتبہ آواز اذان گونجی۔ پہلا شخص ان کے ہاتھوں مسلمان ہوا اور پھر رشد وہدایت کے چشمے جاری ہو گئے۔ لوگ مجسم عقیدت بن گئے۔

گھپ اندھیروں سے روشنی تک کا سفر بڑ خوش گوار اور کیف آور ہوتا ہے۔ پتہ نہیں ان کے پوتے سید احمد بلاول کو کیا سوجھی کہ کشمیر کے زعفران چھوڑ کر دندہ شاہ بلاول کی خاک پھانکنے پہاڑوں سے نیچے اتر آئے اور اس طرح ہمدانی سادات اٹک سے لے کر خوشاب تک پھیل گئے۔ لوگوں کے ضرورت سے زیادہ احترام اور ادب نے انہیں تساہل پسند بنا دیا۔ جوں جوں عقیدت بڑھی انہوں نے دنیا سے منہ موڑ لیا اور معاشی طور پر کمزور ہوتے گئے..... جب انہیں ہوش آیا تو زندگی کی دوڑ میں وہ بہت پیچھے رہ گئے تھے اور باقی قومیں آگے بڑھ گئیں۔

مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ میں خود جا کر سب سے مل آؤں۔ چنانچہ میں نے بھائی کو کہا کہ اتنے لوگوں کو تکلیف دینا مناسب نہیں میں خود ہی آ جاتا ہوں.....

حلہ گنگ جو کبھی قصبہ تھا اب شہر بنتا جا رہا ہے۔ پہلے سات آٹھ گھنٹوں میں پہنچتے تھے۔ جب سے موٹروے بنی ہے یہ سفر گھٹ کر آدھا رہ گیا ہے۔ صاف' ستھری چمکیلی کھلی سڑک جس پر سفر کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی فضا میں اڑ رہا ہو۔ تنقید کرنا تو ہمارا قومی شعار بن گیا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک بہت بڑا منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچ گیا ہے..... اور جلد ہی اس کے ثمرات عوام تک پہنچانا شروع ہو جائیں گے۔ پسماندہ علاقوں کی قسمت بدل جائے گی اور اس کے ساتھ ساتھ کارخانوں کا ایک جال بچھ جائے گا۔ نوکریاں جو اس وقت عنقا ہیں دامن نیاز بچھائیں گی۔ کلر کہار سے دس میل آگے جائیں تو ایک نہایت خوبصورت سبز بورڈ نظر آتا ہے جو حلہ گنگ اور چکوال کے درمیان حد فاصل ہے اور ان کی آمد کی اطلاع دیتا ہے..... بلکسر انٹرچینج سے باہر نکلیں تو دائیں ہاتھ چکوال ہے اور بائیں طرف کی سڑک بلکسر سے ہوتی' بل کھاتی ہوئی حلہ گنگ جا پہنچتی ہے۔ تیل اور فوج نے اس علاقے کو شہرت بخشی ہے۔ ہر تیسرے میل پر تیل کا کنواں اور ہر دوسرے گھر کا فرد فوج میں ملازم ہے۔ مشہور مزاح نگار کرنل محمد خان اسی علاقے کے رہنے والے تھے..... بلکسر سے حلہ گنگ پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ درمیان میں چھوٹی چھوٹی سرسبز پہاڑیوں کے درمیان گھری کئی وادیاں ہیں۔ دو دریاؤں کو عبور کرنا پڑتا ہے جن میں پانی ایک لکیر کی صورت میں بہتا ہے۔ برسات میں البتہ یہ خوب بپھرتے ہیں اور اپنے دریا ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے مقامی لوگ استفادہ نہیں کر سکتے اور پیچ و تاب کھاتا ہوا پانی بال آخر دریائے سواں کے راستے انڈس میں جا گرتا ہے۔ دریائے سندھ کہ جس نے پنجاب اور صوبہ سندھ کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ پہلے یہاں پتھروں' پوہلی اور لڑائی جھگڑوں کے علاوہ کچھ پیدا نہ ہوتا تھا۔ اہل دیہہ پانی کی بوند بوند کو ترستے تھے۔ اب جبکہ لوگوں نے مونگ پھلی کاشت کرنا سیکھ لی ہے تو ان کی معاشی حالت بھی خاصی حد تک سنبھل گئی

ہے۔ اگر بروقت بارشیں ہو جائیں تو گندم اور چنا بھی پیدا ہوتا ہے..... جتنے لوگ فوج میں بھرتی ہیں ان سے دوگنا دبئی اور انگلینڈ چلے گئے ہیں۔ اس سے کئی معاشی اور معاشرتی الجھنیں پیدا ہوئی ہیں۔ اگر ایک بھائی کے گھر میں ٹی۔ وی اور ریڈیو بج رہا ہے تو دوسرے کے گھر بگل تک نہیں بجتا۔ بیچارہ جب سال کے بعد دو ماہ کی چھٹی لے کر آتا ہے تو سوائے بیوی کے طعنوں اور کوسنوں کے کچھ نہیں سنتا۔ یورپ کا محنت کش ہزاروں روپے گھر بھیجتا ہے۔ اس کے اپنے شب و روز کیسے گزرتے ہیں اس کا کسی کو اندازہ نہیں ہوتا' پروا بھی نہیں ہوتی..... اور ادھر ہمارا ڈھول سپاہی..... ''دن کو جنگلوں میں' دو وقت لنگروں میں' رات کو کمبلوں میں''..... ہم ایسے گزارا کرتے ہیں۔

مجھے اپنے قصبے سے بڑا پیار ہے۔ میں نے اکثر احباب کو دیکھا ہے جو پڑھ لکھ کر نوکری کے جھمیلوں میں پڑ کر' پندرا مناصب میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ گاؤں جاتے ہوئے' گاؤں کا نام لیتے ہوئے شرماتے ہیں۔ ٹبی' تھوہا محرم خان' حجرہ شاہ مقیم' چیچو کی ملیاں' بھلا یہ بھی کوئی نام ہیں..... بتاتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی قومی زبان کا بھی یہی حشر کیا ہوا ہے۔ اردو زبان میں لکھی ہوئی کتاب ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کرنٹ سا لگتا ہے۔ غلاموں کی زبان۔ کون کہتا ہے یہ ملک آزاد ہو گیا ہے؟

میں جب اپنے بچوں کو سکول کے قصے سناتا ہوں تو بڑے حیران ہوتے ہیں۔ با پیادہ کئی میل کا سفر' دوڑتے ہوئے سکول جانا اور پھر اسی تیزی کے ساتھ گھر واپس آنا۔ بلا کی گرمی' غضب کا جاڑا' قیامت خیز برسات..... اور وہ منشی لالہ' خاکی زین کا بنا ہوا کوٹ' بن مایا کے پگڑی' ٹخنوں سے اونچی شلوار' گھسے ہوئے جوتے۔ ہر دل عزیز اکبر! سبق پڑھاتے ہوئے منشی لالہ کی بھاری آواز گھونجتی ''بت شکن فرزند اسلام' محمود غزنوی''..... کافی دیر تک پتہ نہ چل سکا کہ اکبر کی مقبولیت کی اصل وجہ کیا تھی؟..... محمود غزنوی کو سترہ بار بت شکن کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی۔ یہ کارِ خیر ایک حملے میں بھی ہو سکتا تھا..... اورنگ زیب عالمگیر..... ناخلف اولاد کی پیدائش کے لیے والدین اتنی شدت سے دعا کیوں مانگتے ہیں..... عدل جہانگیری جس کی ہر صبح کا آغاز نور جہاں کے کنج لب سے ہوتا تھا اور پھر تھکا ہارا انصاف شام کو اس کی گود میں سر رکھ کر سو جاتا تھا..... برصغیر کی کس قدر روشن تاریخ ہے! ہم کتنے بدقسمت ہیں کہ ہمیں اپنے اجداد کے سنہری کارناموں کا کبھی ادراک نہیں ہوتا۔ کبھی ٹھیک طرح سے فخر بھی نہیں کر پائے..... دراصل اس ذہنی خلفشار کی جڑ تجسس و تحقیق ہیں۔ بے خطر آتش نمرود میں تو کودا جا سکتا ہے کہ اس کا تعلق عشق سے ہے' لیکن بلا سوچے سمجھے تاریخ کے ظلمت کدے میں داخل نہیں ہوا جاتا۔

تلہ گنگ میں چند دن قیام کیا۔ احباب کا جمگھٹا سا لگ گیا..... سارے صاف دل لوگ ہیں۔ حج کی پیشگی مبارک باد دینے

لگے۔ ان کی نظر میں نیت اور قبولیت میں کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ میں نے بچپن میں اپنے عزیز رشتہ داروں کو زیارات پر جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ روانگی کے دن چوپال پر میلے کا سماں ہوتا' ڈھول بج رہے ہیں۔ نفیری کی آواز کانوں میں عجب رس گھول رہی ہے۔ صدر برگ اور گلاب کی پتیاں چار سو بکھری پڑی ہیں..... لوگ کام کاج چھوڑ کر جوق در جق جمع ہو رہے ہیں۔ امام ضامن کے علاوہ حسب توفیق مالی امداد بھی کی جارہی ہے۔ زائرین کے ہاتھوں اور ماتھوں کو چوما جارہا ہے۔ ہر کوئی انفرادی مسائل اور مشکلات بیان کر رہا ہے جن کا مداوا روضہ مبارک پر دعا کے بعد ہونا تھا۔ لوگ مسکرا رہے ہیں۔ لوگ رو رہے ہیں..... خوشی اور غم کا یہ اختلاط بہت کم دیکھنے میں آتا ہے.....

اب وہ بات تو نہیں رہی لیکن عقیدت کے چشمے ہنوز خشک نہیں ہوئے۔ سرزمین حجاز کا نام سنتے ہی لوگ درود پڑھنے لگتے ہیں اور سراحتراماً جھک جاتے ہیں۔ راہ چلتے ہوئے اگر کسی کاغذ کے ٹکڑے پر عربی تحریر نظر آجائے تو اسے فوراً اٹھا کر آنکھوں سے لگایا جاتا ہے اور پھر بڑے ادب سے دیوار میں اڑس دیتے ہیں..... تقسیم سے قبل تو یہ عالم تھا کہ اگر کوئی عربی' جبہ و دستار پہنے دیہات میں آ نکلتا تو سارا گاؤں اس کی ایک جھلک دیکھنے گھروں سے باہر نکل آتا اور اس کی خاطر مدارت کرتا۔ کئی شاطر لوگوں نے اس جانا جائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ عربی لباس پہن کر ٹوٹی پھوٹی پنجابی بولتے' رٹی ہوئی چند آیات کو حلق کی سرنگ سے پیچ وتات دے کر باہر نکالتے اور مہینوں تک عقیدت مندوں کو شرف میزبانی بخشتے۔ مالی امداد بھی بادل نخواستہ قبول کر لیتے۔ اگر کبھی کبھار ان کی عربیت کا بھانڈا پھوٹ جاتا تو چپکے سے کھسک جاتے۔ بہروپ کے اس فن میں چکوال کے قصبے بھون کے مراثیوں نے کمال حاصل کیا ہوا تھا۔ خاندانی پیشہ ور ہونے کے ناطے کمبخت عربیوں کی ہو بہو نقل اتارتے۔ ان کی اڑان محض پنجاب تک محدود نہ تھی بلکہ اس کی زد میں سارا ہندوستان تھا..... بمبئی میں ہمارے ایک بزرگ تجارت کرتے تھے۔ ان کا شمار وہاں کے سیٹھوں میں ہوتا تھا۔ ایک شخص ان کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی بات چیت' چال ڈھال' لباس کی تراش خراش سے یوں گمان ہوتا' جیسے روضہ رسول سے سیدھا بمبئی میں وارد ہوا ہے۔ وہ دو ماہ تک مرغن کھانے کھاتا رہا۔ ٹھنڈے مشروب پیتا رہا۔ ایک دن باتوں باتوں میں ایک ایسا لفظ اس کے منہ سے نکل گیا جو صرف دھنی کے علاقہ میں بولا جاتا ہے..... اس نے محاب پنجتن پال (پنجتن کے وسیلے سے) کہا ہی تھا کہ حاجی بابا نے اس کو گردن سے پکڑ لیا اور بولے ''کمبخت' تو بھونڑاں کا مراثی ہے!''..... یہ سنتے ہی اس نے ایک دم ہاتھ کھڑے کر کے ''راج بھاگ دی خیر'' کا نعرہ لگایا اور اپنا بوریا بستر سمیٹ کر گھر سے باہر نکل گیا.....

آخر وہ دن آن پہنچا جس کا مجھے بے تابی سے انتظار تھا۔ بارہ فروری..... ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ایک دن بلکہ سنگ میل ہے۔ نشان منزل ہے۔ حرف آرزو ہے' حاصل جستجو ہے۔ روح فراق ہے' زینہ افلاک ہے۔ مینارہ نور ہے۔ تمام آرزوئیں' امنگیں اور ارادے سمٹ کر' سکڑ کر ایک نقطے پر مرکوز ہو گئے ہیں اور وہ نکتہ بارہ فروری ہے..... سال میں بارہ مہینے ہوتے ہیں' بارہ بارہ میں 365 ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ایک دن جو مہ وسال پر بھاری تھا۔ جو میرا اپنا تھا۔ قرب اور اپنائیت کا اس قدر شدید احساس پہلے کبھی نہ ہوا تھا..... اس روز میں علی الصبح اٹھا۔ سحر خیز تو میں ایک طویل عرصے سے ہوں لیکن ان صبحوں میں ایک بنیادی فرق تھا۔ گہری نیند سے بیداری ایک مشکل عمل ہوتا ہے۔ بادل نخواستہ اٹھتا تو ضرور تھا لیکن زندگی کی ناجوازیوں کا گلہ شکوہ بھی ہر روز ہوتا تھا۔ صبح کی سیر جو لندن کے ڈاکٹر ٹیری لوئیس کے حکم نما مشورہ کی محتاج تھی جو میری مجبوری تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس رات میں سویا ہی نہیں تھا۔ نیند نے ذہن کو شجر ممنوعہ سمجھ رکھا تھا۔ آتش شوق سارے وجود کو پگھلا رہی تھی۔ چنانچہ اس صبح کو پہلی مرتبہ شکایت نہیں بلکہ شکر کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ وضو کر کے نماز فجر پڑھی اور وہ دعائیں بھی مانگیں جن سے پہلے میں قطعی طور پر نا آشنا تھا۔ پھر جوگرز پہن کر باغ کی طرف نکل گیا..... صبح کاذب صدق کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بادنسیم اٹھکیلیاں کرنے کی بجائے احتراماً آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اشجار سرگوشیاں کرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ان کی شاخیں اس طرح جھکتیں جیسے سلام کر رہی ہوں۔ پھولوں نے اپنی ساری خوشبو باغ یکدم بکھیر دی تھی۔ اس وقت باغ میں کوئی اور شخص نہ تھا صرف میرے بوٹوں کی چاپ فضا میں ارتعاش پیدا کر دی تھی۔ میں ایک گھنٹہ سیر کرتا ہوں۔ اس کے بعد پندرہ منٹ ہلکی ورزش اور پھر گھر لوٹ آتا ہوں۔ روح پرور ماحول کے باوجود اس روز وقت گزارنا مشکل ہو گیا..... بار بار بلا جواز خیال آتا کہ ائیر پورٹ پہنچنے میں کہیں دیر نہ ہو جائے۔ خدا خدا کر کے سیر ختم ہوئی تو میں نے باغ پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور گیٹ سے باہر نکل آیا۔

گھر میں خلاف معمول بڑی ہلچل تھی۔ سب بیدار ہو چکے تھے۔ بیگم سامان کے ساتھ گتھم گتھا تھیں۔ اشیاء زیادہ اور اکلوتے سوٹ کیس کی استعداد کم تھی۔ اس صورت حال میں سامان پیک کرنا ایک آرٹ سے کم نہیں ہوتا..... ذرا سی لاپرواہی سے سوٹ کیس بیچ چوراہے میں بھانڈا پھوڑ دیتا ہے۔ ایک دفعہ کھل جائے تو پھر بند کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ہوائی کمپنیوں کے لوڈران کو اتارتے چڑھاتے وقت جہاز سے یوں اوپر نیچے پھینکتے ہیں جس طرح ایک بولر گیند کو باؤنس کراتا ہے۔ کرکٹ بال کی طرح یہ کئی مرتبہ زمین پر گرتا اچھلتا رہتا ہے۔ اس کی چولیں ہل جاتی ہیں اور دو چار مرتبہ سفر کرنے کے بعد استعمال کے قابل نہیں رہتا۔ چھوٹا بیٹا محمد مرتضٰے بھی جاگ گیا تھا..... ''کیا بات ہے چھٹی کے دن بیدار ہو گئے ہو؟''

''آپ نے حج پر جو جانا ہے!''

''پتہ ہے لوگ حج پر کیوں جاتے ہیں؟ میں نے مسکرا کر پوچھا''

''اللہ میاں سے ملاقات کرنے!'' اس نے بھولپن سے جواب دیا۔

''اللہ میاں سے تو آدمی ہر جگہ مل سکتا ہے!''

''گھر جا کر ملنے کا مزہ کچھ اور ہے!''

''ارے یہ بات تمہیں کس نے بتائی ہے؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا

''مولوی صاحب' کہتے ہیں وہ لوگ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں جن کی میزبانی اللہ میاں کرتا ہے!''

''تم نے کوئی فرمائش نہیں کی؟''

''حاجیوں سے فرمائش نہیں کیا کرتے؟''

''یہ بات بھی مولوی صاحب نے بتلائی ہے؟''

''نہیں! امی نے کہا تھا۔''

''کوئی دعا؟''

''اللہ میاں سے کہنا مجھے اچھے نمبروں سے پاس کرادے۔''

''لیکن وہ جو اس نے محنت کرنے کا حکم دیا ہے!''

''محنت کرنے کے بعد بھی اس کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔'' وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔

جنریشن گیپ! میں نے سوچا۔ ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر انقلاب لے آئے ہیں۔ آج کے بچے گزشتہ کل کے بڑوں سے بڑھ کر سوچتے ہیں۔ بچپن ہمارا بھی سہانا تھا لیکن بالکل مختلف تھا۔ امتحان پاس کرانے کے لیے اللہ میاں سے رجوع نہیں کرتے تھے کیونکہ یہ کام نزدیک ہی ہو جاتا تھا۔ وہ دور نیلے آسمانوں میں کہیں دربار لگاتا تھا۔ بابا غونث کا دربار قریب تھا۔ چنانچہ گنبد والے مزار میں جا کر عرضی ڈال دیتے پھر الٹے پاؤں لوٹتے ہوئے دروازے کی کنڈی کھڑکاتے تھے کہ بابا جی کو بیدار کرنے کا یہی واحد ذریعہ تھا۔ یہ سوچنے کا کبھی موقعہ ہی نہ ملا کہ جب اس قدر کنڈیاں ہر وقت کھڑکتی رہتی ہیں تو بابا جی آرام کس وقت کرتے ہوں گے یا جاگتے ہوئے کو جگانے کی کیا ضرورت تھی۔ اللہ میاں سے صرف بارش کی دعا مانگی جاتی تھی کیونکہ یہ کام بابا جی کے اختیار سے باہر تھا..... بارانی علاقوں

میں بارش کی کیا اہمیت ہوتی ہے یہ وہاں کے باسی ہی جان سکتے ہیں۔ بزرگ اس کام کے لیے بچوں کو مامور کرتے' کہتے اللہ میاں کو بچوں سے بڑا پیار ہے۔ خلیل جبران نے کہا تھا کہ ہر بچہ پیدائش کے وقت یہ پیغام لاتا ہے کہ خدا ابھی اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوا .....اور واقعی خدا نے اپنے بچوں کو کبھی مایوس نہ کیا..... ادھر بے شمار ننھے ننھے ہاتھ دعا کے لیے اٹھتے ادھر شامیانے شرق تا غرب چھا جاتے اور چھم چھم مینہ برسنا شروع ہو جاتا۔ پیاسی دھرتی سیراب ہو کر جب سانس لیتی تو اس کے سینے سے ایک عجیب سی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھتی اور جسم و جاں تر و تازہ ہو جاتے۔ مستقبل کیسا ہی روشن کیوں نہ ہو ماضی کے دھندلکوں میں جھانکے بغیر نہیں رہا جاتا۔ یہ ایک ایسا سرمایہ ہے جس کا نعم البدل گنج قارون بھی نہیں ہو سکتا۔

حاجی کیمپ میں حسب سابق بڑا رش تھا باہر میلے کا سماں تھا۔ گیٹ پر سکاؤٹ کھڑے تھے جو کارڈ اور پاسپورٹ چیک کر کے اندر جانے کی اجازت دیتے۔ میرے گن مین منظور نے ایک دن پہلے ہی گاڑی کا پاس بنوا لیا تھا اس لیے اسٹیکر دیکھ کر انہوں نے آہنی گیٹ کھول دیا۔ اندر جاتی ہوئی گاڑی کو لوگوں نے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا لیکن پھر فوراً ہی اپنے عزیز رشتہ داروں کو گلے ملنے میں مصروف ہو گئے۔ میرے ساتھ بچے بھی تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ حج کیمپ کا روح پرور ماحول دیکھنا چاہتے ہیں..... جب گاڑی اندر جا کر رکی تو میری نظر ہمدم دیرینہ پر ایک بار پھر پڑی مجھے ایسے محسوس ہوا' جیسے مجیٹھیا ہال ایک مرتبہ پھر مسکرا رہا ہے..... ''آ گئے ناں آخر راہ راست پر..... اس وقت نہیں سمجھایا تھا کہ اس قدر تیز نہ چلو۔ لڑکھڑا جاؤ گے!''

''تمہیں اس وقت ہوش ہی کہاں تھا۔ تمہارے وجود سے شراب کے تعفن آمیز بھبکے اڑتے تھے!''..... میں نے جواب دیا' ''کس قدر خوش نصیب ہو آج لوبان اور اگربتیوں کی خوشبو نے تمہارا وجود معطر کر رکھا ہے..... جہاں جگہ جگہ پان کی پیک ہوتی تھی وہی زمین گلاب کی پتیوں سے اٹی پڑی ہے۔ جہاں کبھی دھول اڑتی تھی آج پھول ہی پھول ہیں۔ تمہارے چہرے سے نحوست برستی تھی۔ اب نور ٹپک رہا ہے..... شکر ادا کرو اور طنز و تشنیع کے یہ تیر اپنے ترکش میں ڈال دو۔''

سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگا' ''میری بات غور سے سنو۔ حج پر جانے سے پہلے جس قلبی کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے تم میں نظر نہیں آتی!''

''کیا مطلب!'' میں نے جز بز ہو کر کہا' ''یہ تمہارا خبث باطنہ ہے جس کا پرتو میرے وجود پر پڑ رہا ہے۔''

بولا' ''جب آئینہ دل صاف ہو تو کوئی سایہ یا کثافت اسے دھندلا نہیں سکتی۔ تحمل' برداشت اور رواداری سے یہ صیقل ہوتا ہے۔ بغض و عناد ہنوز تمہارے وجود سے نکل نہیں پائے۔ کوشش کرو ابھی بیت اللہ پہنچنے میں کچھ گھڑیاں باقی ہیں!'' میرا وجود کپکپانے لگا' میں نے

اپنے اندر جھانکا' ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ کہاں تھی وہ روشنی جس کی تلاش میں نکلا تھا! اس نے درست ہی کہا تھا۔ شرم اور ندامت سے میرا سر جھک گیا اور بغیر نظریں ملائے میں دائریکٹر کے کمرے میں چلا گیا.....

زیدی صاحب حسب معمول فون کے ساتھ گتھم گتھا تھے۔ ایک فون سن کے بند کرتے تو دوسرے کی گھنٹی بج اٹھتی۔ ان کے لب و لہجے اور جناب' جناب سے صاف پتہ چلتا تھا کہ دوسری طرف کوئی افسر بہادر بول رہا ہے..... سفارشیں ہی سفارشیں۔ حکم ہی حکم۔ فرمائشیں ہی فرمائشیں.....! میرے آدمی کو جہاز میں اچھی سیٹ دلوادو..... میرے خالو کو سب سے پہلے فارغ کردو۔ آؤ بھگت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ ہاٹ کپ آف ٹی۔ ٹھنڈی بوتلیں۔ حضور' جناب' تعمیل۔ ارشاد.....! میں اٹھ کر باہر آ گیا..... آج کل نوکری کرنا کس قدر مشکل ہو گیا ہے۔ اس پل صراط کو بحفاظت عبور کرنا ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ یہاں تھوڑی سی لغزش پا' ذرا سی کجروی' معمولی سی ذہنی اپج ان گنت مشکلات کو جنم دے سکتی ہے۔ پھر خزاں رسیدہ درختوں سے اتنے پتے نہیں جھڑتے جتنے سرکاری ملازم ہر دور میں فارغ کر دیئے جاتے ہیں..... یہ فلاں کا بندہ ہے۔ فلاں گروپ سے اس کا تعلق ہے۔ اس کو فارغ کردو۔ اپنے بندے لاؤ' اپنے خاص۔ خاص الخاص۔ نازک امور اپنے آدمی ہی سرانجام دے سکتے ہیں..... رازوں کے امین ہو سکتے ہیں۔ کون کہتا ہے یہ مالک آزاد ہو گیا ہے۔ انگریز چلا گیا ہے۔ ہندوؤں سے چھٹکارا مل گیا ہے لیکن فکر و نظر آزاد نہیں ہو پاتے۔ انتظامی طریق ہنوز سرگشتہ خمار رسوم و قیود ہے۔

مائیک پر اعلان ہوا کہ حاجی اپنی اپنی کوسٹرز میں بیٹھ جائیں۔ دس منٹ میں گاڑیاں حج ٹرمینل کو روانہ ہوں گی۔ کوسٹرز اور بسوں کی نشاندہی پہلے ہی کر دی گئی تھی۔ سامان بھی وہیں سے بک ہو گیا تھا اور پی آئی اے کے عملے نے بورڈنگ کارڈز بھی جاری کر دیئے تھے۔ یہ ایک سہولت تھی اور ضرورت بھی تھی۔ نارمل فلائیٹس کی موجودگی میں اس قدر کثیر تعداد میں حاجیوں کو ائیر پورٹ پر لے جانا اور ہینڈل کرنا مشکل کام تھا۔ حاجی اپنا اپنا سامان اٹھا کر سیٹوں کی طرف لپکے۔ بیگ' بنڈل' گٹھڑیاں۔ ایک مائی کے پاس بڑی سی گٹھڑی تھی جسے اٹھانے میں اسے دشواری پیش آ رہی تھی۔ حج آفس کا اہلکار اس کے قریب سے گزرا تو اس نے آواز دے کر اسے قریب بلا لیا۔ ''پتر اے گٹھڑی میرے سر تے رکھ دے۔'' مائی نے التجا کی..... اہلکار نے گٹھڑی اٹھائی اور اسے مائی کے سر پر رکھتے ہوئے پوچھنے لگا..... ''ماں جی اس کے اندر کیا ہے؟''

چپڑی ہوئی روٹیاں' اچار' سرسوں کا ساگ' گڑ' مٹھائی'' مائی نے سادگی سے جواب دیا۔

آپ کو بتایا نہیں گیا کہ کھانے پینے کی چیزیں لے جانے پر پابندی ہے۔

''تو کیا وہاں روزے رکھنا پڑتے ہیں؟'' مائی کے لہجے میں حیرت اور خوف تھا۔

''جہاز میں ہر چیز مفت ملتی ہے۔ پھر مکے مدینے میں ہر قسم کا کھانے پینے کا سامان وافر مقدار میں ملتا ہے۔ آپ تردد نہ کریں۔'' وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

تو پھر.....؟

''آپ اسے خیرات کر جائیں' وہ مسکرایا! ''صدقہ سفر کی صعوبتوں کو گھٹاتا ہے اور حج کو قبولیت کی منزل تک لے آتا ہے۔''

جب کوسٹر کا انجن اسٹارٹ ہوا تو میں نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر بچوں کو خدا حافظ کہا اور گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ گیٹ سے باہر نکل گئی۔ مجیٹھیا ہال سے حج ٹرمینل تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہے۔ شملہ پہاڑی کراس کریں تو مال روڈ آ جاتی ہے۔ جب بھی میں شملہ پہاڑی کو دیکھتا ہوں کئی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اس کے بالمقابل گول پیلس میں ہمارا پولیٹیکل سائنس کا ڈیپارٹمنٹ تھا۔ مرحوم حمید احمد خان وائس چانسلر کے منجملہ کارناموں میں سے ایک کارنامہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے آتے ہی ہمیں یونیورسٹی بدر کر دیا۔ گول پیلس کو محلوں سے اتنی ہی نسبت تھی جتنی کہ شملہ پہاڑی کو کوہساروں سے ہے۔ ایک پرانی کوٹھی میں ڈسپنسری قائم تھی۔ جس سے ہر وقت نیکچر آیوین کی بو آتی اور داغدار روئی کے گالے ہوا میں اڑتے رہتے۔ پڑوسیوں کے احتجاج پر اسے توڑ پھوڑ کے درس گاہ بنا دیا گیا ..... مادر علمی..... ماں ایک تو سوتیلی ہو پھر بیمار تو اس کا اولاد کی تربیت اور نشوونما پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ یہ جاننے کے لیے کچھ زیادہ قیاس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس یرقان زدہ ماحول میں سرسبز پہاڑی اور اس پر کھلتے پھولوں کو دیکھ کر آنکھوں میں تراوٹ آتی اور پھولوں کی خوشبو ذہن کی پراگندگی دور کرتی۔ لڑکے اس کے اردگرد کئی چکر لگاتے اور پھر اوپر جا کر گھنے درختوں کی چھاؤں میں کچھ دیر سستاتے۔

بسیں حج ٹرمینل پر جا کر رک گئیں۔ حج ٹرمینل مرکزی ائیر پورٹ سے قدرے ہٹ کر بنایا گیا ہے۔ یہ ہے تو ائیر پورٹ کا حصہ مگر اس کی انٹری الگ ہے..... ویسے بھی جمبو جہاز اپنی جسامت اور وزن کی وجہ سے مین بلڈنگ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے لیے نہایت مضبوط رن وے اور ٹیکسی گراؤنڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج تک ائیر انڈسٹری نے جتنے جہاز بنائے ہیں یہ ان کا سرخیل ہے۔ سردار ہے۔ پھلوں میں آم کو سلطان الاثمار کہا جاتا ہے۔ درندوں میں شیر جنگل کا بادشاہ ہے' اس کی دھاڑ سے رستم تک کا کلیجہ ہل جاتا ہے۔ یہ ہواؤں کا راجہ ہے' فضاؤں کا حکمران ہے۔ اس کی گھن گرج سے کڑکتی بجلیوں کی چھاتی دہلتی ہے۔ ہوا بچ کر نکلتی ہے۔ بادلوں کو پسینہ آ جاتا ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں پرانے بادشاہوں اور راجوں مہاراجوں کو دنیا کی ہر نعمت میسر تھی لیکن ہوا میں پرواز شاید ان کی زندگی کی

سب سے بڑی خواہش تھی لیکن یہ ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ آج غریب آدمی بھی اس نعمت سے فیض یاب ہو رہا ہے۔ اگر جہانگیر کے زمانے میں جمبو جیٹ ہوتا تو شاید مینا بازار اس کے اندر لگتا۔ وہ فاختائیں' قمریاں' عندلیبیں اور مورنیاں جو باغوں میں چہچہاتیں اور رقص کرتیں اس کے اندر سہانے نغمے الاپتیں۔ جہاز کا کنٹرول کیپٹن کی جگہ ملکہ عالیہ کے ہاتھوں میں ہوتا۔ اور عالم پناہ' ظل سبحانی' حسب سابق عدل وانصاف کا بول بالا کرتے۔

جب ہم مرکزی لاؤنج میں داخل ہوئے تو ایسے محسوس ہوا جیسے ایک برقی رو ہے جو چار سو دوڑ گئی ہے۔ ایک لہر ہے جس نے مکینوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ ایک رعد ہے جس نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے۔ جذبوں کو زبان مل گئی ہے۔ لبیک اللّٰھم لبیک کی روح پرور آواز سے سارا ہال گونج اٹھا۔ فضا میں ایک ارتعاش پیدا ہو گیا۔ رنگ برنگے لباس تبدیل ہونے شروع ہو گئے اور پھر یوں لگا جیسے ایک دم بہت سے راج ہنسوں کے قافلے ہال میں اتر گئے ہوں۔ سفید براق لباس' ایک ہی رنگ' ایک جیسی تراش خراش لوگوں نے احرام باندھ لیے تھے اور خدائے لم یزل کے حضور سربسجود ہو رہے تھے۔ دو رکعت نفل جس کی تلقین ہدایت نامہ میں کی گئی تھی۔

''شاہ صاحب آپ بھی احرام باندھ لیں۔'' ملتان کے امان اللہ نے مجھے مشورہ دیا۔

میرا خیال تھا کہ احرام جہاز میں مقام میقات پر باندھا جائے۔ جب عزیزان وطن ایک ساتھ سفر کر رہے ہوں تو جو سلوک جہاز کے ٹائیلٹس کے ساتھ ہوتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ طہارت قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر جس شخص نے پہلی دفعہ احرام باندھا ہو اس کے لیے ان دو چادروں کو سنبھالنا بھی کوئی آسان کام نہیں ہوتا..... امان اللہ کا استدلال یہ تھا کہ جہاز میں احرام باندھنا زیادہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس میں پرائیویسی نہیں رہتی۔ مقام میقات تک پہنچتے پہنچتے اکثر حاجیوں کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ خواب غفلت سے بیدار ہونے تک دم کی نوبت آ جاتی ہے۔ اور گرم دم زیادہ ہو جائیں تو پھر معاشی دمادم ہو سکتا ہے۔ بٹوے کی رگیں تن جاتی ہیں اس کے چمڑے کو پسینہ آ جاتا ہے۔ دیار غیر میں قلاش ہونا بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ یہ درست ہے کہ دیار حبیب میں تو قلاش بھی مالا مال ہو جاتے ہیں لیکن یہ دنیاوی دھن دولت نہیں ہوتی۔ یہ دولت ایمان ہے جس میں کوئی کمی نہیں آ سکتی۔ برگد کی شاخوں کی طرح پھیلتی چلی جاتی ہے۔

کہتے ہیں روم میں وہی کرنا چاہیے جو اہل روم کرتے ہیں۔ اس قدر راج ہنسوں کے درمیان دیگر پرندوں کا کیا کام تھا لہٰذا میں نے بھی فوراً احرام باندھ لیا اور سربسجود ہو گیا۔ جب میں نے دعا پڑھ کر سر اوپر اٹھایا تو مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میرے اندر جمی ہوئی برسوں کی برف کو کوئی آہستہ آہستہ توڑ رہا ہے۔ کوئی کوکھ رچ رہا ہے۔ کثیف شیشے کو صیقل کر رہا ہے۔ مجھے اپنا سارا وجود چٹختا ہوا محسوس

ہوا۔ وہ کون تھا؟ کون ہوسکتا تھا! وہی جو بادِ صبا کو خرامِ ناز سکھاتا ہے۔ جو سب کی کایا پلٹ رہا ہے۔ پھولوں کو مسکراہٹ بخشتا ہے۔ صبح کو نور عطا کرتا ہے۔ شام کی زلفیں سنوارتا ہے۔ انسان کی ہر سانس کا حساب رکھتا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔

دعا پڑھ کے جب میں اٹھا تو میں نے اس انبوہ پر ایک نگاہ ڈالی۔ حاجیوں میں معمر لوگوں کی اکثریت تھی۔ عورتیں بھی بڑی عمر کی تھیں۔ ویسے تو سارے پنجاب سے لوگ آئے تھے لیکن جنوبی پنجاب کی نمائندگی زیادہ تھی۔ غریب لوگ' غربت کے بوجھ تلے دبے ہوئے۔ دھنسی ہوئی آنکھیں' پچکے ہوئے گال' سنولائی لوئی رنگت' کملائے ہوئے چہرے' اسم ربی سے سب پر توانائی آ گئی تھی۔ چہرے پر نور ہو گئے تھے۔ اور برسوں کے تھکے ہارے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے برس ہا برس تک حج بیت اللہ کی آرزو کی تھی۔ مالی مشکلات کے باوجود کوڑی کوڑی جمع کی تھی۔ پیٹ پر پتھر باندھے تھے۔ روکھی سوکھی کھا کر گزارا کیا تھا۔ اس تمام عرصے میں صرف ایک ہی خواہش پالی تھی۔ رب کعبہ کے حضور پیش ہوا جائے روضہ رسول پر آنسوؤں کا نذرانہ دیا جائے۔ اس دھرتی پر گلہائے عقیدے نچھاور کیے جائیں جس نے رسول مقبول کے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ جس نے ان قدموں کے بوسے لیے تھے۔ آج ان عقیدت مندوں کی وہ مراد بر آ چکی تھی۔ پانچ گھنٹے کا فضائی سفر اور پھر ساحل آرزو' حیات مستعار کا طویل سفر سکڑ اور سمٹ کر صرف پانچ گھنٹوں پر محیط ہو گیا تھا۔ چہروں پر خوشی کی لہر تھی۔ دلوں میں ایک عجیب سا سرور تھا۔ ہر آنکھ میں عرق گلاب تھا۔ بھیگی بھیگی آنکھیں۔ گہری جھیل کی طرح جن میں سے آنسو موتیوں کی طرح امڈ رہے تھے۔

قدرت کو یہ اشک رواں شاید اس قدر پسند آئے کہ باہر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اندر بارش۔ باہر بارش' ہر چیز نکھر گئی۔ ہر چیز سنور گئی۔ دھرتی کی سب آلائشیں صاف ہو گئیں۔ مجمع سے ایک آواز ابھری۔ بارش نیک شگون ہے۔ رسالت مآب نے ایک مرتبہ سفر سے پہلے ہونے والی بارش کے متعلق کہا تھا کہ یہ قبولیت کی بارش ہے۔ یہ تائید ایزدی ہے۔ گویا سفر سے پہلے باران رحمت اچھا شگون ہے۔ یہ لطف و کرم ہر کسی پر نہیں ہوتا۔ ہر روز بھی نہیں ہوتا۔ اپنے رب کا شکر ادا کرو۔ لبیک اللھم لبیک کی آواز کے درمیان حاجی ایک مرتبہ پھر سجدہ ریز ہو گئے۔

جہاز چند گھنٹوں کی تاخیر سے پہنچا۔ اس کی بنیادی وجہ موسم کی خرابی نہ تھی بلکہ پی۔ آئی۔ اے کی کم مائیگی تھی۔ بام بڑے اور در شن چھوٹے۔ ''گریٹ پیپل ٹو فلائی وِد''۔ بڑے لوگ ہیں کہاں؟ پھر بڑے لوگ گنتی کے چند دقیانوسی جہازوں میں کہاں سفر کرتے ہیں۔ بڑے لوگوں سے ہوائی کمپنیاں بھی نہیں چلتیں۔ انہیں عامتہ الناس چلاتے ہیں۔ زندگی بھر کی بچت مہنگے ٹکٹ خرید کر برابر کر دیتے ہیں۔ اگر حج فلائٹیں بند ہو جائیں تو بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا..... کمر کے کس بل نکل جائیں۔ گھسے پٹے

جہازوں میں کون بیٹھے گا.... دراصل پنڈی والا جہاز کراچی چلا گیا تھا۔ کراچی سے سواریوں کو اتار کر اس نے لاہور آنا تھا۔ کسی لمبے چوڑے تردد کی ضرورت نہ تھی۔ آخر حاجیوں نے ہی تو سفر کرنا تھا۔ زائر جا بھی کہاں سکتے تھے!

جہاز کو بال آخر آنا ہی تھا۔ آ گیا۔ حاجیوں کو طوعاً و کرہاً اس میں بیٹھنا تھا سو بیٹھ گئے۔ اب کے جہاز کا ماحول خاصا بدلا ہوا تھا۔ نہ مناسب حد تک کھلی سیٹیں نہ پھرکی کی طرح پھرتی ہوئی آنکھوں کے تنقیدی جائزے۔ نہ گلے کی مصلحت آمیز سوزش' نہ ایکسکیوزمی۔ ایکسکیوزمی کے بے جا تکرار۔ جھکی جھکی نگاہیں۔ سکڑتی ہوئی سیٹیں اگر کمپنی کا بس چلتا تو جہاز کے پروں پر بھی چند سیٹیں لگا دیتی۔ نالہ نیم شب اور آہ صبگاہی کی وجہ سے رندھے ہوئے گلے۔ اسم ربی اور درود شریف کی وجہ سے ساری فضا معطر۔ جہاز کا تمام کریو دیکھا ہے۔ مسافروں کی اکثریت نے زندگی میں پہلی دفعہ ہوائی سفر کیا تھا۔ ان کی سیٹ بیلٹ باندھنے سے لے کر ٹائیلٹ کا استعمال سمجھانے تک عملے کو خاصی دشواری پیش آ رہی تھی لیکن ان کے ماتھے پر کوئی شکن نہ تھی اور لبوں پر کسی قسم کی شکایت نہ تھی۔

جب جہاز اپنی مقررہ بلندی پر پہنچا تو عملے نے کھانا سرو کرنا شروع کیا۔ ایک چھوٹی سی طشتری میں چاول اور مرغ کا ایک پیس' ساتھ فرنی کی ایک چھوٹی سی رکابی اور تھوک کے حساب سے کوکا کولا اور دیگر نرم مشروبات۔ دیہاتی حاجیوں نے قدرے حیرت کے ساتھ اس کھانے کو دیکھا اور پھر بڑی رغبت کے ساتھ کھایا۔ دراصل جہاز میں بیٹھ کر کھانا کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ بتیس ہزار فٹ کی بلندی پر آزمائش کام و دہن۔ باہر یخ بستہ موسم' نقطہ انجماد سے بھی نیچے اور اندر نرم گرم ماحول جیسے کوئی ٹکور کر رہا ہو۔

سیٹیں اس قدر تنگ تھیں کہ گھٹنے بار بار آگے کی سیٹ سے ٹکراتے انہیں پیچھے کھینچنے سے تھکن کا احساس بڑھ جاتا۔ نماز کے لیے کوئی خاص جگہ مختص نہ تھی شاید ایسا ممکن نہ تھا۔ حاجیوں نے خود ہی سیٹوں اور کیبن کے درمیان جگہ بنالی۔ ایک شخص نے عشا کی اذان دی اور جتنے لوگ کھڑے ہو سکتے تھے امام کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ ائیر ہوسٹسوں نے پہلے تشویش کا اظہار کیا اور دبے دبے لفظوں میں انہیں روکنے کی کوشش کی کیونکہ باہر کا موسم ہنوز ابر آلود تھا اور جہاز کو ہلکے پھلکے جھٹکے لگ رہے تھے لیکن قوم حجاز بھلا کہاں رکنے والی تھی۔ ہر اندیشے سے بے نیاز ہو گئی اور فرض کی ادائیگی کو سیکورٹی پر مقدم سمجھا۔ ایوی ایشن لاز بڑے سخت ہیں۔ عملے کے احکام نہ ماننے پر سزا مل سکتی ہے لیکن اس کا حکم ہر چیز پر مقدم ہے۔ وہ جس نے لوہے کی چیل کو ہوا میں اڑنا سکھایا اسے کشش ثقل سے آزاد کیا۔

کھانے کے بعد جہاز کی بتیاں بند کر دی گئیں۔ کچھ لوگ اونگنے لگے لیکن اکثریت درود و سلام میں مصروف رہی۔ مقام میقات پر بتیاں جلیں اور مائیک پر اعلان ہوا کہ مسافر احرام باندھ لیں۔ ہر کوئی پہلے ہی اس فرض سے سبکدوش ہو چکا تھا اس لیے کوئی خاص ہلچل نہ ہوئی۔

◆◆◆

جدہ جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب!

جب جہاز نے جدہ ائیر پورٹ پر لینڈ کیا تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ جدہ ائیر پورٹ کی بڑی تعریف سن رکھی تھی۔ لیکن رات کے اندھیرے کی وجہ سے اس کے خال وخد کا اندازہ نہ ہو سکا۔ صرف رنگ برنگی روشنیوں کا ایک جھرمٹ تھا جس میں ہواؤں کا شاہزادہ اتر گیا۔

جہاز کو ائیر پورٹ کے ٹرمینل تک نہ لایا گیا بلکہ دو فرلانگ کے فاصلے پر کھڑا کر دیا گیا۔ شاید یہ ممکن بھی نہ تھا۔ جس تیزی، تسلسل اور تواتر کے ساتھ دیگر مسلمان ممالک سے فلائٹس آ رہی تھیں ان کے لیے حج ٹرمینل کے محدود Gates ناکافی تھے۔ انڈونیشیا، ملائیشیا، ہندوستان، ترکی و دیگر یورپی اور افریقی ممالک سے مسلمان کی ایک کثیر تعداد حج کے لیے آئی تھی۔ ان حج پروازوں کے لیے ائیر پورٹ کا ایک حصہ مختص کر دیا گیا تھا۔ جہاز کے اترنے سے پہلے عملے نے مائیک پر چند آخری ہدایات دیں۔ کسٹم کے عملے کے درشت رویے کا خاص طور پر ذکر تھا۔ ان سے بحث نہ کریں۔ آنکھوں میں آنکھ ڈال کر نہ دیکھیں۔ سوٹ کیس کے تالے پہلے ہی کھول لیں۔ ذرا سی تاخیر بھی تشکیک کا موجب بن سکتی ہے اور اس صورت میں نہ صرف صندوق، دولخت ہو سکتے ہیں بلکہ جوتوں تک کو کاٹ دیتے ہیں۔

جہاز سے اتار کر ہمیں بسوں میں بٹھایا گیا۔ بسیں ٹرمینل بلڈنگ پر جا کر رک گئیں۔ چالیس سیڑھیاں چڑھ کر جب ہم مرکزی ہال میں آئے تو وہ سج دھج نظر نہ آئی جو ائیر پورٹس کا خاصہ ہے۔ ڈیوٹی فری شاپس، ریستوران، اور زرق برق لباس پہنے ہوئے لوگ۔ ایک بہت اونچی کینوس سے بنی ہوئی شامانہ نما چھت۔ ایک طویل راہداری جسے عبور کر کے ہم امیگریشن کاؤنٹر تک پہنچے۔ ہر چند کو حجاج کہ بہت لمبی لائنیں لگی ہوئی تھیں لیکن ہمیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ حج کے لیے مخصوص پاسپورٹ بنائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے امیگریشن کے عملے کو لمبی چھان بین نہیں کرنی پڑتی۔ ناپسندیدہ لوگوں کی فہرست کمپیوٹر میں پہلے ہی سے ڈال دی جاتی ہے۔ ایسے لوگ جن کی آمد سے سلطنت کا استحکام خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ جو ایک مخصوص سوچ کے مالک ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ کون ہو سکتے ہیں؟ ادیب، صحافی، انسانی حقوق کے علمبردار یا گنتی کے چند علما۔ امیگریشن سے فارغ ہو کر جب ہم ملحقہ ہال میں پہنچے تو سامان کنویئر بیلٹس پر گھوم رہا تھا۔ سامان تلاش کرنے میں بھی کوئی خاص دشواری پیش نہ آئی ہر حاجی نے نیلی پیلی اور سرخ رسیوں سے اپنے اپنے

صندوقوں پر اتنی نشانیاں لگائی ہوئی تھیں کہ بڑی آسانی سے شناخت ہوسکتی تھی۔ پھر صندوقوں پر ان کے نام اور پتے درج تھے۔ ضلع' گاؤں' ڈاکخانہ اگر ان کا بس چلتا تو مکان نمبر بھی لکھ دیتے۔

اصل صبر آزما مرحلہ اس وقت آیا جب حاجی کسٹم کاؤنٹر پر پہنچے۔ پتہ نہیں کہ کسٹم کا عملہ سب حاجیوں کو ایک چھڑی سے ہانکتا تھا یا اہل پاکستان پر خصوصی شفقت تھی۔ ایسے پتہ چلتا جیسے ایک کلاتھ مارکیٹ میں نکل آئے ہوں۔ ہر سوٹ کیس کھلا ہوا' کپڑے الگ' جوتوں کے ڈھیر لگے ہوئے' اور جسموں کو اس طرح ٹٹولا جارہا تھا جس طرح قصاب بکرے کو پرکھتا ہے۔ قمیضوں کی جیبوں کو الٹ پلٹ کیا جارہا ہے' بٹنوں کو گھمایا جارہا ہے' کالروں کے کان مروڑے جارہے ہیں' احرام پر بندھی ہوئی پٹیوں کو کھلوایا جارہا ہے۔ بٹوؤں کے اندر پڑے ہوئے مبلغات کو گنا جارہا ہے ''تم پیسے زیادہ لائے ہو؟..... اس قدر رقم کیسے خرچ کرو گے؟'' عجیب اوٹ پٹانگ قسم کے سوالات۔ حیران و پریشان حاجیوں کو تلاشی کا اتنا دکھ نہیں تھا جتنی فکر اس بات کی تھی کہ کہیں رقم گنتے گنتے عملہ ہاتھ ہی نہ دکھا جائے۔

مجھے سامان دکھاتے ہوئے مزید پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ سوٹ کیس کا تالا کھولتے ہوئے چابی ٹوٹ گئی۔ یااللہ خیر! میں بڑبڑایا۔ اگر سوٹ کیس پر کلہاڑا چل گیا تو مکہ تک پہنچنا محال ہوجائے گا۔ گھبراہٹ میں بسم اللہ پڑھ کر جو ٹوٹی ہوئی چابی لگائی تو سوٹ کیس معجزاتی طور پر کھٹ سے کھل گیا۔ سامان کی تلاشی لیتے ہوئے کسٹم کے اہلکار کے ہاتھ کو جھٹکا لگا۔ اس نے حیرت اور پریشانی کے عالم میں میری طرف دیکھا۔ یہ کیا ہے؟ اس نے کتابوں کے بنڈل کو ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔

''تمہیں کیا نظر آتا ہے؟'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''سلطنت کے خلاف کوئی بات۔ شرک.....؟'' اس نے میری کتاب The sunofthedesert کے صفحے الٹتے ہوئے پوچھا۔

تمہیں یہ خیال کیسے آیا ہے؟'' مجھے واقعی حیرانی ہورہی تھی۔

''شیخ زید کی تصویر دیکھ کر!''

''لیکن یہ تو ایک عرب حکمران ہے!''

''تو کیا ہوا! تم ہز ایکسی لینسی اور ہز میجسٹی کا فرق سمجھتے ہو؟ مجھے ہنسی آ گئی۔ ایک نوجوان بدو تاریخ اور بین الاقوامی تعلقات کے طالب علم

کوفرق سمجھا رہا ہے۔ ''تم سمجھا دو!'' میرے لہجے میں طنز تھا۔

''محض عرب ہونا کافی نہیں۔ صدام حسین بھی عرب ہے۔ کویت کا امیر بھی عرب ہے۔ تمہیں Operation desert storm تو یاد ہوگا۔ عراق کس طرح ایک عرب ملک پر چڑھ دوڑا تھا۔'' اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں میری معلومات میں اضافہ کیا۔

مجھے سب کچھ یاد ہے۔ لڑائی ختم ہوگئی ہے۔ لیکن Operation ختم نہیں ہوا۔ امریکی فوجیں ہنوز یہاں موجود ہیں!''

اس نے ہاتھ کی انگلی اپنے لبوں پر رکھ دی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ آہستہ بولو یا چپ ہو جاؤ۔ پھر آواز دے کر اپنے Seniors کو بلایا۔ وہ کچھ دیر کتابوں کے صفحات کو الٹ پلٹ کرتے رہے اور پھر انہیں اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ گھنٹہ گزر گیا۔ حاجی ایک ایک کر کے فارغ ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ سارا ہال خالی ہوگیا۔ میں اپنا سامان لے کر غربی دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے بنچ پر بیٹھ گیا۔ پریشانی کے عالم میں طرح طرح کے خیالات میرے ذہن میں کلبلانے لگے۔ کتابوں کی مجھے زیادہ فکر نہ تھی۔ سب ادب تھا اور کوئی قابل اعتراض بات نہ لکھی گئی تھی۔ البتہ The sun of the Desert میں عرب تاریخ کے چند اوراق ضرور تھے۔ جن میں سعودی عرب اور ابوظہبی کے اختلافات کا ذکر تھا۔ سعودی عرب ابھی تک ابوظہبی کے دو جزیروں پر اپنا حق جتاتا ہے۔ جو لوگ روضہ رسول پر مسلمانوں کی گریہ وزاری برداشت نہیں کر سکتے وہ اپنے مفادات سے متصادم بات کیوں کر برداشت کر لیں گے۔ میں انہیں خیالات میں غلطاں تھا کہ ڈیڑھ گھنٹے کے جاں گسل انتظار کے بعد کسٹم کا اہلکار مسکراتا ہوا ہال میں داخل ہوا۔ اٹ از آل رائٹ It is all right کہہ کر اس نے کتابیں میری طرف اچھال دیں۔ میں نے گنیں تو امریکہ پر لکھی ہوئی دو کتابیں' جزیرے جمال کے' کم تھیں۔ سات کی بجائے پانچ پتہ نہیں سہواً رہ گئی تھیں یا منسٹری آف انفارمیشن کے ڈیسک پر بیٹھے ہوئے کسی اردو دان نے اڑالی تھیں۔ میرے وجدان نے مجھے سمجھایا کہ اب تکرار نہ کرنا کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ اس صورت میں تمہاری اگلی منزل مکہ نہیں لاہور ہوگی! میں نے بادل نخواستہ ان کا شکریہ ادا کیا اور باہر نکل آیا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ سب حاجی مکہ روانہ ہو چکے ہونگے اور مجھے کوئی ٹیکسی کرنا پڑے گی لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے انہیں باہر ایک میم روشن بہت بڑے برآمدہ کے فرش پر لیٹے ہوئے دیکھا۔ ایک میل کے رقبے میں پھیلا ہوا سائبان' نہایت بلند ستونوں پر کنوپیاں بنائی گئی تھیں۔ ''تم لوگ گئے نہیں؟'' میں نے نیم خوابیدہ امان اللہ سے پوچھا۔

بولا ''ہمارا کوئی پرسان حال نہیں۔ معلم کہیں نظر نہیں آتا۔ سنا ہے آٹھ گھنٹے مزید انتظار کرنا پڑے گا۔''

''تو چلو ٹیکسی کرا لیتے ہیں۔ میں نے مشورہ دیا۔

''آپ بڑے سادہ لوح ہیں۔!'' وہ بے دلی سے مسکرایا'' پاسپورٹ معلم کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔ شرطے آپ کو چند قدم بھی نہیں چلنے دیں گے۔ جگہ جگہ پر چیک پوسٹ ہیں۔''

''پھر.....؟''

''پھر آپ نماز فجر کی تیاری کریں۔ وہ سامنے چند غسل خانے ہیں وضو کر لیں۔ ہوسکتا ہے صبح تک Choke ہو جائیں یا پانی ختم ہو جائے!''

''پہلے میں اپنا سوٹ کیس تو تلاش کر لوں'' میں نے چار سو بکھرے ہوئے سامان پر نظر ڈالی۔ حج ٹرمینل پر چھوٹی ٹرالیاں فراہم نہیں کی جاتیں۔ لوڈر سب مسافروں کا سامان بڑے بڑے ٹرالوں پر ڈالتے ہیں اور انہیں باہر پھینک جاتے ہیں۔ سینکڑوں صندوقوں میں سوٹ کیس تلاش کرنا مشکل کام تھا۔ اس اثناء میں چند دیگر فلائیں بھی آ چکی تھیں اور ان کے مسافروں کی آمد سے سامان مزید گڈمڈ ہو گیا تھا۔ میں نے دو تین چکر لگائے لیکن سوٹ کیس کہیں نہ ملا۔ انکوائری کاؤنٹر پر جا کر استفسار کیا تو وہاں کے عملے نے کندے اچک دیئے۔ وہ انگریزی اور اردو دونوں سے نابلد تھے اور میری عربی زبان سے رسمی علیک سلیک بھی نہ تھی۔ ویسے بھی جو عربی فارسی ہمیں پڑھائی جاتی ہے اور جو زبان عرب وعجم میں بولی جاتی ہے اس میں بعد المشرقین ہے۔ بقول شخصے مولانا مودودی مرحوم جنہیں عربی زبان پر خاصا عبور تھا' سعودی عرب جا کر گفت وشنید کے وقت چکرا گئے تھے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ مسافروں کی تعداد میں بھی خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ ٹرالے بکھرے ہوئے سامان میں مزید سوٹ کیس بکھیر گئے تھے۔ میرے پاس سوائے ایک چھوٹے سے سفری بیگ اور وہ احرام جو میں نے باندھ رکھا تھا۔ مزید کچھ نہ تھا۔ بیگ اٹھا کر ان تنگ غسل خانوں میں وضو نہ کیا جا سکتا تھا اور بیگ مزید رکھنے کی صورت میں اس کی گمشدگی کا بھی قوی امکان تھا۔ کافی دیر تک میں مخمصے میں رہا۔ بالآخر میں نے جی کڑا کر کے سفری بیگ کو بغیر چھت کے غسل خانوں کی دیوار پر رکھا اور وضو کرنے چلا گیا۔ کسی غسل خانے میں بلب نہ لگایا گیا تھا البتہ باہر سے آتی ہوئی روشنی کی وجہ سے وہ نیم روشن تھے۔ سب فرش چھ چھ انچ پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ حاجی زیادہ تھے اور غسل خانے بہت کم تھے۔ کثرت استعمال سے ان کے گٹر چوک ہو گئے تھے۔ ہوائی چپل پہن کر اس پانی میں چلنا بھی ممکن نہ تھا۔ ساری طہارت جاتی رہی۔ میں نے ایک ایک کر کے سب غسل خانوں کا جائزہ لیا۔ کوئی بھی استعمال کے قابل نہ تھا۔ تنگ آ کر میں نے ایک حاجی سے لوٹا مستعار لیا اور باہر نلکے سے پانی لے کر ایک کھلی جگہ جا کو وضو کیا۔ جب بیگ اٹھا کر میں نے

واپسی کا ارادہ کیا تو مجھے سب سامان سے دور نیم اندھیرے میں ایک سوٹ کیس پڑا نظر آیا۔ یا اللہ مدد' کہہ کر جب میں اس کے نزدیک گیا تو میری حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ میرا ہی سوٹ کیس تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ اس قدر دور کیسے پہنچ گیا۔ بعد کے مشاہدے سے اندازہ ہوا کہ حاجی ہر سوٹ کیس کو الٹ پلٹ کر دیکھتے اور اپنا سامان نہ پا کر اسے قدرے غصے سے دور پٹخ دیتے۔ شناخت کی منزلوں سے گزرتے گزرتے یہ دور ایک کونے تک پہنچ گیا تھا۔ مسلسل زمین پر گرنے سے ایک دو جگہ سے چپک گیا تھا۔ بے جان چیز تھی اگر اسے زبان مل جاتی تو مجھ سے ضرور پوچھتا۔ ''تم تو حج کی سعادت حاصل کرنے جا رہے ہو مجھے کس عذاب میں ڈال دیا ہے۔'' میں نے اس تھپتھپایا اور اٹھا کر امان اللہ کے پاس لے آیا۔

''مل گیا ہے نا آخر!'' امان اللہ مسکرایا۔ ''آپ کو کہا نہیں تھا یہاں کوئی چیز گم نہیں ہوتی۔ یہ پاک دھرتی ہے۔''

''مل تو گیا ہے لیکن اس کے کس بل نکل گئے ہیں۔ تالا ٹوٹ گیا ہے۔ اوپر والا حصہ پچک گیا ہے۔ شاید مزید کوئی جھٹکا برداشت نہ کر سکے۔''

''کوئی بات نہیں اس کا علاج بھی کر دیتے ہیں۔ اس وقت امان اللہ مجھے حاجی سے زیادہ حکیم نظر آیا۔ ہم اس کو رسیوں سے کس جکڑ دیتے ہیں۔ دس مرتبہ بھی گرے گا تو نائیلون کی رسی ٹس سے مس نہ ہوگی۔'' امان اللہ نے پاس رکھی ہوئی فالتو رسی اٹھالی اور سوٹ کیس کے اردگرد لپیٹنے لگا۔

ہم ہر اس شخص کو جس نے عبا پہن رکھی ہوتی اور سر پر سرخ و سفید رنگ کا چوکور مفلر لپیٹ رکھا ہوتا معلم سمجھتے اور اس کا بازو تھام لیتے۔ بچپن سے لے کر حج کے لیے روانگی تک معلم کے متعلق اس قدر سن چکے تھے کہ ویسے بھی اس سے ملنے اور دیکھنے کی آرزو تھی۔ معلم۔ خزینہ علوم شرعیہ۔ جو آپ کو مناسک حج بتاتا ہے' دقیق شرعی مسائل کی نشاندہی کرتا ہے۔ آپ کے قیام و طعام کا بندوبست کرتا ہے' ٹرانسپورٹ مہیا کرتا ہے۔ صحت کا خیال رکھتا ہے۔ مونس و غم خوار' رہبر خوش گفتار۔ حج کی قبولیت تو ذات باری تعالیٰ کرتی ہے وہ قبولیت کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ پہاڑ کی چوٹی صرف دیکھنے سے سر نہیں ہوتی وہاں تک پہنچنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

لیکن معلم نے نہ آنا تھا' نہ آیا۔ کئی گھنٹوں کے جانگسل انتظار کے بعد ایک شخص ہمارے پاس آیا۔ اور پوچھنے لگا۔ ''لاہوری حاجی؟'' ''وہاں بالکل سو فیصد لاہوری۔'' حاجیوں نے بیک آواز جواب دیا۔

میں معلم کا کارندہ ہوں۔ سامان اٹھائیں' سامنے سڑک پر بسیں کھڑی ہیں جہاں جگہ ملتی ہے بیٹھ جائیں۔ اپنے پاسپورٹ نکال لیں ڈرائیور اکٹھے کر کے معلم تک پہنچا دے گا۔''

''لیکن معلم خود کیوں نہیں آیا۔'' انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ہم لوگ ساری رات کے جاگے ہوئے ہیں۔'' ایک نوجوان نے احتجاج کیا۔

''میرے خیال میں پہلی مرتبہ آئے ہو!'' کارندہ مسکرایا۔'' فکر نہ کرو۔ مکہ پہن کر تمہاری ملاقات کرادیں گے! وہ بہت مصروف آدمی ہے۔''

''یہ معلم ہے یا گورنر مکہ؟'' میں نے امان اللہ سے پوچھا۔

''یہاں کے ہر شخص کو گورنر ہی سمجھیں۔ حکومت اپنے لوگوں کو روزگار مہیا کرتی ہے۔ یہ بڑا نفع بخش کام ہے۔ اس کے لیے خاص آدمی چنے جاتے ہیں۔ ایک معلم کے پاس ہزاروں لوگ ہوتے ہیں۔ ہر کسی کو کیسے مل سکتا ہے! یہ کارندے ہی کام چلاتے ہیں۔''

''لیکن وہ مناسک حج.....؟ میں نے پوچھا۔''

''کیا آپ کو وزارت حج نے کتابچہ حج نہیں دیا۔ بس اسے ہی معلم سمجھیں''

''تو پھر کٹوتی کیوں کی جاتی ہے؟''

''شکر کریں کہ یہاں تیل نکل آیا ہے۔ دولت کی ریل پیل ہے نہیں تو ہوسکتا ہے واپسی پر احرام کی چادریں بھی رکھوا لیتے۔''

امان اللہ نے درست بات کی تھی۔ تیل کی دریافت سے پہلے حاجیوں کے قافلے لٹتے تھے۔ ہر طرف بھوک اور پیاس کی حکمرانی تھی۔ کھانے کے لیے صحرا کی ریت اور پینے کے لیے اونٹ کے کوہان سے نکلا ہوا گدلا پانی۔ محمد المانع جو ابن سعود کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا۔ لکھتا ہے۔ ''ایک سردار نے ہمیں دعوت پر بلایا۔ ہم نے فوراً قبول کر لی۔ امید تھی کہ کافی عرصے کے بعد اچھا کھانا ملے گا لیکن ہماری حیرانی کی حد نہ رہی جب ہم نے دیکھا کہ دسترخوان پر گوشت نہیں تھا۔ ہم نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور اس رات ہم بھوکے رہے۔ دراصل قصور سردار کا نہ تھا جو کچھ اس کے پاس تھا اس نے پیش کر دیا۔ عسرت و تنگدستی نے ساری مملکت کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ امیر آف بہاولپور ہر سال حج کے لیے جاتے تو اپنے ساتھ سینکڑوں خدمت گار اور حاجی لے جاتے۔ پورا سمندری جہاز ان کے لیے بک ہوتا۔ خیمے، برتن، اشیائے خورد و نوش، کاریں، گھوڑے اور بہت کچھ ۵۰..... ء کے اوائل میں ملک عبدالعزیز انہیں ملنے آیا۔ اس کی نظر ان کی رولز رائس پر پڑی باتوں باتوں میں کہنے لگا۔ مناسب سمجھیں تو رولز رائس یہاں چھوڑ جائیں۔ نواب صاحب نے اپنی ساری کاریں اور دیگر ساز و سامان اسے پیش کر دیا۔ آخر خادم حرمین شریفین جو تھا۔

آج کل نواب صاحب کی اولاد سوزوکی کاروں میں سفر کرتی ہے۔ اور سعودی فرمانروا کا ذاتی فلیٹ چھبیس جہازوں پر مشتمل ہے۔

جمبو ائیر بس' ڈگلس' ڈی۔سی' ہیلی کاپٹرز۔۔۔۔۔۔۔اگر چاہیں تو رولز رائس کی بجائے سارا کارخانہ خرید سکتے ہیں۔مرسڈیز کاروں کے حمام بنوا سکتے ہیں۔ائیر کرافٹ کیریئر پر غسل آفتابی کر سکتے ہیں۔عرب بدو اب اونٹ پر نہیں بیٹھتا بلکہ اسے اپنی ائیر کنڈیشنڈ پک اپ میں پیچھے بٹھاتا ہے۔پینے کے لیے منرل واٹر۔کاکولا۔پیپسی۔پھر بھی تشنگی دور نہ ہو تو بس ذرا لندن تک۔ہر کام کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔

نواب مرحوم کی اولاد کو خیال نہیں آیا نہیں تو ملک عبدالعزیز والا سوال دہرایا جا سکتا ہے۔

بس جب جدہ ائیر پورٹ سے نکلی تو ہم نے بڑی حسرت کے ساتھ ائیر پورٹ کو دیکھا۔ہم ٹھیک طرح سے اس ہوائی مستقر کو دیکھ نہ پائے تھے۔جدہ ائر پورٹ کا شمار دنیا کے اعلیٰ اور خوبصورت ترین ائیر پورٹس میں ہوتا ہے۔دراصل ہمیں جس حصے میں اتارا گیا تھا وہ مرکزی ائیر پورٹ نہیں بلکہ اس کا سایہ تھا۔ہر الم غلم اور فالتو چیز یہاں جمع کر دی گئی تھی۔مرکزی ائیر پورٹ وہاں سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔جدہ ائیر پورٹ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔انٹرنیشنل ائیر پورٹ جس میں ڈیوٹی فری شاپس ہیں۔آئینہ خانے ہیں۔خودکار سیڑھیاں ہیں۔الیکٹرانک سوئچ بورڈ ہیں۔Cip لاؤنجز ہیں ہر ہوائی کمپنی نے اپنے مہمانوں کے لیے آرام گاہیں بنوائی ہیں۔فوم کشن کے صوفے جن پر بیٹھتے ہی آدمی کمر تک نرم فوم میں دھنس جاتا ہے۔قسم قسم کے مشروبات۔Snacks' خوشبودار ٹائیلٹ مودب عملہ۔ہر کام خود بخود ہوتا ہے۔کسی معلم کی ضرورت نہیں رہتی۔دوسرا حصہ ڈومیسٹک فلائیٹس کا ہے۔اندرون ملک سفر کرنے والوں کے آرام و آسائش کا بھی مناسب خیال رکھا جاتا ہے۔اور تیسرا حج ٹرمینل تھا جو پچیس لاکھ حاجیوں کا مسکن تھا۔ایک محتاط اندازے کے مطابق سال میں کروڑ انسان عمرے اور حج کے لیے آتے ہیں۔صرف رمضان المبارک میں لوگوں کی تعداد پچیس لاکھ سے کم نہیں ہوتی۔

بس چلی تو ہم نے جدہ شہر پر ایک نگاہ ڈالی۔ہنوز اندھیرا تھا لیکن جگ مگ کرتی روشنیوں نے اس کو بے اثر کر رکھا تھا۔ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے آسمان زمین پر اتر آیا ہے اور ہر طرف ستارے بکھر گئے ہیں۔بحر احمر کے اس شہزادے کی تاریخ دلچسپ ہے اور سوچ کے کئی در بھی وا کرتی ہے۔آسٹریلیا کے شہر سڈنی کی طرح یہ بھی کبھی گدائے بے نوا تھا۔چند مچھیروں کے جھونپڑے' چار سو تپتی ہوئی ریت' غول بیابانی' بھوک اور افلاس کی حکمرانی۔العطش۔العطش۔شاید یہی وجہ تھی کہ بی بی حوا کو سزا کے طور پر یہاں اتارا گیا تھا۔اس کے لغوی معنی بھی یہی ہیں۔نانی۔دادی۔آج ان کی قبر کے نشان نہیں ملتے بالفرض مل بھی جاتے تو ان پر کبھی کے بلڈوز و پھر چکے ہوتے۔شرک جو ختم کرنا ہے۔جدہ کے ایک معنی ساحل سمندر کے بھی ہیں جو ایک حقیقت ہے۔لیکن لوگوں کی اکثریت فسانے کو

ہی حقیقت سمجھتی ہے جو سبق آموز اور عبرت انگیز ہے۔ ایک چھوٹی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا! کہاں خلد بریں کی معطر تازہ ہوا اور کہاں دشت تنہا' کہاں حور غلماں اور کہاں جنگل بیابان..... چشم تصور رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔ ناز و نعم میں پلی' کوثر و تسنیم میں دھلی نوجوان لڑکی نے کس طرح اس بے رحم دھرتی کو پہلی بار دیکھا ہوگا۔ بادصحرا کے کتنے تھپیڑے کھائے ہونگے۔ آتش فشاں سورج کی ظالم کرنوں سے کیا باتیں کی ہونگی۔ حدنگاہ تک پھیلے ہوئے سمندر سے کیا مانگا ہوگا! Water

Water - every where and not a drop to drink.

رحم میرے مالک رحم۔ رحم رب کائنات۔ رحم پروردگار عالم۔ صرف ایک جملہ تھا جو حرز جاں بن گیا تھا۔ ایک بے بس آنسو تھا جو پھیل کر سمندر ہو گیا۔ بال آخر دعائیں قبول ہوئیں۔ خطائیں معاف ہوئیں اور در رحمت کھل گیا۔ سینہ چاکان چمن سے آملے سینہ چاک۔ اس دھرتی پر پہلی بار آدم اور حوا نے آہوں اور ہچکیوں کے درمیان ایک دوسرے کو کس طرح دیکھا ہوگا!

قطع نظر ان روایات کے جدہ کی تاریخ ۲۵۰۰ سال پر محیط ہے۔ قوادا قبیلے Quada'Tribe نے اس کی بنیاد رکھی۔ مچھیروں نے اپنی سہولت کی خاطر یہاں چند جھونپڑے بنا لیے تھے۔ چھ سو سال بعد حضرت عثمان کی دور رس نگاہ اس قصبے پر پڑی اور انہوں نے اس کو بندرگاہ کے لیے موزوں پایا۔ بعد میں اسے بلاد الکانسل' کہا جانے لگا جس کے معنی سفارت کاروں کا شہر ہیں۔ پرتگیزوں کے ڈر سے سولہویں صدی میں عثمانیوں نے اس کے اردگرد ایک مضبوط فصیل کھڑی کر دی اور آنے جانے کے لیے صرف چار راستے مقرر کئے۔ باب شریف جنوب کی سمت کھلتا تھا۔ مشرق میں باب مکہ تھا۔ شمال میں باب مدینہ تھا۔ اور غربی دروازہ سے بحر احمر کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ ۱۹۰۰ میں ایک نیا دروازہ باب جدید بنایا گیا جو خاصا چوڑا تھا اور اس میں ایک کار با آسانی گزر سکتی تھی۔

۱۹۱۵ تک جدہ ترکوں کے زیر اثر رہا۔ دیواریں بھی اس حالت میں رہیں۔ ترکوں کے فن تعمیر کے خوبصورت نمونے جگہ جگہ ملتے ہیں۔ شہر کے مرکز میں تجارتی منڈی تھی جسے سوق Souq کہا جاتا ہے۔

۱۸۸۹ میں سوئیز کینال کھلی تو جدہ مزید اہمیت اختیار کر گیا۔ بحیر قلزم اور بحر الکاہل کے ممالک کے تجارتی قافلے یہاں سے ہو کر گزرتے۔ جہاز رانی کی ترقی اور فروغ نے اس کی بندرگاہ کو بھی نہایت اہم بنا دیا۔ لوگوں میں روزگار کے مواقع بڑھے اور اس طرح ان کا معیار زندگی بھی خاصا بلند ہوا۔ شہر کے شمالی حصے کو سفارت کاروں کے لیے مختص کر دیا گیا۔ ان کی دیکھا دیکھی امیر لوگوں نے بھی وہاں اپنے محل نما مکانات کھڑے کر لیے۔

۱۹۲۹ اس اعتبار سے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس سال پہلی مرتبہ سیمنٹ اور سریے کی آمیزش سے پکا مکان تعمیر کیا گیا۔ ۱۹۴۰ میں بجلی آئی ۱۹۸۴ میں پہلا ہوائی اڈہ بنا اور ۱۹۵۶ میں خودکار ٹیلی فون سسٹم متعارف کرایا گیا۔ شاہ عبدالعزیز کے دور میں

ترکوں کے زمانے کی بنی ہوئی شہر پناہ گرادی گئی۔ یہ ضروری بھی تھا کیونکہ شہر ایک ہوشربا سرعت رفتار کے ساتھ ترقی کر رہا تھا۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ ۱۹۴۷ تک سارا شہر ایک مربع میل تک محدود تھا۔ اور آبادی تیس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اب شہر ۵۶۰ مربع کلومیٹر تک پھیل چکا ہے اور آبادی بیس لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے۔ آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتیں۔ دھرتی کو چومتے ہوئے گل وگلزار۔ ایک بہت بڑا ائیر پورٹ۔ ایک عظیم بندرگاہ۔ جدہ باب مکہ و مدینہ کہلاتا ہے۔ ۹۸ فیصد حاجی اس شہر کے راستے حج کرنے جاتے ہیں۔ بے شمار ہوٹل' کلب' تفریح گاہیں بن گئی ہیں۔ آج جب اس کے اصل معماروں کی روحیں اس شہر کا طواف کرتی ہونگی تو ضرور وجد میں آتی ہونگی۔ جو نحیف سا کملایا ہوا پودا انہوں نے لگایا تھا' ایک قدآور درخت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ سرسبز و شاداب درخت۔ وہ بے رحم سمندر جس نے حوا کو ایک بوند میٹھا پانی دینے سے انکار کر دیا تھا ہاتھ جوڑے لاکھوں ٹن میٹھا پانی سارے شہر کو مہیا کر دیا ہے۔ حکومت نے بہت بڑے واٹر فلٹریشن پلانٹ لگا رکھے ہیں۔ بعض شہر رات کو خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ دن کو جوان لگتے ہیں اور شہر جدہ۔ تو جواں ہے گردش شام وسحر کے درمیان۔ فلک بوس عمارتیں' سکائی کرپیرز۔ فائیو سٹار ہوٹلز' آسمان زمین پر اتر آیا ہے' عمارتوں نے ستاروں کی شال اوڑھ لی ہے۔ مقام اور مرتبہ ان کی زد میں آ گیا ہے۔ ہر روز ہزاروں اڑن کھٹولے یہاں حبہ سائی کرتے ہیں۔ غیض آلود سمندری لہروں سے بچتے بچاتے سینکڑوں جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں۔ حجاج کرام' بزنس ٹائی کون' سیاح' مورخ' جاسوس' غیر ملکی فوجی' شہر کی حد تک عرب وعجم کی تمیز ختم ہوگئی ہے۔ ہر شے' ہر وقت مقدار میں مل سکتی ہے۔ عرب اب اونٹ کا دودھ نہیں پیتے اپنے اونٹوں کو ملک پیک پلاتے ہیں۔ گوشت یورپ و آسٹریلیا سے آتا ہے۔ منرل واٹر اور پھلوں کا جوس امریکہ سے درآمد ہوتا ہے۔ پھل' ہر قسم کا دستیاب ہے۔ آم سے لے کر املوک تک' انگور سے لے کر انار تک۔ اناس' سیب۔ اسٹرابری' مالٹے' کیلے' پپیتا' گرما' سردا' زیتون' تربوز' رس بری' کھجور۔ کاش آج ابن سعود کا پرائیویٹ سیکرٹری محمد المانع زندہ ہوتا تو اس عرب سردار کی عسرت وتنگدستی کا یوں برملا پردہ فاش نہ کرتا جو دعوت میں گوشت فراہم نہ کر سکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مشروبات اور ماکولات کے کوہ ندا میں گھرا ہوا پاتا۔ یا ایھا الناس چلو کوہ ندا کی جانب۔

◆◆◆

روڈ ٹو مکہ

بس میں کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ تھکے ہارے حاجی' قوی مضمحل' ستے ہوئے چہرے' شب بیداری اپنے نشاں ضرور چھوڑ جاتی ہے۔ نیند کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ سولی پر تو پتہ نہیں آتی ہے یا نہیں لیکن بس میں ضرور آ جاتی ہے۔ خصوصاً جبکہ سڑکیں ہموار ہوں' ڈرائیور تجربہ کار ہوں' بریک کا بے جا استعمال نہ کرنا پڑے اور ہارن کو بطور موسیقی کے استعمال نہ کیا جائے۔ مغربی ممالک میں ہارن بجانا گالی کا نعم البدل ہوتا ہے۔ وطن عزیز کی طرح کھڑکیوں سے گردنیں باہر نکال کر زبان دانی کے جوہر نہیں دکھلائے جاتے اور نہ ہی شجرہ نسب کھنگالا جاتا ہے۔ انتہائی غصے کے عالم میں ہلکا سا ہارن اور پھر اپنی راہ لی۔

آدھے گھنٹے تک تو یہ صورت حال قائم رہی۔ اچانک امان اللہ کی بھاری بھرکم آواز گونجی "اے غافل انسانوں! بیدار ہو جاؤ۔ اٹھو اور اپنے چار سو دیکھو۔ ساری زندگی خواب استراحت کے مزے لوٹتے رہے ہو۔ تمام عمر غفلت میں کٹ گئی ہے۔ کیا ان راستوں کو پہچانتے ہو۔ انہی راہوں پر کبھی رسالت مآب کا قافلہ گزرا تھا۔ انہیں گھپ اندھیروں میں سے آفتاب نبوت طلوع ہوا تھا۔ انہیں فضاؤں میں پہلی مرتبہ آواز اذاں گونجی تھی۔ کھڑکیاں کھول دو۔ اس پاک ہوا کا لمس جب در و جود پر دستک دے گا تو ہر دروازہ خود بخود کھلتا جائے گا۔ عرفان و آگہی تمہیں اپنے حصار میں لے لیں گے۔ باہر دیکھو رات چھٹ گئی ہے' سپیدہ سحر پھوٹ رہا ہے۔ کائنات تسبیح پڑھ رہی ہے۔ یہ وقت عبادات کا ہے۔" ایسے پتہ چلتا تھا جیسے امان اللہ نصیحت نہیں کر رہا صور اسرافیل پھونک رہا ہے۔ ہر شخص ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا جیسے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہو' جیسے بہت قیمتی لمحے ضائع ہو گئے ہوں' تغافل' تساہل' تاسف۔ لبیک اللھم لبیک۔ لبیک لاشریک لک لبیک۔ بس کی رفتار تیز ہو گئی۔ ڈرائیور پر بھی وجد طاری ہو گیا تھا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے بس کو پٹرول نہیں بلکہ اسم ربی چلا رہا ہے۔ سورج نکل آیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور ریت اب صاف نظر آ رہی تھیں۔

جدہ سے مکہ ۶۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ راستے میں بس صرف ایک جگہ رکی۔ ڈرائیور نے بس میں تیل ڈلوایا۔ اتنے میں کچھ عربی آ گئے انہوں نے ہاتھوں میں بڑے بڑے ٹرے اٹھا رکھے تھے۔ ان میں کھانے پینے کا سامان تھا۔ جوس سینڈوچ' کھجور' بسکٹ اور بادام۔ وہ سواریوں میں بانٹنے لگے۔ مسافروں نے قدرے حیرت اور شک کے ساتھ انہیں دیکھا۔ وہاڑی کے بابا دین محمد نے لینے سے پہلے تسلی کے لیے قیمت پوچھی۔ مفت' فی سبیل للہ۔ عربی مسکرایا۔ امان اللہ نے اس سے دو پیکٹ لیے اور ایک میری طرف

بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''شاہ صاحب کچھ کھالیں آپ نے رات سے کچھ نہیں کھایا۔''

میں نہیں کھا سکتا!'' میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

آخر کیوں؟

''آپ کھا کر تو دیکھیں بڑا مزیدار ہے۔'' وہ قدرے حیران ہو کر بولا

''سید پر خیرات حرام ہے۔''

''خیرات نہیں صدقہ حرام ہے!'' وہ میری کم علمی پر مسکرایا۔

''خیرات اور صدقے میں کیا فرق ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خیرات خیرات ہوتی ہے اور صدقہ' صدقہ'' اب کے غالباً وہ اپنی کم علمی پر مسکرایا تھا۔

شہر آرزو

صبح دس بجے کے قریب ڈرائیور کی مائیک پر آواز گونجی۔ اب ہم حدود حرم میں داخل ہو گئے ہیں۔ آپ کے دائیں ہاتھ مسجد عائشہ ہے اور بائیں طرف پہاڑیوں کا وہ سلسلہ ہے جو اس شہر کی شناخت ہیں اور سامنے شہر مکہ ہے۔ حمد باری تعالیٰ مزید تیز ہو گئی۔ حاجیوں نے ایک خوشگوار حیرت اور بے پناہ عقیدت کے ساتھ مکہ پر نگاہ ڈالی۔ بلند و بالا عمارات' صاف روشن سڑکیں۔ چار سو سپر سٹورز۔ ہر ماڈل اور میک کی گاڑیاں' بے آب و گیاہ پہاڑوں کی فصیل۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے شہر اس فصیل کو اپنا محافظ نہیں سمجھتا بلکہ اپنی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے۔ چنانچہ مکانوں کا سلسلہ پہاڑ کی چوٹیوں تک چلا گیا تھا۔ جہاں جہاں ممکن تھا پہاڑوں کی تراش خراش کی گئی تھی۔ اور ان کا سینہ چیر کر سرنگیں نکالی گئی تھیں۔ میرے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ اکیسویں صدی کی حقیقتوں کے باوجود انسان اکثر اوقات حسین تصورات کے حصار سے باہر نہیں نکل پاتا یا نکلنا نہیں چاہتا۔ لڑکپن سے ذہن میں اس شہر کی جو تصویر بنا رکھی تھی اس میں دراڑیں پڑتی نظر آئیں۔ نہ اونٹوں کے قافلے نظر آئے اور نہ وہ حدی خواں۔ وہ راستے اور پگڈنڈی کدھر گئیں جو رسالت مآب کے قدموں کی چاپ سنا کرتے تھے۔ وہ خاک کہاں اڑ گئی جو حضور کے قدم چوما کرتی تھی۔ وہ بدلی کیسے تحلیل ہو گئی جو ہر وقت سایہ فگن رہتی تھی۔ اینٹ' سیمنٹ اور تارکول نے ہر چیز کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ کوئی چیز بھی تو اپنی اصل حالت میں نہ تھی۔ زندہ قومیں اپنے اسلاف کی نشانیوں کی نگہداشت کرتی ہیں اور ایک ہم مسلمان ہیں جو چن چن کر انہیں ختم کر رہے ہیں۔ مکہ شہر پر غرور ہے۔ مکہ جو مجسم جلال ہے جو اکڑی ہوئی گردنیں توڑ دیتا ہے۔ یہاں آ کر شاہان پر غرور کے سر ادب و احترام کے ساتھ جھک جاتے ہیں۔ ابرہہ کا غرور یہیں پیوند

خاک ہوا تھا۔ کفار مکہ کی انا اسی سرزمین میں دفن ہوئی تھی۔

دو متضاد کیفیتوں نے بیک وقت مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ برسوں کی دلی مراد آج بر آئی تھی۔ اس خدا کے گھر آنے کی سعادت نصیب ہوئی تھی جو ہر گھر میں بستا ہے۔ آج حال دل اسے سنانا تھا جو دل کی دھڑکن تک گن لیتا ہے۔ اس کے حضور دعائیں مانگنا تھیں جو جنبش لب سے پہلے ہی انہیں شرف قبولیت بخشتا ہے۔ اشک ندامت اسے پیش کرنا تھے جس کی رحمت کا در کبھی بند نہیں ہوتا۔

دوسری کیفیت البتہ تکلیف دہ تھی۔ ایک حسین خواب جو چکنا چور ہو گیا تھا۔ تصورات کا تاج محل زمین بوس ہو گیا تھا۔ عقیدت کے قافلوں کو وقت کے رہزن نے لوٹ لیا تھا۔ اے شہر مکہ کیا تمہیں یاد ہے کہ تم نے اپنے محسن کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ کس بے دردی کے ساتھ تم نے اسے شہر بدر کیا۔ کس کسمپرسی کے عالم میں وہ یہاں سے نکلا تھا۔ تم سراپا تمسخر تھے' مجسم طنز تھے' اس کے ازلی دشمن تھے۔ اس کے باوجود اس نے تمہارے وقار پر آنچ نہیں آنے دی۔ اس کے رب نے تمہیں اپنا مسکن بنایا۔ اس نے تمہیں اپنی شناخت دی۔ عروس البلاد بنا دیا۔ آج دنیا کو کوئی شہر تمہاری ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کوئی تمہاری پاک دامنی پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ لب پر تمہارا نام آتے ہی سر تعظیماً جھک جاتے ہیں۔ دلوں کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ تم احترام و عقیدت' عزت و وقار' تمکنت دین کا ایک حسین استعارہ بن گئے ہو۔ جانتے ہو یہ سب کیوں کر ہوا ہے۔ تم اس انسان کامل کا مولد ہو جس کے لیے خالق حقیقی نے یہ سب کائنات بنائی ہے۔

بس مکے کی سڑکوں پر بے مقصد دوڑتی رہی۔ دو گھنٹے گزر گئے لیکن منزل تو درکنار نشان منزل بھی نظر نہ آیا۔ مکہ کوئی اتنا بڑا شہر تو نہیں ہے لیکن مکانات کی تلاش بہر حال مشکل کام ہے۔ اکثر ڈرائیور مکہ کے رہائشی نہیں ہیں۔ حج کے موقع پر ان کی خدمات مستعار لی جاتی ہیں۔ بسیں بھی ہمسایہ ممالک سے آتی ہیں۔ چند لاکھ کی آبادی والے شہر میں بیک وقت پچیس لاکھ لوگ آ جائیں تو لامحالہ مسائل پیدا ہونگے۔ اہل مکہ کثیر تعداد میں اپنے مکانات کرایہ پر دے کر باہر منتقل ہو جاتے ہیں۔ گویا سال کا خرچ ایک ماہ میں نکل آتا ہے۔

دو گھنٹے گزر گئے۔ نماز فجر قضا ہو گئی۔ ڈرائیور اسٹیئرنگ کے ساتھ چمٹا رہا اور گاڑی مکے کی ہر سڑک کا طواف کرتی رہی۔

معلم کو فون کیوں نہیں کر لیتے۔ کب تک ہمیں ہلکان کرو گے؟'' کسی سواری نے اسے احتجاج آلود مشورہ دیا۔

''اسے ڈر ہے کہ کہیں بس بھاگ نہ جائے۔'' امان اللہ نے گرہ لگا دی۔ ''مجھے تو اندیشہ ہے کہ یہ خود دوڑ جائے گا۔'' ایک دوسرا شخص کہنے لگا۔ ''دیکھتے نہیں شب بیداری نے اسکے چہرے پر دراڑیں ڈال دی ہیں۔''

ایک گھنٹہ اور گزر گیا۔ اور ہم نے بلا ارادہ آدھے شہر کی سیر کر ڈالی۔ تمام شاہراہیں۔ گلیاں' محلے حاجیوں سے بھرے پڑے تھے۔ بڑا عجیب منظر تھا۔ ترکی' ایران' عراق' شام' انڈونیشیا' بھارت پاکستان ملائیشیا' و دیگر اسلامی ممالک سے لوگ آئے تھے۔ مخصوص لباس' نامانوس خدوخال۔ چال ڈھال' چہرے مہرے الگ الگ لیکن مقصد ایک تھا۔ سرخ وسفید ترکوں نے کریم کلر کے ڈھیلے ڈھالے سفاری سوٹ پہن رکھے تھے۔ ایرانیوں نے سفید رنگ کا قومی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ افریقی ممالک کے لوگ رنگ برنگے ٹخنوں تک لمبے چغوں میں ملبوس تھے۔ عرب اپنی عباؤں اور عماموں کی وجہ سے صاف پہچانے جاتے تھے۔ پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان کا لباس یکساں تھا۔ شلوار قمیض۔ چونکہ ہم حج کے آخری دنوں میں پہنچے تھے اس لیے ہم سے پہلے پہنچے ہوئے لوگ عمرہ کر چکے تھے اور حج کی تیاری کر رہے تھے۔

سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ ڈرائیور کے حلق کی سرنگ سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے یہ الفاظ نکلے تو مسافروں نے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ معلم کے اس ملازم کو دیکھا جو بس کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ بس ایک عمودی چڑھائی چڑھ کر پلیٹ فارم پر رک گئی۔ معلم کے اسسٹنٹ نے بس میں داخل ہو کر ہر مسافر سے دو دو فوٹو اور شناختی کارڈ کی کاپی مانگی۔ مسافروں کی اکثریت نے بے بسی سے کندھے اچکائے۔ ''اس کے بغیر آپ بلڈنگ میں نہیں جا سکتے!'' اس نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔

''آخر کیوں؟'' میں نے اس سے پوچھا'' حاجیوں کے فوٹو اور شناختی کارڈ سوٹ کیسوں میں ہیں۔ سوٹ کیس چھت پر ہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ چھت سے سوسوٹ کیسوں کو اتارا جائے اور انہیں بیچ بازار کھولا جائے۔ اس کے لیے اتنا ہی وقت درکار ہوگا جتنا انہیں جدہ سے یہاں آنے میں لگا ہے۔''

''آخر قواعد ضوابط بھی کوئی چیز ہیں!'' اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

''اس کے لیے کوئی واضح ہدایات نہیں دی گئیں۔ کہو تو میں تمہیں ہدایت نامہ حج پڑھ کر سناؤں۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر موبائیل فون پر کسی سے عربی میں بات کی اور کہنے لگا۔ ''کوئی بات نہیں۔ میں کمرے میں آ کر لے جاؤں گا۔''

اب کے بس چلی تو سیدھی بلڈنگ نمبر ۲۲۴ پر جا کر رکی۔ سامان اتارنے اور کمروں تک پہنچنے میں مزید ایک گھنٹہ لگ گیا۔ سات منزلہ عمارت غالباً تیس سال پرانی تھی۔ ایک چھوٹی سی لابی جس میں پندرہ بیس کرسیاں دھری تھیں۔ کاؤنٹر کے ساتھ چائے اور کافی کا سامان پڑا تھا۔ دیوار پر ہاتھ سے لکھا ہوا بورڈ آویزاں تھا۔ چائے خود بنائیں اور ایک ریال بکس میں ڈال دیں۔ ایک ریال کی حد

تک حاجیوں کی ایمانداری پر شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بلڈنگ کی لفٹ بھی اس کی ہم عمر تھی۔ مسافروں کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے اس کی کمر دہری ہوگئی تھی۔ بڑے آرام سے نیچے آتی اور پھر سسکتی ہوئی اوپر جاتی۔ اس کے سامنے مسافروں کی ایک طویل لائین لگی ہوئی تھی۔ امان اللہ کہنے لگا۔ ''ہم کب تک انتظار کریں گے۔ شاہ صاحب سامان اٹھائیں اور اللہ کا نام لے کر چار منزلیں پھلانگ جائیں۔''

سامان اٹھا کر سیڑھیاں چڑھنا مشکل کام تھا لیکن لائن میں مزید انتظار کرنا اس سے زیادہ صبر آزما تھا۔ ہم نے اپنا اپنا سامان اٹھایا اور ہانپتے کانپتے چوتھی منزل کے کمرہ نمبر ا میں پہنچ گئے۔ سامان رکھ کر کمرے کا جائزہ لیا تو پسینے کے ساتھ کپکپی بھی طاری ہوگئی۔ 12x10 کا کمرہ جس میں فوم کے پانچ گدے بچھے تھے۔ ملازم نے بتایا کہ ہر حاجی کے لیے 6x3 جگہ مختص کی گئی ہے۔ اسی گدے پر سامان رکھنا ہے' نماز پڑھنا ہے' سونا ہے اور کھانا کھانا ہے۔ ''ملحقہ باتھ روم تک پہنچنے کا طریقہ ہے؟ میں نے پوچھا۔

''بڑا آسان ہے۔ حاجیوں پر سے پھلانگتے ہوئے غسل خانے میں گھس جائیں۔''

امان اللہ نے ٹائیلٹ کا جائزہ لیا۔ باہر آ کر کہنے لگا۔ کپڑے لٹکانے کے لیے کوئی ہینگر نہیں ہے کوئی میخ ہی لگا دیتے۔ طہارت کے لیے احرام کہاں لٹکائیں گے؟''

ملازم کچھ سوچتے ہوئے بولا ''شاید یہ کمی رہ گئی ہے۔ انشا اللہ اگلی دفعہ جب آپ آئیں گے تو ہینگر کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔''

''گویا ہینگر دیکھنے کے لیے ایک حج اور کرنا پڑے گا؟''

''معلم کدھر ہے؟'' میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ کہیں بھی تو آپ کے خیال سے غافل نہیں ہے۔ دیکھئے تو سہی اس نے آپ کے لیے کیا مزیدار ناشتہ بھجوایا ہے۔'' وہ باہر سے دو پیکٹ اٹھا کر لے آیا جن میں مٹھی بھر چاول اور ایک چکن پیس رکھا تھا۔ ناشتہ واقعی لذیذ تھا کیونکہ بھوک تیز تھی۔ میں نے رات سے کچھ نہ کھایا تھا کیونکہ امان اللہ خیرات اور صدقے کا فرق نہ سمجھا سکا تھا۔ امان پچپن کے پیٹے میں ہوگا لیکن ایک صحت مند جسم اور مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ پولیس اور محکمہ ایکسائیز میں کچھ سال گزار چکا تھا۔ ہر چند کہ محکمہ پولیس اور نیک نامی ہمیشہ ایک شریفانہ فاصلے پر رہے ہیں لیکن اس میں جو نیک اہلکار ہیں وہ بہت جلد روحانی منازل طے کر لیتے ہیں۔ ان کی توبہ شیوہ پیغمبری کے زمرے میں آتی ہے۔ اس کے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو خیر باد کہنے کی غالباً یہی وجہ تھی۔ وہ پہلے عمرہ کر چکا تھا اس لیے مکہ کے راستوں اور مناسک حج سے بخوبی واقف تھا۔

''کچھ دیر آرام کر لیا جائے!'' میں نے مشورہ دیا۔

''ہرگز نہیں۔ایسا سوچیں بھی نہیں!'' وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا''بدن شل ہوجائے گا'تھکن مزید بڑھ جائے گی اوراعصاب جواب دینے لگیں گے۔فوراً چلیں اورعمرہ ادا کریں۔سکون اورطمانیت خودبخود آپ کواپنے حصار میں لے لیں گے۔''

''تو پھر دیر کس بات کی ہے!''میں نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔

ہم کمرے سے نکلنے والے ہی تھے کہ معلم کا نائب بغیر دروازہ کھٹکھٹائے اندر آ گیا۔اس کے پیچھے وہاڑی کا بابا اوراس کر کراہتی ہوئی بھاری بھرکم بیوی تھی۔''صرف ایک رہ گیا ہے۔'' وہ مسکرایا۔''پھر کورم پورا ہوجائے گا۔''

جب بابا کو پتہ چلا کہ ہم طواف کے لیے جارہے ہیں تو وہ امان اللہ کی منت کرتے ہوئے بولا۔''پتر سانوں وی نال لے چلو۔''

''لیکن تمہاری بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔یہ ایک میل چل نہیں پائے گی۔''امان اللہ نے اس کی بیوی کی طرف اشارہ کیا جو ہاتھوں سے گھٹنوں کو سہلا رہی تھی۔

''چلے گی! چلے گی!''بابا کے لہجے میں بلا کا یقین تھا۔''جو اسے یہاں تک لے آیا ہے وہ وہاں تک بھی پہنچائے گا۔''

''تو پھر اٹھو اور مجھے اپنی لاٹھی سمجھو!''امان اللہ کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں ہم لفٹ کے ذریعے نیچے آئے۔لابی میں ہنوز بڑی بھیڑ تھی۔ایک تسلسل اورتواتر کے ساتھ بسیں حاجیوں کو لا رہی تھیں۔صرف اس بلڈنگ میں ایک ہزار حاجیوں کے ٹھہرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔امان اللہ نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود چائے لینے چلا گیا۔تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی' چائے پی کر جسم میں تازگی محسوس ہوئی۔ہم نے قیمت ادا کرنا چاہی تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔مسکرا کر بولا''آپ کی امان میں آئے ہیں تو پھر امان اللہ کا بھی کچھ فرض بنتا ہے۔آج کے دن آپ میرے مہمان ہیں۔''

جب ہم بلڈنگ سے باہر نکلے دن کے تین بج رہے تھے۔بایاں موڑ کاٹ کر ہم شاہراہ پر آ گئے۔نہایت وسیع سڑک تھی جس کے دونوں اطراف میں بلند و بالا عمارات تھیں۔دوکانوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔الیکٹرانگ گڈز' کلاتھ شاپس' تجارتی کمپنیوں کے دفاتر' ہوٹل۔ریسٹورنٹ فارمیسی' منی چینجرز' بینکس 'فروٹ شاپس' کسی بھی بڑے شہر کی طرح کا ماحول تھا۔وہی لوازمات تھے ہر چیز حسب خواہش خریدی جاسکتی تھی چرب زبانی اورفن سے بیچی جاسکتی تھی۔

شاہراہ پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔حاجیوں کے قافلے جوق در جوق' لہر در لہر آ جا رہے تھے۔کیا ایک شہر کے دو روپ ہو سکتے ہیں۔''میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔کدھر گئی وہ گرد راہ جو شتر بانوں کا غازہ تھی۔کہاں بکھر گئی ہے وہ موسیقی جو ناقوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں سے پیدا ہوتی ہے اور کانوں میں عجب رس گھولتی تھی۔کیسے سو گئی ہے وہ رجز خوانی جو جذبوں کو جگاتی تھی اور روح کو

بالیدگی بخشتی تھی۔ گرد و غبار کو تارکول' سیمنٹ اور سریے نے ڈس لیا تھا۔ موسیقی ٹرانسسٹروں اور ٹیپ ریکارڈروں میں قید ہو گئی تھی۔ رجز اور رمل کی تمیز ختم ہو گئی تھی۔

''شاہ صاحب کیا سوچ رہے ہیں؟'' امان اللہ نے میرے انہماک کو توڑا ''حرم شریف کتنی دور ہے؟'' میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی زیادہ دور نہیں لیکن بابا اور مائی پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس نے گردن پھیر کر ہجوم میں انہیں تلاش کرنا چاہا۔

''آ جائیں گے!'' میں نے اسے تسلی دی۔

''جب تک وہ آ نہ جائیں ہم آگے نہیں بڑھ سکتے!'' اس نے اپنا دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔

''آخر کیوں؟'' مجھے قدرے حیرت ہو رہی تھی۔

''حج تو آدمی کرتا ہے لیکن قبولیت اوپر ہوتی ہے۔'' اس نے شہادت کی انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ ہزاروں میل کے فاصلے چند ناتواں قدموں کی گرفت میں آ جائیں۔''

''تو چلو انہیں تلاش کرتے ہیں!'' مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے میں ایک بلند پہاڑ کی چوٹی سے گرتے گرتے بچا ہوں۔

ہم واپس مڑ کر تھوڑی دور ہی گئے ہونگے تو وہ نظر آ گئے۔ مائی فٹ پاتھ پر بیٹھی گھٹنوں کو سہلا رہی تھی۔ اس کی ہائے ہائے کی کراہ ہجوم کے شور و غل میں دب گئی تھی۔ بابا اسے تسلی دے کر ہمت بڑھا رہا تھا۔ ''ٹیکسی منگوا لیں!'' میں نے پوچھا۔

''اس کی ضرورت نہیں اب فاصلہ ہی کتنا رہ گیا ہے۔'' یہ کہہ کر مائی اٹھ کھڑی ہوئی۔ فاصلہ اگر ہزار میل کا ہوتا تو بھی آسانی سے کٹ جاتا۔ عزم و یقین جب ہمت کی کمر باندھ لیں تو پھر کوئی دشواری' دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے آتش شوق جوان ہوتی گئی۔ مائی کے گھٹنوں کے درد گھٹتا گیا۔ بابا کی بوڑھی کمر کا خم نکلتا گیا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے وجود میں کسی نے پارہ بھر دیا ہو۔ خون میں بجلیاں کوند رہی ہوں' روح میں ایک ہیجان برپا ہو' ضبط کا ہر بند ٹوٹنے والا ہو۔

ہم نے آخری موڑ کاٹ کر ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کو عبور کیا تو امان اللہ کی آواز میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ ''وہ رہا لا مکان کا گھر۔'' بیت اللہ۔ وہ آہوں اور ہچکیوں کے درمیان بولا۔ ہمارے قدم تیز ہو گئے۔ دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دینے لگیں۔ ہم نے باب عبدالعزیز کے سامنے پڑے ہوئے شوریک میں اپنے جوتے رکھے اور مسجد الحرام میں داخل ہو گئے۔ سنگ مرمر کے بنے ہوئے ایک وسیع و عریض ہال کو عبور کر کے جب ہم نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو سامنے کعبہ تھا۔ نیم تراشیدہ کالے پتھروں کا بنا ہوا ایک بہت اونچا کمرہ

جس کے اردگرد سفید لباس پہنے ہوئے لاکھوں لوگ طواف کر رہے تھے۔ قرآنی آیات سے آراستہ غلاف کعبہ پر نظر پڑی تو میرے قدم ساکت ہو گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شکست وریخت کا عمل شروع ہو گیا ہو۔ اس ایک غلاف نے اندر کے کئی غلاف اتارنا شروع کر دیئے۔ نفرت۔ کدورت۔ تعصب۔ ریاکاری' لالچ۔ جہالت۔ اقربا پروریل۔ انسان کسی قدر کمزور ہے' کتنا خودغرض ہے' کوتاہ بیں ہے! ذات کے حصار سے باہر نہیں نکل پاتا۔ نہ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اور نہ آگے کی فکر ہوتی ہے۔

لمحہ موجود۔ آخر اشرف المخلوقات اور حیوانوں میں کچھ فرق تو ہونا چاہیے مجھے ایسے لگا جیسے سامنے ایک بہت بڑی عدالت لگی ہے۔ ایک مجرم کٹہرے میں کھڑا اعتراف جرم کر رہا ہے۔ دور کہیں فضا میں بجلی کڑکی' زور سے بادل گرجے اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ شوریدہ سرندی بپھر کر کناروں سے باہر آ گئی۔ پانی کا ایک زبردست ریلہ آیا اور سرزمین دل دھل کر صاف ہو گئی۔ صدیوں کا بارگراں اتر گیا۔

''شاہ صاحب ہوش میں آئیں۔'' امان اللہ نے مجھے جھنجھوڑا۔ ''ہم حجر اسود کے سامنے پہنچ چکے ہیں۔ طواف شروع کریں۔ یہ تسبیح پکڑ لیں۔ سات دانے ہیں' سات پھیرے لینے ہیں۔ ہر پھیرے کی دعائیں تو یاد ہیں ناں! وہ سامنے مقام ابراہیم ہے۔ پتہ ہے وہاں کیا پڑھنا ہے؟ کیا کہنا ہے؟''

مجھے حضرت ابراہیم سے بہت کچھ کہنا تھا۔ بہت کچھ پوچھنا تھا لیکن یہ موقع نہیں تھا۔

بڑا روح پرور منظر تھا۔ بہت ولولہ انگیز نظارہ تھا۔ حیران کن ماحول تھا۔ چشم کائنات نے ایسا منظر پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ فرشتوں کو پہلی مرتبہ احساس ہوا ہوگا کہ ان کی عبادت میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ لاکھوں کے ہجوم میں کوئی ایرانین پرشین نہیں تھا۔ تورانی ترک نہیں تھا۔ ہیمیٹک بربر نہیں تھا۔ سیمیٹک عرب نہیں تھا۔ سب مسلمان تھے۔ ایک امت تھی جس کو نبی آخرالزماں نے وحدت کی لڑی میں پرو دیا تھا۔ ایک ہی کتاب کا ورد ہو رہا تھا' ایک ہی رب کو پکارا جا رہا تھا' ایک ہی حکم کی تعمیل ہو رہی تھی۔ وہ ایک لفظ جو چودہ سال پہلے دہن مبارک سے نکلا تھا اربوں کانوں میں رس گھول رہا تھا۔ حرز جاں بن گیا تھا۔

لبیک اللھم لبیک۔

بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے اس لفظ کے سحر میں گرفتار تھے۔ روح معانی سے سرشار تھے۔ وہ ایک لفظ جو گلے سے نہیں بلکہ دل کے ہر گوشے سے نکل رہا تھا۔ جو وجود کے ذرے ذرے سے پھوٹ رہا تھا۔ جو حاصل زندگی تھا۔ مرکز تمنا تھا' جس نے بتان رنگ وخوں کو پاش پاش کر دیا تھا۔ اس قدر عظیم اجتماع' اتنا خشوع وخضوع اتنا گہرا انہماک۔ انسانی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

سائنس نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ انسان ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ زندگی کی نت نئی تاویلیں پیش کی جا رہی ہیں۔ فلسفے نے تجسس و تحقیق کی آڑ میں تشکیک کے پہاڑ کھڑے کر دیئے ہیں لیکن عجز و عقیدت کے ان قافلوں کو کوئی چیز روک نہیں سکی۔ شک کے پہاڑ سمٹ کر رائی بن گئے ہیں۔ ستاروں پر پہنچ کر بھی جب انسان اپنے اردگرد نگاہ ڈالے تو ایک ہی لفظ اس کی زبان سے نکلے گا۔ سبحان تیری قدرت!

دوسرا شوط ختم ہوا تو امان اللہ کہنے لگا۔ ''شاہ صاحب حجرا اسود کو بوسہ دیا جائے اور کعبہ کی دیواروں کو مس کریں۔''

اس قدر ہجوم میں تو چلنا بھی دشوار ہے وہاں تک کیسے پہنچ پائیں گے۔ ''آپ اللہ اکبر کا نعرہ مار کر میرے پیچھے پیچھے چلیں' ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔ ہم نے ایک ساتھ زور سے اللہ اکبر کہا تو ایسے محسوس ہوا جیسے لاکھوں کا مجمع چھٹ رہا ہے اور خود بخود راستہ نکل رہا ہے۔ دیوار کعبہ کے ساتھ کئی جواں سال اور جواں ہمت حبشی لپٹے زار و قطار رو رہے تھے۔ آنسوؤں کی ایک جھڑی تھی جس نے دیوار کو نم آلود کر دیا تھا۔ ان کے عزم اور ڈیل ڈول کو دیکھ کر پستہ قدم شرطے بھی کچھ دب سے گئے تھے اور چھڑی کی بجائے زبان کا استعمال کرتے ہوئے شرک۔ شرک پکار رہے تھے لیکن اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہو رہا ہے۔ عشق نے کیا کبھی عقل کی بات سنی ہے؟ پھر عقل بھی ہو مدقوق ہو' محدود ہو' مفلوج ہو' مسدود ہو اور محروم دو عالم ہو۔

ہم بھی ان سیاہ فام لوگوں میں شامل ہو گئے جن کے رنگ کالے تھے لیکن من روشن تھا۔ جن کے پسینے سے اٹھتی ہوئی مہک تمام عرب خوشبوؤں پر حاوی تھی۔ جو شرعی امور سے شاید نا واقف تھے لیکن ان کی عقیدت' محبت اور وارفتگی حاصل شرع تھی ..... زندگی میں پہلی مرتبہ دیوار کعبہ کو مس کرنا کیسا لگتا ہے! سنگ اسود کو بوسہ دینے میں کیا لطف ہے! غلاف کعبہ کو سر آنکھوں پر لگانا کونسی کیفیت سے دوچار کرتا ہے۔ حیرتیں' حسرتیں' عقیدتیں' محبتیں اور لذتیں سب ایک نقطے پر یکجا ہو جاتی ہیں۔ وہ چند لمحے برسوں پر کیونکر حاوی ہو جاتے ہیں۔ ان لمحوں میں کوئی دعا یاد نہیں رہتی' کوئی فکر دامن گیر نہیں ہوتی' کوئی اندیشہ وجود کو کچوکے نہیں دیتا۔ بجز اشک ندامت انسان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔

اس ایک لمس نے سب تھکن دور کر دی تھی۔ مضمحل قویٰ کو توانائی بخش دی تھی۔ پژمردہ چہروں کو تازگی عطا کر دی تھی۔ نیند سے بوجھل آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائی تھی۔ سات شوط ہم نے یوں مکمل کئے جیسے پیدل نہ چلے ہوں پرواز کی ہو' خراماں خراماں سیر چمن کی ہو' بادنسیم کے ہلکورے لیے ہوں' بصد ناز ساحل مراد پر پہنچے ہوں جیسے لاکھوں کا مجمع نہ ہو بلکہ ہم اکیلے رب کعبہ کے حضور حاضری دے رہے ہوں۔ ''دو رکعت نفل' شاہ صاحب' دو رکعت!! اس پروردگار کا شکر ادا کریں جس نے ہمیں ہمت اور حوصلہ بخشا ہے۔ جو ذروں کو

آفتاب بناتا ہے۔ جو بے نواؤں کو نوا بخشتا ہے۔ جو گداؤں کو شاہ بناتا ہے!'' امان اللہ کی آواز حرم کی دیواروں سے ٹکرائی اور ہم سجدہ ریز ہو گئے..... شاید سجدہ شکر طویل ہو گیا تھا۔ شاید احسان مند سر اٹھنے کو تیار نہ تھا۔ شاید آنسوؤں کی جھڑی پوری طرح بند نہ ہوئی تھی۔ جب میں نے سر اٹھایا تو امان اللہ' وہاڑی کا بابا اور اس کی نیک بخت زوجہ غائب تھے۔ حجاج کرام گروہ در گروہ میرے سامنے سے گزر رہے تھے۔ سارا ماحول تلاوت قرآن کر رہا تھا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی کہیں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے' سن رہا ہے' سمجھ رہا ہے' گن رہا ہے اور تول رہا ہے۔

امان اللہ کی تلاش مشکل تھی۔ لاکھوں کے مجمعے میں اسے آواز بھی نہیں دی جا سکتی تھی۔ جہاں تک نظر جا سکتی تھی۔ میں نے گھما پھرا کر دیکھ لیا تھا وہ مسجد الحرام کے بلند و بانگ مرمری ستونوں سے ٹکرا کر لوٹ آتی تھی۔ لیکن مجھے کوئی فکر لاحق نہیں ہو رہی تھی' کوئی اندیشہ نہ تھا۔ میں مکمل طور پر سکون اور طمانیت کے حصار میں تھا۔ کیا ہوا جو امان اللہ غائب ہو گیا تھا میں رب کعبہ کی پناہ میں تھا۔

کافی دیر تک میں بیت اللہ کو دیکھتا رہا۔ وا فتگی' خود سپردگی اور عجز و عقیدت کے سمندر میں غرق رہا۔ میرے سامنے' دائیں بائیں' ایرانی' تورانی' قافلے گزر رہے تھے۔ عرب و عجم یک زبان ہو گئے تھے۔ دعائیں' التجائیں' منگیں' آرزوئیں مانگنے والے لاکھوں تھے۔ دینے والا ایک تھا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے در رحمت کھل گیا ہے۔ اس کالے کمرے میں عدالت لگ گئی ہے۔ ہر دعا قبول ہو رہی ہے' ہر گنہگار کے لیے عام معافی کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ سب اشک ندامت قبولیت کے ہار میں پروئے جا رہے ہیں۔ خالق اپنی مخلوق کو بڑے فخر اور محبت کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ فلسفہ تخلیق کی تعبیر نکل آئی تھی!

حاجیوں کا ایک زبردست ریلہ آیا اور میں پھسلتا ہوا برآمدے میں آ گیا۔ سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہر ستون کے ساتھ پلاسٹک کے بنے ہوئے واٹر کولر رکھے تھے جن میں آب زم زم بھرا تھا۔ آب زم زم کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ میں ایک طویل عرصے سے پیاسا ہوں اور میرے حلق میں کانٹے چبھ رہے ہیں۔ میں نے پاس رکھے ہوئے ڈسپوزیبل گلاسوں میں سے ایک گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ آب زم زم کے کئی گلاس حلق میں انڈیل دیئے۔ ٹھنڈے میٹھے پانی نے جہاں جسم کو سکون پہنچایا وہاں آنکھوں کو پرنم کر دیا۔ چشم تصور مجھے اس سنگلاخ اور بے آب و گیاہ علاقے میں لے گئی جہاں ایک ماں اپنے شیر خوار' بلکتے ہوئے بچے کی پیاس بجھانے کے لیے' پریشانی اور سراسیمگی کی حالت میں دو پہاڑوں کے درمیان دوڑ رہی ہے۔ آتش خیز سورج نصف النہار پر ہے۔ بادسموم چہروں کو جھلس رہی ہے۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔ چار سو گرم ریت کی حکمرانی ہے۔ آہوں اور آنسوؤں کے درمیان وہ بار بار آسمان کی طرف تکتی ہے۔ حرف دعا پوری طرح دہن سے نکل نہیں پاتے۔

''اے رب کائنات تو اسے معصوم کو بچالے۔ اس کے بدلے میری جان لے لے۔ تو نے اپنے بندوں کو کبھی مایوس نہیں کیا۔ ایک ماں کے آنسوؤں کو قبول فرما۔'' اللہ کے گھر کے نزدیک ایسی صورت حال؟ اس ماں کو کیا پتہ تھا کہ امتحان کی گھڑیاں کتنی کٹھن ہوتی ہیں کس قدر جاں لیوا ہوتی ہیں۔ مصلحت یزداں کیا چیز ہے۔ بوڑھا ابراہیم علیہ السلام کیوں اس لق ودق صحرا میں اپنی زوجہ اور جگر کے ٹکڑے کو چھوڑ گیا ہے۔ وہ بچہ کون تھا اور کن امتحانوں سے گزر کر بال آخر اس نے کیا بننا تھا۔ دعائیں قبول ہوئیں۔ دعاؤں نے قبول ہونا ہی تھا۔ جس جگہ وہ طفل شیر خوار ایڑیاں رگڑ رہا تھا' وہاں پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ زم۔ زم (رک جا) بے اختیار حاجرہ کے منہ سے یہ لفظ نکلے اور تاریخ کے سینے پر نقش ہو گئے۔ آج اسمٰعیل نہیں ہے۔ بی بی حاجرہ راہی ملک عدم ہو چکی ہیں۔ ہزار ہا برس گزر گئے لیکن ان معصوم ایڑیوں اور ان ابلتے ہوئے آنسوؤں کے صدقے لاکھوں' کروڑوں لوگ سیر یاب ہو رہے ہیں۔ سنت ابراہیمی زندہ ہے۔ اسمٰعیل کی قربانیاں رنگ لائی ہیں۔ جو تقدیس اس جرعہ آب کو ہے اس کا مقابلہ سات سمندر نہیں کر سکتے۔ جھیلیں اور آبشار نہیں کر سکتے۔ ہر سال کروڑوں حاجی اور عمرہ ادا کرنے والے مسلمان یہ پانی ڈبوں میں بھر کر اپنے وطن لے جاتے ہیں۔ ان کے عزیز و اقارب باوضو ہو کر' درود وسلام کے بعد قبلہ رو کھڑے ہو کر گلاس دائیں ہاتھ میں پکڑ کر اسے پیتے ہیں اس قدر تقدیس ہر جرعہ آب کو کہاں نصیب ہوتی ہے؟

میں تاسف اور تاریخ کے دھارے سے نکلا تو مجھے احساس ہوا کہ ابھی ایک رکن عمرہ باقی ہے۔ سعی صفا و مروہ..... وہی دو پہاڑیاں جو بی بی ہاجرہ کے قدموں کی چاپ سے لرزہ براندام ہوئی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ پہاڑیاں مسجد الحرام سے کچھ فاصلے پر ہونگی لیکن مجھے راستہ کا علم نہ تھا۔ راستہ پوچھنے کے لیے مجھے زیادہ دیر تگ ودو نہ کرنا پڑی۔ اچانک میرے قریب سے ایک نوجوان گزرا جس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ میں نے آواز دی تو وہ ٹھہر گیا۔ ''مجھے صفا و مروہ کی پہاڑیوں تک جانے والا راستہ معلوم نہیں۔ کیا آپ رہنمائی کر سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یقیناً'' وہ مسکرایا لیکن آپ صفا و مروہ کی دہلیز پر کھڑے ہیں وہ سامنے دیکھیں۔ گنبد و مینار اور وسیع و عریض برآمدہ! یہی صفا و مروہ ہیں۔ چلئے میں آپ کو وہاں تک چھوڑ آتا ہوں۔'' وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''کیا خشک اور کھردرے پہاڑ سمٹ اور سکڑ کر سنگ مرمر میں تبدیل ہو گئے ہیں۔'' میں حیران تھا۔

''اگر مٹی کا بنا ہوا حرم مرمر کی سلوں میں تبدیل ہو سکتا ہے تو پہاڑوں کی ہیبت کذائی کو بھی کم کیا جا سکتا ہے!'' وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولا ''لاکھوں حاجی چلتے چلتے اور دوڑتے دوڑتے ہلکان ہو جاتے تھے۔ ان کی سہولت اور آسائش کے لیے پہاڑیوں کو سنگ

مرمر کا غلاف پہنا دیا گیا ہے اور بادسموم کو ائیر کنڈیشننگ کے ذریعے بادلطیف میں تبدیل کر دیا گیا ہے!''

''تو پھر یہ امتحان تو نہ ہوا!''

''اس کا جواب تو حکومت ہی دے سکتی ہے۔ لیکن چودہ سو سال پہلے والا ماحول بھی واپس نہیں لایا جا سکتا۔'' وہ کہنے لگا۔

''تو کیا لوگ خوش ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس حد تک تو مطمئن ہیں۔ لیکن!'' اس نے گھبرا کر اپنے دائیں بائیں دیکھا۔

''دیکھیں مجھے بڑی مشکل سے ویزا ملا ہے۔ روزی کا مسئلہ ہے۔ وطن عزیز کے حالات تو آپ جانتے ہیں۔ یہاں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں!'' اس کی آواز میں ڈر، خوف اور لرزش تھی۔ وہ مجھے صفا و مروہ کے قریب چھوڑ کر واپس چلا گیا۔

صفا و مروہ مسجد الحرام کے اس قدر قریب ہونگے، میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ایک اعتبار سے یہ دونوں ایک بہت بڑی عمارت کے ہی دو حصے ہیں۔ دونوں پہاڑیاں مسجد الحرام کے شمالی دالان کے دونوں کونوں میں اٹھی ہوئی تھیں۔ صفا کے مقام پر اب کوئی پہاڑی نہیں ہے صرف نشان کے طور پر دس فٹ کے دائرے میں ابھرے ہوئے پتھر ہیں۔ یہاں سے سعی شروع ہوتی ہے۔ سات چکر۔ ساتواں چکر مروہ پر ختم ہوتا ہے۔

''اے اللہ میں صفا اور مروہ کے درمیان سات چکروں کی سعی کرتا ہوں، محض تیری بزرگ ذات کے لیے، پس میرے لیے اسے آسان کر دے اور قبول فرما'' عربی آیات کا میں نے اردو ترجمہ پڑھا اور کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر کے سعی شروع کر دی۔ سبحان اللہ۔ الحمدللہ۔ اللہ اکبر کا ورد کرتے ہوئے جب میں سبز ستونوں کے درمیان پہنچا تو رفتار خود بخود تیز ہو گئی۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں پہنچ کر اسمٰعیل نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے تو بی بی ہاجرہ شفقت مادری سے مجبور ہو کر دوڑ پڑتی تھیں۔ ماں بہر حال ماں ہوتی ہے چاہے پیغمبر ہی کی کیوں نہ ہو اور سب ماؤں کے جذبے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی اضطراری کیفیت اس قدر پسند آئی کہ مسلمانان عالم کے لیے فرض کر دیا گیا کہ وہ اس مقام سے دوڑ کر گزریں۔

سات چکر پورے کرنے کے بعد جب میں مروہ کے سے باہر نکلا تو عجیب منظر دیکھا۔ مروہ کے عقب میں حجاموں کی بے شمار دکانیں ہیں۔ حجام اکثر پنجابی ہیں۔ وہ دوکانوں سے باہر نکل کر حاجی۔ حاجی پکار رہے تھے۔ ایک پنجابی حجام لپک کر میری طرف بڑھا اور کہنے لگا ''حاجی صاحب، جلدی سے حلق کروالیں تا کہ احرام اتارنے میں آسانی ہو جائے۔''

میں نے کہا ''ابھی مناسک حج باقی ہیں تم فی الحال کسر کر دو!''

بولا ''غالباً یہ آپ کا پہلا حج ہے اور لگتا ہے کہ آپ شریعت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ حلق کروائیں صرف دس ریال لگیں گے۔''

''تم نائی ہو یا ناصح'' میں نے پہلی بار مضبوط لہجے میں بات کی۔ ''شریعت کے مسائل علمائے دین پر چھوڑو اور اپنے آپ کو صرف پیشے تک محدود رکھو!'' اسے غالباً اس جواب کی توقع نہ تھی۔ غصے میں پیر پٹختا ہوا دوکان کے اندر چلا گیا۔

جب میں حرم شریف سے باہر نکلا تو راستہ بھول گیا۔ باب فہد کے باہر جوتوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ہوائی چپلیں جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں۔ اپنی چپلوں کا ملنا تو محال تھا لیکن جی نہ چاہا کہ کسی اور کی چپل پہنی جائے چنانچہ میں بابپیادہ بے مقصد ایک سمت چل دیا۔ چلتے چلتے ایک خوبصورت بلند و بالا عمارت نظر آئی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ کوئی فائیو سٹار ہوٹل ہوگا لیکن جب نزدیک پہنچا تو وہ محل نکلا۔ شاہان وقت کا دولت کدہ' جس کی بلندی حرم شریف سے بڑھ کر تھی اور اندر سے ہی بیت اللہ کا نظارہ کیا جا سکتا تھا اور مسجد الحرام کے امام کے پیچھے نمازیں بھی وہیں سے ادا ہو سکتی تھیں۔ ہم خرما و ہم ثواب یعنی فرض کی ادائیگی بھی ہو گئی اور آرام و سکون بھی غارت نہ ہوئے۔ محل کی حدود سے نکل کر مجھے احساس ہوا کہ میں تھک گیا ہوں میں ساری رات کا جاگا ہوا تھا لیکن تھکن کی اصل وجہ گندم کے وہ دانے تھے جو مسلسل میرے پیروں کے تلوؤں کو کچوکے دے رہے تھے۔ لوگ حرم شریف کے صحن میں کبوتروں کے لیے دانے ڈال دیتے ہیں۔ کچھ تو پرندے چگ جاتے ہیں باقی ادھر ادھر بکھر جاتے ہیں۔ چلتے چلتے مجھے ایک چھوٹی سی عمارت نظر آئی جو غالباً میونسپل کمیٹی کی ورکشاپ تھی اس کے باہر ایک آدمی کھڑا تھا جو خوش قسمتی سے پاکستانی تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں راستہ بھول گیا ہوں اور ٹیکسی کے ذریعے واپس اپنی عمارت میں جانا چاہتا ہوں۔ وہ قدرے حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ میں حرم شریف سے اتنی دور مخالف سمت میں کیسے پہنچ گیا ہوں۔

''بے خیالی میں'' میں اسے اور کیا جواب دیتا۔

''ایک تو یہاں ٹیکسی ملنا مشکل ہے پھر ٹریفک پر پابندیوں کی وجہ سے وہ سارے شہر کا چکر کاٹ کر آپ کو منزل تک پہنچائے گا۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ پیدل جائیں' جلد پہنچ جائیں گے۔''

''دراصل یہ گندم کے دانے میرے پاؤں کی زنجیر بن گئے ہیں!'' میں نے اپنے ننگے پیروں کی طرف اشارہ کیا۔''

''اس دانے نے حضرت انسان کو ہمیشہ زچ کیا ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''کھاؤ تو نادانی اور نہ کھاؤ تو پھر بھی پریشانی۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں میں آپ کو چپلیں لا دیتا ہوں۔ ہم بھولے بھٹکے حاجیوں کے لیے ہمیشہ دو چار جوڑے ریزرو میں رکھتے ہیں۔'' وہ اندر گیا اور

پرانی ربڑ کی چپلوں کا ایک جوڑا نکال لایا۔ غالباً بالی اور چرچل کے جوتے پہن کر اتنی مسرت محسوس نہیں ہوتی جتنی خوشی اور سکون مجھے ان بوسیدہ اور گھسی ہوئی ہوائی چپلوں کو پہن کر ہوا۔ ہم ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ گنبد سے مغرب کی اذان سنائی دی۔ بولا۔ ''چلیں نماز پڑھ لیں۔ چائے پی کر میں آپ کو اصل راستے تک چھوڑ آؤں گا۔''

نماز پڑھ کر ہم کچھ دیر ملک کی باتیں کرتے رہے۔ باتیں کیا تھیں۔ سوالات کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ ملکی حالات' معیشت' فرقہ واریت' لاء اینڈ آرڈر۔ جمہوریت کب بحال ہوگی؟ حاکموں کے کیا ارادے ہیں؟ کیا نیا نظام انصاف کو عوام کو دہلیز تک لے آیا ہے۔ کیا ہر پاکستانی کو دو وقت کی روٹی میسر ہے؟ یہ نیا وزیر خزانہ کون ہے' کیا چاہتا ہے؟ کہاں سے آیا ہے اور بال آخر اسے کہاں جانا ہے؟'' میں اسے کیا بتاتا کہ ہم زندہ قوم ہیں۔ زندہ دل لوگ ہیں۔ یہ تو محض وزارت خزانہ کا انچارج ہے۔ ہم تو سنگاپور کے ہسپتال سے جاں بلب مریضوں کو اٹھالاتے ہیں اور انہیں اس ملک کا وزیر اعظم بنا دیتے ہیں۔

اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر میں ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے پاس آ گیا۔ بلڈنگ ۲۲۴ تک جانے کے لیے یہ ایک بہت بڑی نشانی تھی کیونکہ اس کو کراس کرتے ہی شاہراہ آ جاتی تھی جو سیدھی مطلوبہ عمارت تک پہنچتی تھی۔

جب میں کمرے میں پہنچا تو امان اللہ اور وہاڑی کا بابا پہنچ چکے تھے۔ مائی گھٹنوں کو ہاتھوں سے دباتی ہوئی کراہ رہی تھی۔ میں نے حیران کن نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''شاہ صاحب' مکمل عمرہ اس نے اپنے پاؤں پر چل کر کیا ہے۔ اس وقت نہ جانے کونسا کرنٹ تھا جس نے سارے درد کو کافور کر دیا تھا۔ ہم نے اس کو پالکی یا وہیل چیئر پر بٹھانے کی کوشش کی لیکن اس نے یکسر انکار کر دیا۔ امان اللہ کہنے لگا ''لیکن آپ کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''یہی سوال میں تم سے پوچھنے والا تھا۔ شاید سجدہ شکر طویل ہو گیا تھا۔ بحر حال مجھے خوشی ہے کہ تم نے ان کا خیال رکھا ہے۔''

بولا ''آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا کہیں تو نیچے سے کھانا لے آؤں۔ نہیں تو گیٹ سے نکلتے ہی سامنے لاہور ہوٹل ہے' بڑا مزیدار کھانا پکاتے ہیں' وہاں چلتے ہیں۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔ غالباً صبح کے ناشتے میں معلم نے کچھ روحانیت ملا دی تھی' بھوک کو نزدیک نہیں آنے دیتی۔''

''تو پھر؟''

''میرے خیال میں نماز عشاء کے بعد آرام کیا جائے۔ ہم سب کو آرام کی ضرورت ہے!''

''جیسے آپ کی مرضی! یہ کہہ کر وہ وضو کرنے غسل خانے میں چلا گیا۔

رات دو بجے میری آنکھ کھل گئی۔ ہر طرف مکمل سکوت تھا۔ امان اللہ اور بابا گہری نیند سو رہے تھے۔ مائی کی کراہ بھی بند ہو گئی تھی۔ فلیٹ کے دوسرے کمروں سے بھی کھٹ کھٹ کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کیا جائے۔ میں اپنی عادت سے بخوبی واقف تھا۔ ایک دفعہ بیداری کے بعد سونا محال تھا۔ میں سحر خیز ہوں پانچ بجے صبح جاگ جاتا ہوں۔ رات دو بجے کیسے بیدار ہو گیا؟ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر خود ہی مسکرا دیا۔ اس وقت پاکستان میں صبح کے پانچ بج رہے تھے میرا ذہنی کمپیوٹر نئے ماحول میں ہنوز ایڈجسٹ نہ ہوا تھا۔ باتھ روم میں جا کر میں نے ہاتھ دھوئے۔ وضو کیا اور سلیپر پہن کر نیچے لابی میں آ گیا۔ لابی بھی خالی تھی۔ کوئی شخص موجود نہ تھا صرف چائے کی کیتلی سے دودھیا بھاپ نکل رہی تھی۔ کیتلی کے ساتھ دودھ چینی چائے اور کافی کے ڈبے پڑے تھے۔ میں نے اپنے لیے کافی بنائی اور دو ریال خالی ڈبے میں ڈال دیئے۔ ویسے تو کافی خاصی سکون آور ہے لیکن اس سے اس کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ ہر گھونٹ سے جسم میں ٹھنڈک محسوس ہوتی۔ میں نے کافی کا آخری گھونٹ لے کر جب سامنے دیکھا تو وہاں امان اللہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ''اتنی جلدی اٹھ گئے؟ اس نے استفسار کیا۔''

یہ سوال تو تم سے بھی پوچھا جا سکتا ہے؟''

بولا ''تہجد گزار ہوں۔ نوافل پڑھنے ہیں، چلیں حرم شریف چلتے ہیں!''

''پہلے کافی کا ایک کپ لے لو۔ بڑی راحت جاں ہے!'' میں نے مشورہ دیا

''راحت جاں تو یاد الٰہی ہے۔ یہ گرم سیال بھلا کیا مدد کرے گا۔''

ہم چل کر باہر نکل آئے۔ فروری میں مکہ کا موسم بڑا خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے ہمارا استقبال کیا۔ بازار قریباً بند ہو چکا تھا۔ لوگ بھی اکا دکا نظر آ رہے تھے۔ اکثر دوکانیں بند تھیں لیکن فروٹ شاپس، ہوٹل، ریسٹورنٹ، جنرل سٹور اور فارمیسی کی دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ گاہک خال خال تھے۔ ٹرانسپورٹ بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

ہمیں حرم شریف تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ میں نے اس عظیم عمارت کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ صبح کو وارفتگی شوق نے اس کی اجازت نہ دی تھی۔ مسجد الحرام بلاشبہ دنیا کی سب سے بڑی اور خوبصورت مسجد ہے۔ تین منازل پر مشتمل اس کے مرمریں گنبد آسمان سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر گنبدوں کی اونچائی کو مدنظر رکھیں تو پھر یہ مکہ معظمہ کی سب سے اونچی عمارت ہے۔ قریب عمارات کو گرا کر بہت وسیع و عریض لان بنایا گیا ہے۔ اس میں خاص قسم کا پتھر لگایا گیا ہے جو گرمیوں میں گرم نہیں ہوتا۔ جو لوگ اندر نہیں جا سکتے۔ وہ باہر ہی بیٹھ کر عبادت کر لیتے ہیں۔ تین منازل کے علاوہ Basement ہے۔

قریباً تمام عمارات ائیر کنڈیشنڈ ہیں۔ صفائی اور روشنی کا بہترین انتظام کیا گیا ہے۔ اس کا ٹھیکہ بن لادن کمپنی کو دیا گیا ہے یہ وہی کمپنی ہے جس کا ایک سپوت امریکیوں کے لیے دردسر بنا ہوا ہے اور اس نے تمام دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اسامہ یقیناً ایک متنازعہ شخصیت ہے۔ حیرانی اس بات پر ہوتی ہے کہ ایک راز دان رقیب کیسے بن گیا۔ محرم مجرم کس طرح بنا؟'' ''فرزند اسلام'' ''دشمن انسانیت'' کیونکر قرار دیا گیا ہے؟ تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ٹیرو اور نیرو میں بال برابر کا فاصلہ ہوتا ہے۔ لوگ کیسے نظریات کی خاطر اپنے ذاتی سکون اور آرام و آسائش کو تج دیتے ہیں' قلزم خون میں کود جاتے ہیں۔ جوش' جنون اور جذبہ خشک وتر میں تمیز نہیں برت سکتے۔ مرض کے علاج کے لیے صرف نشتر کافی نہیں ہے اس کی تشخیص کے لیے تہہ تک پہنچنا بھی ضروری ہے۔ مسجد کے گیٹ میں ہر دروازے کا نام شاہان وقت کے نام پر رکھا گیا ہے۔ باب عبدالعزیز۔ باب فیصل۔ باب فہد وغیرہ۔ ہر دور میں مسجد کی تعمیر نو ہوتی رہی ہے۔ ترکوں نے پہل کی۔ سعودیوں نے بھی اس کار خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ تمام مسجد مرحلہ وار گرا کر نئی عمارت بنائی گئی ہے صرف اس حصے کو فی الحال برقرار رکھا گیا ہے جو عثمانیوں نے بنایا تھا۔ حکومت اس کو بھی گرانا چاہتی ہے لیکن ترکی کے دھمکی آمیز احتجاج کی وجہ سے رک گئی ہے۔

کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم نے شروع کی۔ ایک روایت کے مطابق پہلی تعمیر حضرت آدم نے کی۔ اس خیال کو اس بات سے تقویت ملتی ہے کہ بی بی حوا کو اسی علاقے میں اتارا گیا تھا اور ایک کڑے امتحان اور کٹھن سفر کے بعد آدم اور حوا کا ملاپ بھی اسی علاقے میں ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ حکم الٰہی ہو یا احساس تشکر جس نے اللہ کے گھر کی بنیاد رکھی ہو یا جنت گم گشتہ کی کسی عمارت کا عکس ہو لیکن تاریخی شواہد اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ خانہ کعبہ کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ اسلام نے رکھی۔ قرآن حکیم میں اس کا ذکر ہے۔ حضرت ابراہیم کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دنیا کے تین بڑے مذاہب اسلام' عیسائیت اور یہودیت انہیں اپنا جدامجد مانتے ہیں۔ قرآن شریف کے علاوہ توریت اور انجیل میں ان کا واضح ذکر موجود ہے ہر چند کہ تفصیلات میں اختلاف ہے۔ رسالت ماب کی آمد کے متعلق جو تصریحات اور تلمیحات توریت میں تھیں ان کو متعصب یہودیوں نے عمداً مٹا دیا اس طرح کلام اللہ میں خیانت کے مرتکب ہوئے۔ ان کی بدنیتی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ حضرت اسمٰعیل کی جگہ اپنے جدامجد حضرت اسحاق کو ذبیح مانتے ہیں۔ ان کے خیال میں حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل کبھی حجاز میں نہیں آئے تھے۔ لیکن یہ ان کا خبث باطنہ ہے۔ تمام تاریخی شواہد اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم نے پہلے حضرت ہاجرہ اور نوزائیدہ بچے اسمٰعیل کو اپنی زوجہ سارہ کے کہنے پر گھر سے باہر بھیج دیا اور پھر سارہ (شہزادی) کی وفات کے بعد خود بھی آ گئے۔ رسالت ماب کا تعلق حضرت اسمٰعیل کی اولاد سے ہے اور وہی

مسلمانوں کے روحانی باپ ہیں۔ اسمٰعیل ابراہیم کی خصوصی دعا سے پیدا ہوئے اس لیے ان کو بہت عزیز تھے۔ لفظ اسمٰعیل بذات خود دولفظوں سے مرکب ہے۔ سمع اور ایل۔ سمع کے معنی سننے کے ہیں اور ایل کے معنی خدا کے ہیں۔ یعنی رب العزت نے ابراہیم کی دعا سن لی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحٰق کی خوشخبری دی تو اس موقع پر بھی انہوں نے اپنے پیارے بیٹے اسمٰعیل کو یاد کیا۔ چونکہ قربانی کا حکم اپنے محبوب ترین بیٹے کے متعلق تھا اس لیے یہ حضرت اسمٰعیل ہی ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے جو جگہ منتخب کی گئی وہ منیٰ تھی۔ یہودیوں کے پاس کوئی نشانی موجود نہیں ہے۔ گو کہ ان کا دعویٰ ہے کہ ہیکل سلیمانی تھی' جبکہ عیسائی اس کو حضرت عیسیٰ کی قربان گاہ سمجھتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور کونسا تھا؟ کیا واقعی وہ ایک زندہ انسان تھے یا یومالائی شخصیت تھے۔ Folk lore نے مجسم شکل اختیار کر لی تھی؟ اب تک عراق اور شام میں جو آثار قدیمہ دریافت ہوتے ہیں اور جو Inscriptions ملی ہیں انکو پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا دور حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے چندہ ہزار سال پہلے کا تھا۔ تینوں الہامی کتابوں میں ان کا ذکر ہے۔ جس تفصیل کے ساتھ کتاب اللہ میں ان کی عظمت بیان کی گئی ہے اس کے بعد مزید کسی تحقیق کی گنجائش نہیں رہتی۔ ایک اندازے کے مطابق انہوں نے ۱۸۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس حیات مستعار میں انہیں کئی جانسوز مراحل سے گزرنا پڑا۔ جب انہوں نے کلدان میں کلمہ حق بلند کیا تو نارنمرود ان کے درپے ہوئی۔ مصر آئے تو فراعنہ مصر نے اپنی ناپاک نگاہیں حضرت سارہ پر ڈالنے کی کوشش کی۔ فلسطین پہنچے تو بے مہری عوام سے دلبرداشتہ ہوئے۔ جہاں بھی خدائے بزرگ وبرتر کا نام لیا' طنز وتشنیع کا شکار ہوئے۔ بال آخر جو اماں ملی تو کہاں ملی! بے آب وگیاہ صحرائے حجاز دامن نیاز کی طرح بچھ گیا۔ اعلان حق بلند کیا اور باپ بیٹے نے مل کر ایک چھوٹے سے گھروندے کی بنیاد رکھی۔ علامہ ارزقی نے تاریخ مکہ میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم نے جو تعمیر کی اس کا طول وعرض یہ تھا۔

بلندی ۹ گز۔

طول جو اسود سے رکن شامی تک۔ ۲۳ گز۔

عرض رکن شامی سے عرب تک۔ ۲۲ گز۔

جب کمرے کی تکمیل ہو چکی تو انہوں نے اپنے جگر گوشہ کو فرمایا ایک پتھر لا دو تا کہ میں اسے ایسی جگہ نصب کر سکوں جہاں سے لوگ طواف شروع کر سکیں۔

چنانچہ گھر بن چکا تو وحی نازل ہوئی۔

''ہمارا گھر طواف کرنے والوں' نماز میں قیام کرنے والوں' رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والے کے لیے پاک کر اور تمام لوگوں کو آواز دے کہ حج کو آئیں۔ پیدل بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی ہر دور دراز گوشہ سے آئیں گے۔''

خانہ خدا تو تعمیر ہو گیا لیکن نہ اس کی چھت تھی نہ چوکھٹ اور نہ کواڑ۔ جب قصی بن کلاب کا خانہ کعبہ کے انتظام وانصرام کا نچارج بنایا گیا تو اس نے پرانی عمارت گرا کر اس کی جگہ نئی عمارت کھڑی کی اور کھجور کے تختوں کی چھت ڈالی۔ خانہ خدا کی برکت واعجاز سے آہستہ آہستہ اس کے چار سو لوگ آباد ہونا شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے قبیلہ جریم آباد ہوا جس کے سردار مغاض بن عمرو جریمی تھے۔ حضرت اسمٰعیل نے ان کی بیٹی سے شادی کر لی۔ ان سے بارہ بچے پیدا ہوئے۔ حضرت اسمٰعیل کی وفات کے بعد کعبہ کی تولیت ان کے بڑے بیٹے نابت کے سپرد ہوئی۔ ان سے زندگی نے زیادہ دیر وفا نہ کی۔ بعد میں یہ فرض ان کے نانا مغاض کو سونپا گیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک قبیلے خزاعہ نے خانہ کعبہ پر قبضہ کر لیا۔ یہ تسلط کافی دیر قائم رہا۔ بال آخر حق بحقدار رسید ہوا اور قصی بن کلاب نے اپنا آبائی حق حاصل کر لیا۔

خانہ کعبہ پر سب سے پہلا پردہ شادہ یمن اس تبع نے چڑھایا۔ اس کے بعد یہ رسم بن گئی کہ اکثر شاہان وقت اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہتے۔ عبداللہ بن زبیر نے کعبہ کے ستونوں پر پہلی مرتبہ سونے کے پتر چڑھائے۔ عبدالملک بن مروان نے چھتیس ہزار اشرفیاں اس کی تزئین نو کے لیے بھجوائیں۔ امین عباسی کے سونے کا دروازہ بنوا دیا۔ ترکوں نے جدید طرز تعمیر سے اس کے حسن میں اضافہ کیا۔ اہل سعود بھی اس کار خیر میں کسی سے پیچھے نہ رہے اور انہوں نے اس کی تزئین' آرائش اور توسیع پر ایک کثیر رقم صرف کی۔

رسالت مآب کی بعثت کے وقت خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بت تھے' ہر چند کہ عرب خدا کی وحدانیت کے قائل تھے لیکن ان چھوٹے خداؤں کے ذریعے بڑے خدا تک پہنچنا چاہتے تھے۔

۵۷۰ میں ابی سینا کا حکمران خانہ کعبہ پر حملہ کرنے کی ناپاک جسارت کر بیٹھا۔ اس وقت مکہ پر عبدالمطلب کی حکمرانی تھی۔ جب انہیں بتایا گیا کہ ابی سینا کی فوج کعبہ کی طرف بڑھ رہی ہے لیکن آپ اطمینان سے بیٹھے ہیں تو انہوں نے کہا کہ جس کا گھر ہے وہی اس کی حفاظت بھی کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ طوفان باد وباراں اور متعدی بیماریوں نے ساری حملہ آور فوج کو نیست ونابود کر دیا اور ابرہہ کا غرور پیوند خاک ہو گیا۔ ۵۷۰ کو عرب روایات کے مطابق Year of the elephant کہا جاتا ہے۔ عربوں نے اس سے پہلے ہاتھیوں کو نہیں دیکھا تھا۔ ۶۹۱ میں خانہ کعبہ کی عمارت جزوی طور پر نقصان پہنچا جب عبدالملک کے گورنر حجاج بن یوسف نے محصور عبداللہ ابن زبیر کو شکست دینے کے لیے قریبی پہاڑیوں سے منجنیقوں کے ذریعے زبردست پتھراؤ کیا۔

◆◆◆

مکہ معظّمہ

اس شہر کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت تو بیت اللہ ہے۔ جس شہر یا جس جگہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کے لیے منتخب کیا وہ یقیناً قابل احترام ہے۔ اب رہا سوال اس کی قدامت کا تو اس میں متعصب عیسائی مورخین نے ڈنڈی مارنے کی کوشش کی ہے۔ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دور حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے چند ہزار سال پہلے کا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ یہ شہر بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہو گا۔ روم اگر ایک دن میں نہیں بنا تھا تو پھر مکہ کی توسیع بھی رفتہ رفتہ ہوئی۔ منطقی طور پر جب بھی کوئی معبد تعمیر ہوتا ہے تو اس کے اردگرد عبادت گزار بھی ضرور ہوتے ہیں۔ بیت اللہ کی حرمت کی وجہ سے پہلے لوگ مکانات نہیں بناتے تھے بلکہ اس کے قریب خیموں میں رہتے تھے۔

مکہ کا قدیم نام بکہ تھا۔ کتاب اللہ میں یہی نام آیا ہے۔

''پہلا متبرک گھر جو آدمیوں کے لیے بنایا گیا وہ مکہ میں تھا۔ زبور میں بھی وادی مکہ کا ذکر ہے۔ قدیم زمانے کے جغرافیہ دان بطلیموس نے باقاعدہ مکہ معظّمہ کے طول وعرض کا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک مکہ پردہ تاریخ پر نہیں ابھرتا۔ البتہ تیسری صدی عیسوی میں فہر جس کے لغوی معنی تاجر کے ہیں قریش قبیلہ کا سردار تھا۔ اس کا شجرہ نصب حضرت اسمٰعیل سے جا ملتا ہے۔ اسکے جد امجد معد بن عدنان اولاد اسمٰعیل میں سے تھے۔ پانچویں صدی عیسویں میں فہر کا جانشین کوسی (قصی) مکہ کا حاکم بن گیا اور آہستہ آہستہ سارا حجاز اس کے تسلط میں آ گیا۔ اس وقت تک مکہ میں کوئی پکی عمارت نہ تھی۔ قصی نے کعبہ کی ازنو تعمیر کی۔ اپنے لیے ایک محل بنوایا جس کا ایک حصہ دارالندوہ' عوامی مسائل سننے کے لیے مختص کر دیا گیا۔ اس نے اپنے قبیلے قریش کے عمایدین کو بھی ترغیب دی کہ وہ پتھر کے مکانات بنوائیں۔ اس نے نہ صرف چند قوانین وضع کئے بلکہ زائرین کے آرام خوراک اور سہولت کی خاطر پہلی مرتبہ ٹیکس بھی لگائے۔ قصی ۴۸۰ میں فوت ہو گیا تو اس کا بیٹا عبدالدہر اس کا جانشین مقرر ہوا۔ وہ زیادہ دیر زندہ نہ رہا۔ اس کی وفات کے بعد اس کے پوتوں اور بھائی عبد مناف کے بیٹوں کے درمیان حکمرانی کا تنازعہ پیدا ہو گیا۔ اس جھگڑے نے خوش قسمتی سے طول نہ پکڑا اور افہام وتفہیم کی فضا میں یہ طے پایا کہ پانی کی تقسیم اور ٹیکسوں کی وصولی عبدالمناف کے بیٹے عبدالشمس کریں گے جبکہ کعبہ کا انتظار و انصرام اور فوجی امور عبدالدہر کے پوتوں کو تفویض کئے گئے۔

عبدالشمس نے سارے اختیارات اپنے بھائی ہاشم کو تفویض کر دیئے۔ ہاشم کا شمار مکہ کے رؤسا اور معززین میں ہوتا تھا۔ ۵۱۰ میں مطلب کی وفات کے بعد اس کے بھتیجے شیبا Shyba نے فرائض سنبھالے۔ اس کی کنیت عبدالمطلب تھی۔

خاندانوں کی رقابتیں' جاہ وچشم کی خواہش انسانی جبلت کا حصہ ہے۔ عبدالشمس کے بیٹے امیہ کو خاندان بنو ہاشم ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ امیہ دراصل سارے حجاز کا بلاشرک غیرے حاکم بننا چاہتا تھا لیکن یہ خواہش بے سود پوری نہ ہو سکی اور عبدالمطلب ۵۹ سال مکہ کا حاکم رہا۔ اس نے اپنے کردار' دوراندیشی اور سخاوت کے ذریعے اہل قریش کے دل موہ لیے۔

اس کے دور میں ابرہہ نے خانہ کعبہ پر حملہ کیا جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ عبدالمطلب کی اولاد میں چار شخص بہت مشہور ہوئے۔ ابو طالب۔ عباس۔ حمزہ اور عبداللہ۔ حضرت ابوطالب حضرت علی کے والد تھے۔ عباس' خاندان عباسیہ کے مورث اعلیٰ تھے۔ حضرت حمزہ نے بطور ایک جنگجو سپہ سالار کے شہرت حاصل کی اور اسلام کی راہ میں شہادت پائی۔ حضرت عبداللہ رسالت مآب کے والد ماجد تھے۔ ان کے علاوہ ایک اور بیٹا ابولہب تھا جو اسلام کا ازلی دشمن تھا قرآن مجید میں اس کی تحقیر کی گئی ہے۔

مسجد الحرام کے بلند میناروں سے آواز اذان گونجی۔ اللہ بڑا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اگر شک نہ بھی ہو پھر بھی گواہی ضروری ہے۔ قرآن خوانی بند ہو گئی۔ طواف رک گیا۔ صفیں درست ہونے لگیں۔ صحن کعبہ' برآمدے' تہہ خانہ اوپر کی دو منازل' باہر کا وسیع وعریض صحن' چار سو پھیلی ہوئی سڑکیں نمازیوں سے بھر گئیں۔ ٹرانسپورٹ بھی بند ہو گئی۔ دوکانوں اور ریستورانوں نے اپنے شٹر گرا دیئے۔ نماز کے اوقات میں بزنس کی ممانعت ہے۔ پچیس لاکھ کا عظیم مجمع دن میں پانچ وقت مسجد الحرام کی طرف مارچ کرتا ہے۔ نماز پنج گانہ اسی مسجد میں ادا کرتا ہے۔ ایسا منظر چشم فلک نے کب دیکھا ہوگا۔ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ کاشی کے میلے ہوں یا یورپ کے کلیساؤں کے اجتماع' اس کے آگے ہاتھ جوڑتے نظر آتے ہیں۔ اس قدر خشوع وخضوع' اس قدر انہماک' اتنی خودسپردگی' حاضری کا یہ قرینہ اور آداب بے مثل ہیں۔ بادصبا کی' صحن حرم اور امام عبدالرحمن کی قرات۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے آیات نہیں پڑھی جا رہیں لحن داؤدی کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ وطن عزیز میں کئی لوگوں کو اپنی قرآن خوانی کا زعم ہے اگر یہ امام عبدالرحمن کی قرات سن لیں تو سکتے میں آ جائیں۔ ہر لفظ کانوں میں رس گھولتا ہوا۔ ہر حرف دل کے نہاں خانوں میں اترتا ہوا۔ الفاظ کا زیر وبم' نشست وبرخاست و سوز وساز' طرز ادائیگی اور خوش الحانی ایک وجد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ جی چاہتا ہے یہ سلسلہ ختم نہ ہو نماز طویل ہو جائے۔ دو رکعت سو رکعت میں بدل جائیں۔ جو لہجہ اہل زبان کا ہوتا ہے وہ دوسری قوموں کے لوگ اختیار نہیں کر سکتے۔ عربوں کو تو ویسے اپنی زبان کا پر ناز ہے۔ دوسروں کو عجمی (گونگا) سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں تقسیم سے قبل لکھنو کے ایک عالم دین کو اپنی قران خوانی کا بڑا زعم تھا۔ وہ کربلائے

معلیٰ گئے اور علی الصبح دریائے فرات کے کنارے تلاوت شروع کی۔ قریب ہی ایک عرب عورت کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کا چھوٹا بچہ بار بار اپنی شرارتوں سے اس کے کام میں رکاوٹ ڈال رہا تھا۔ جب طفلک باز نہ آیا تو وہ اسے ڈانٹتے ہوئے بولی۔ ''شرارتیں بند کردو نہیں تو میں تمہاری ایسے ہڈیاں توڑوں گی جس طرح یہ شخص قرآن کے ساتھ سلوک کر رہا ہے۔'' عالم دین نے بڑی سبکی محسوس کی لیکن اس کے ساتھ انہیں اپنی کم مائیگی کا بھی ادراک ہوا اور ہندوستان واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ پانچ سال عراق میں رہے اور عربی زبان کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کی۔ قرآن حکیم کا یہی اعجاز ہے کہ اگر الفاظ کے معانی سمجھ میں نہ آئیں تو اس کے صوتی اثرات ایک خوشگوار تاثر چھوڑتے ہیں اور وجود کے تار جھنجھوڑتے ہیں۔ کتاب کی عبادت میں کوئی جھول نہیں ہے۔ Constructional error نہیں ہے۔ فصاحت و بلاغت کا نادر نمونہ ہے۔ یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جو لفظ بلفظ حفظ ہو جاتی ہے۔ دیگر کسی کتاب کے حوالے سے ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہو سکتا ہے!

میں جب مسجد سے باہر نکلا تو سورج نکل آیا تھا۔ مجمع بھی کافی حد تک چھٹ گیا تھا۔ امان اللہ کی تلاش بے سود تھی۔ اس کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا تھا جنکی نالہ نیم شب اور آہ صبگاہی کے باوجود تسکین نہیں ہوتی۔ دوکانیں آہستہ آہستہ کھلنے لگی تھیں۔ موٹروں کی بھوں بھوں بھی سنائی دینے لگی تھی۔ بلڈنگ ۲۲۴ کے قریب ہی ایک فارمیسی تھی۔ میں نے ٹوتھ پیسٹ اور شیمپو خریدا اور بلڈنگ میں واپس چلا آیا۔ لابی میں کافی رش تھا غالباً حاجیوں کا نیا گروپ آیا تھا۔ تھکے ہوئے لوگوں نے چائے کی کیتلی پر یلغار کر رکھی تھی۔ ٹھیکیدار کا ملازم خوشی سے دودھ کے ڈبے کھول رہا تھا۔ رش کی وجہ سے میں نے چائے پینے کا ارادہ ترک کر دیا اور لفٹ کے ذریعے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہاڑی کا بابا اور مائی ہنوز سو رہے تھے۔ ہو سکتا ہے نماز فجر کے بعد سو گئے ہوں۔ میں نے انہیں جگانا مناسب نہ سمجھا اور غسل خانے میں جا کر دانت صاف کئے اور غسل کیا۔ غسل سے جسم میں تازگی کا احساس ہوا۔ منہ کا بھاری پن بھی ٹوتھ پیسٹ نے ختم کر دیا۔ حاجیوں کی اکثریت حج کے دوران ٹوتھ پیسٹ کا استعمال نہیں کرتی۔ مسواک سے کام چلاتے ہیں کہ سنت ہے۔ غسل کے بعد میں تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گیا۔ نیم خوابیدگی کی کیفیت دو گھنٹے تک طاری رہی اور جب میری آنکھ کھلی تو دن کے دس بج رہے تھے۔ نیچے لابی میں رش چھٹ گیا تھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا کلرک اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے اس سے فون کرنے کی اجازت مانگی۔ وہ زبان سے تو کچھ نہ بولا لیکن میری طرف بڑھا دیا۔

جب میں نے ہیلو کیا تو دوسری طرف سے مولانا مکی بول رہے تھے۔ ''کب پہنچے؟'' مولانا صاحب نے استفسار کیا۔

کل صبح! میں نے بتایا:

''تو کل ہی فون کر لینا تھا۔'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولے۔ ''مجھے فکر لاحق ہو رہی تھی کہ کہیں فون نمبر تو نہیں بھول گئے۔ کہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔ میں اپنا ڈرائیور بھیجتا ہوں۔ آپ سامان لے کر نیچے لابی میں آ جائیں۔'' مالانا صاحب نے ایک ہی سانس میں بہت سے سوالات کر ڈالے۔

میں امان اللہ سے ملے بغیر نہیں جانا چاہتا تھا لیکن مولانا صاحب نے اس کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے جدا ہونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک مختصر ملاقات سے طویل رفاقت کا گمان ہوتا تھا۔ اس قدر اپنائیت اور خلوص جیسے جنم جنم سے آشنا ہوں۔ البتہ ایک بات سے تھوڑی سی تسکین ہو رہی تھی کہ میرے جانے سے اس چشم حسود کی طرح تنگ کمرے میں انہیں سامان رکھنے کے لیے کچھ جگہ مل جائے گی۔

جب میں سامان اٹھا کر نیچے لابی میں آیا تو ایک نوجوان شخص جس نے نیلے رنگ کی قمیض اور سفید شلوار پہن رکھی تھی میری طرف بڑھا۔ غالباً آپ ہی شوکت صاحب ہیں!''

''میں رفیق ہوں'' مولانا صاحب کا ڈرائیور۔ میں گاڑی کو پارکنگ سے گیٹ پر لے آتا ہوں آپ سامان لے کر باہر آ جائیں۔''

بلڈنگ سے مولانا صاحب کی رہائش گاہ کچھ زیادہ دور نہیں تھی بالفرض ہوتی بھی تو رفیق کی دلچسپ باتوں نے اس کا احساس نہ ہونے دیا۔ آخری موڑ کاٹ کر جب گاڑی نے رینگنا شروع کیا تو رفیق بولا! ''وہ سامنے دیکھیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر مولونا صاحب کی رہائش گاہ ہے۔''

وہ تو پانچ منزلہ عمارت ہے۔'' مجھے قدرے حیرانی ہو رہی تھی۔

''یہ مولانا صاحب کی ملکیت نہیں۔ کرایہ پر لی ہوئی ہے۔ درویش منش انسان ہیں چالیس سال سے گھر نہیں بنایا۔ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ ہر سال کوئی نہ کوئی بلڈنگ کرایہ پر لے لیتے ہیں۔ دوست احباب کی خاطر مدارت بھی ہو جاتی ہے اور Sub-let کرنے سے کرایہ بھی نکل آتا ہے۔'' اب میں اسے کیسے بتاتا کہ مولانا صاحب بھی پہاڑ پر بنی ہوئی عمارت کی طرح کئی مدراج طے کر چکے ہیں۔ دین اور دنیا میں سے کسی ایک کا انتخاب مشکل عمل ہوتا ہے لیکن اصل بات ان میں توازن قائم کرنا ہے جو مشکل تر ہوتا ہے۔ دین کی طرف پوری طرح مائل ہونے کے باوصف مولانا صاحب نے ہمیشہ توازن قائم رکھا۔

بلڈنگ کے گیٹ پر مولانا صاحب کے ملازم جندوڈہ سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگا ''چلئے مولانا صاحب کافی دیر سے آپ کا

انتظار کر رہے ہیں حالانکہ یہ ان کے سونے کا وقت ہے۔ وہ فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کر کے سو جاتے ہیں اور پھر ظہر کے وقت بیدار ہوتے ہیں۔'' بلڈنگ کے باہر بے شمار نائیجیرین حاجی پھر رہے تھے۔ ایک سی شکلیں ایک رنگ' ایک سا لباس' سبز اور سرخ قمیض جو ٹخنوں تک لمبی تھیں۔ یہ کرایہ دار تھے۔ بلڈنگ کے عین سامنے لیکن کافی نیچے ہوٹل حیات ریجنسی تھا۔ فائیو سٹار ہوٹلز کی فیملی کا یہ سرخیل ہے۔ جس طرح انگریز دیسی ناموں کے کان مروڑ دیتے ہیں اسی طرح ہم نے بھی انگریزی کی ٹانگ کھینچ لی تھی اور Hyat کو حیات نو بخش دی تھی۔

چوتھے فلور پر لفٹ رک گئی۔ جندوڈہ نے لپک کر اس کا دروازہ کھولا تو ہم ایک کاریڈور کو کراس کرتے ہوئے مولانا صاحب کے کمرے میں پہنچ گئے۔ وہ غالباً کسی کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ آہٹ سن کر انہوں نے سر اوپر اٹھایا اور پھر ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ مجھے گلے لگا لیا۔ فرمانے لگے۔'' آپ نے ساری دنیا کا سفر کیا ہے' مختلف قوموں اور ممالک کا تقابلی جائزہ لیا ہے۔ آپ کے سفرنامے ہر جگہ بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ کہئے یہ سفر کیسا لگا ہے؟''

''بڑا انوکھا سفر ہے'' میں نے کہا!'' ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ایک طویل عرصے تک صحراؤں میں بھٹکنے کے بعد کسی مرغزار میں آ نکلا ہوں۔ دراصل یہ سفر در سفر ہے۔''

بولے'' بیت اللہ پر جب پہلی دفعہ نظر پڑی تو کیا محسوس کیا؟''

'' وہ نگاہ لوٹ کر نہیں آئی۔ میں ایک طویل عرصے تک سوچتا رہا۔ ایک لامکان کو مکان بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ پھر انتخاب بھی کیا تو ایسی جگہ کا جہاں بھوک اور پیاس' سوختہ پہاڑ اور تپتی ہوئی ریت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ کیا مالک کائنات ایک صحرا کو مرغزار میں نہیں بدل سکتا تھا؟ اس تنگ و تاریک کمرے کی بجائے ایک وسیع و عریض محل کھڑا کر دیتا۔ دودھ اور شہد کی نہریں بہائی جا سکتی تھیں تا کہ مخلوق اس حیات مستعار میں ہی جنت کی ایک جھلک دیکھ لیتی!''

''تو پھر؟'' مولانا صاحب کا اشتیاق بڑھنے لگا۔

''پھر یہاں آ کر ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ اسرار نہانی کھلتے گئے۔ اس سے بہتر جگہ کا انتخاب نہ ہو سکتا تھا اس سے زیادہ جاذب نظر گھر بھی نہیں بن سکتا تھا۔ یہ جو شاہان وقت نے چار سو محلات بنائے ہیں' سنتریوں کی طرح دست بستہ کھڑے ہیں۔ کوئی نگاہ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھتا۔ بھلا دربانوں کو کون دیکھتا ہے۔ لاکھوں نگاہیں صرف ایک نقطے پر مرکوز ہوتی ہیں۔ ایک سادا سا کمرہ جو کروڑوں قلوب کو منور کرتا ہے۔ سفلی جذبات سے نجات دلاتا ہے۔ آدمی کو ذات کے حصار سے باہر نکالتا ہے اور امت مسلمہ کو یکجا'

یک زبان اور یک لباس کرتا ہے۔ یہ محض گھر نہیں ہے' امت مسلمہ کا تشخص ہے اس کی امنگوں' آرزوؤں' ارادوں اور امیدوں کا محور و مرکز ہے۔ دنیا کی کسی عمارت کو اس سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ گھر ایک کمرے پر مشتمل ہے مالک مکان وحدہ لاشریک ہے لیکن مہمان کروڑوں ہیں۔ در رحمت کھلا ہوا ہے۔ بخششوں کی سبیل جاری ہے۔ میزبان کے پاس ایک طویل فہرست ہے۔ ہر مہمان کو خود بلاتا ہے خود انتخاب کرتا ہے۔ اس کی خواہشات کا خیال رکھتا ہے ان کی دعائیں سنتا ہے اور انہیں شرف قبولیت بخشتا ہے۔"

"لگتا ہے ایک دن کا سفر آپ کی ساری زندگی پر حاوی ہو گیا ہے!" مولانا صاحب مسکرائے۔

"آپ خوش قسمت ہیں کہ چالیس برس یہاں گزار دیئے۔ چالیس حج کر ڈالے۔ درس دیتے ہوئے ہر روز آپ کی آواز حرم شریف کا طواف کرتی ہے۔ آپ سے مل کر میں نے ہمیشہ روحانی مسرت محسوس کی ہے۔ آپ کی فکر انگیز باتوں سے استفادہ کیا ہے لیکن آج ایک انوکھی خوشی محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"آپ کی یہ مسرت دوچند ہو جائے گی جب پرانے احباب سے ملو گے۔ سب دوسرے کمرے میں انتظار کر رہے ہیں۔" مولانا صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ چوتھا فلور بارہ کمروں پر مشتمل تھا۔ سب سے پہلے تو انہوں نے مجھے میرا کمرہ دکھایا۔ یہ مولانا صاحب کے کمرے سے ملحق تھا۔ بہت بڑا کمرہ تھا اور اس کو بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا۔ فرش پر ایرانی قالین بچھے ہوئے تھے۔ دو فوم کے بستر شمالاً جنوباً لگائے گئے تھے۔ ایئر کنڈیشنڈ غالباً کافی دیر سے چل رہا تھا اس لیے اندر داخل ہوتے ہی خنکی کا احساس ہوا۔ جنوبی کھڑکی حیات ریجنسی کی طرف کھلتی تھی۔ اس کے پس منظر میں اونچی پہاڑیاں تھیں جن پر حد نگاہ تک مکانات بنے ہوئے تھے۔ "یہ آپ کا کمرہ ہے۔ صرف آپ کا! مولانا صاحب مسکرائے" مجھے علم ہے کہ آپ اکیلے رہنے کے عادی ہیں اس لیے اطلاع ملتے ہی میں نے یہ کمرہ مختص کر دیا تھا۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں گذشتہ رات اس سے ایک تہائی کمرے میں ہم چار آدمیوں نے گزاری ہے۔"

بولے "اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ جب شہر میں بیک وقت پچیس لاکھ لوگ آ جائیں اور پھر ہر شخص کی یہ خواہش ہو کہ اسے حرم شریف کے قریب مکان دیا جائے وہاں رہائش کے مسائل تو ضرور پیدا ہونگے۔ ہمارے آنے سے پہلے ہی رفیق نے میرا سامان ایک کونے میں رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد مولانا صاحب مجھے اپنی لائبریری دکھانے لے گئے۔ Racks ریکس پر سینکڑوں کتابیں ترتیب سے لگائی گئی تھیں۔ بیشتر عربی زبان میں تھیں۔ حدیث۔ فقہ' فلسفہ' عرب تاریخ' قرآن شریف کی تفسیریں' مولانا صاحب کے خطاب پر مبنی کیسٹیں۔ اس کے ساتھ چند کتابیں اردو شاعری کی بھی تھیں۔ "کیا یہ شرع میں شرارت تو پیدا نہیں کرتیں" میں نے

ایک کتاب اٹھا کر دیکھی۔

''شرارت کتاب میں نہیں تمہارے لہجے میں ہے۔'' مولانا صاحب ایک بار پھر مسکرا دیئے۔ ''اسلام راہبوں کا مذہب نہیں ہے۔ ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ دین اور دنیا میں ایک توازن قائم کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ جب میں پڑھتے پڑھتے بہت تھک جاتا ہوں تو دیوان غالب اٹھا کر چند شعر پڑھ لیتا ہوں۔ ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔ اعصاب کو بڑا سکون ملتا ہے۔

''اس رند خرابات کو یہاں داخلہ کیسے مل گیا؟''

مولانا صاحب میرا طنز بھانپتے ہوئے بولے۔ ''وہ صرف رند ہی نہیں تھا ایک اعتبار سے ولی بھی تھا۔ جو مسائل تصوف اس نے بیان کئے ہیں اور جس خوبصورت پیرائے میں اس کا اظہار کیا ہے یہ ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہیں۔ بلاشبہ وہ عظیم شاعر تھا اپنی بشری کمزوریوں کے باوجود عظیم انسان تھا۔''

''کیا آپ نے ان سب کتابوں کا مطالعہ کیا ہے؟

بولے ''کئی بار! ان چالیس برسوں میں اور کیا ہی کیا ہے؟ نماز پنجگانہ، درس حرم اور پھر مطالعہ کتب!''

''لیکن آپ نے تو اپنے آبائی شہر ٹھل حمزہ میں فری میڈیکل ڈسپنسری کھول رکھی ہے۔ بچوں کی مفت تعلیم کے لیے ایک سکول بنایا ہے۔''

کہنے لگے ''حقوق اللہ کی طرح حقوق العباد بھی اتنے ہی اہم ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔ اب بھی مزید کچھ کرنے کی خواہش ہے۔''

لائبریری سے نکل کر جب ہم قریبی کمرے میں گئے تو میں حیران رہ گیا۔ پرانے احباب سے بیک وقت ملاقات! خان پور سے مولانا درخواستی کے فرزندان رشید مولانا مطیع الرحمن درخواستی اور مولانا فضل الرحمن آئے تھے۔ بھونگ (رحیم یار خان) کے رئیس وزیر موجود تھے۔ ملتان سے میجر جاوید تشریف لائے تھے۔ وہاڑی کے مدرسہ خلد بن ولید کے مہتمم مولانا ظفر احمد بھی ان خوش نصیبوں میں شامل تھے۔ ملتان سے مدرسہ خیر المدارس کے مالک و مختار قاری حنیف جالندھری بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ چند ایسے علمائے دین بھی تھے جن سے میں پہلے متعارف نہ تھا۔ امریکہ سے قاری وحید، ساؤتھ افریقہ کے احمد لسبات اور ہانگ کانگ سے قاری طیب سعادت حج حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ ''آپ سب لوگ ایک چھت تلے؟ یقین نہیں آ رہا۔'' میں نے ان سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔

''میجر جاوید کہنے لگے۔''ہم تو ہر سال اس چھت تلے جمع ہوتے ہیں البتہ آپ کو دیکھ کر قدرے حیرانی ہو رہی ہے۔''

''تو گویا یہ آپ لوگوں کا پہلا حج نہیں ہے''میں واقعی حیران تھا۔

مولانا مطیع الرحمن کہنے لگے۔''شاہ صاحب ہم میں سے ایسا کوئی بھی نہیں ہے جس نے پندرہ بیس حج نہ کئے ہوں۔''

''بیس حج!''میں نے گھبرا کر ماتھا پونچھا۔مصنف جائیتھن سوفٹ کا گلیور ایک دفعہ بونوں کے دیس میں جا نکلا تھا' مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے ایک بونا قد آور شخصیتوں کے درمیان گھر گیا ہے۔ایک روحانی لنکا جہاں ہر کوئی باون گز کا تھا۔مولانا مطیع الرحمن درخواستی سے میری پہلی ملاقات خان پور میں ہوئی۔۱۹۸۶ میں میں وہاں ڈپٹی کمشنر تھا۔محرم تو امن سے گذر گیا لیکن چہلم کے موقعہ پر چند ناخوشگوار واقعات رونما ہوئے۔علی الصبح اے۔سی طارق باجوہ نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ رات کو کسی شخص نے مقامی مسجد کی بے حرمتی کی ہے اور صحن مسجد میں قرآن شریف کے اوراق بکھرے پڑے ہیں۔لوگوں میں بڑا اشتعال ہے اور ہزاروں کا مجمع مارچ کرتا ہوا شہر کے بازاروں اور محلوں سے گزرے گا اور اس طرح لامحالہ چہلم کے جلوس سے ٹکرائے گا۔یہ ایک طرح سے بے بسی کا اظہار تھا۔میں ایس۔پی کو لے کر فوراً موقع پر پہنچا۔اس وقت تک نعرے مارتا ہوا جلوس بازار میں داخل ہو چکا تھا۔''ان کو یہیں روکا جائے۔''میں نے ایس پی کو کہا۔

لیکن کیسے؟SSP انعام الرحمن سحری حیران ہوتے ہوئے بولا''ہماری موجودگی ان کے لیے Red Rag ثابت ہوگی۔عام حالات میں یہ بات درست تھی۔لیکن یہ سوچنے کا موقعہ نہیں تھا۔میں بلاخوف ہجوم میں شامل ہو گیا۔پہلے ان کے ساتھ تھوڑا سا مارچ کیا پھر چند نعرے لگائے اسی طرح ذہنی طور پر انہیں تیار کیا کہ میں ان میں سے ہی ہوں۔جب ہم چوک پر پہنچے تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو روک دیا۔سب سے پہلے میں نے ان لیڈروں کو دعوت دی کہ دوکان کے تھڑے پر کھڑے ہو کر اظہار خیال کریں۔چند تقریریں ہوئیں۔جذباتی' سلگتی ہوئی' پر اشتعال۔آخر میں میری باری آئی۔

میں نے کہا۔عزیزان نیک نام' آج ہر آنکھ اشکبار ہے۔ہر دل رو رہا ہے اور عوام کا غم وغصہ ایک طوفان کی شکل اختیار کر گیا ہے۔جی چاہتا ہے کہ جو کمبخت تکفیر کا مرتکب ہوا ہے اسے ابھی اسی وقت اس چوک میں پھانسی دے دی جائے۔

''ہاں ابھی اسی وقت!''تمام مجمع بیک آواز پکار اٹھا۔میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔''صرف پھانسی نہ دی جائے بلکہ اس کی لاش کو کوڑے بھی مارے جائیں۔''

''ہاں' ہاں کوڑے مارے جائیں!''ایک مرتبہ پھر شور بلند ہوا۔''لیکن وہ بدبخت ہے کہاں؟میں نے بہ آواز بلند پوچھا۔لوگوں

نے بے خیال میں ادھر ادھر دیکھا۔ ''کیا آپ اسے تلاش کر سکتے ہیں؟'' یکدم مکمل سکوت چھا گیا۔ ''نہیں! میں نے کہا کیونکہ یہ آپ کا نہیں بلکہ انتظامیہ کا کام ہے۔ ہم اس مردود کو تلاش کریں گے۔ ہم اسے دھرتی کی کوکھ سے نکال کر لائیں گے۔ آپ ہمیں صرف ایک دن کی مہلت دیں۔''

''ایک دن کی مہلت!'' بس ایک دن کی مہلت! ہر شخص زیر لب بول رہا تھا۔ ''ٹھیک ہے۔ ٹھیک۔'' سارا مجمع بول اٹھا اور اس طرح اس نفسیاتی فضا میں وہ مسئلہ انتظامی طریقے سے حل ہو گیا۔

ہم اٹھ کر تھانے میں آئے تو مولانا مطیع الرحمن اور دیگر علما میرا انتظار کر رہے تھے۔ یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ دوران گفتگو میں نے محسوس کیا کہ ان کا رویہ اور انداز گفتگو دیگر علماء سے ہٹ کر ہے۔ لہجہ میں ٹھہراؤ اور شائستگی تھی۔ سوچ سمجھ کر بات کرتے اور جواب بھی اسی انداز میں دیتے۔ دوران بحث علما سے کہنے لگے۔ انتظامیہ اور پولیس کو مطعون کرنے سے پہلے ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ وہ شخص مسجد میں گھسا کیسے؟ ظاہر ہے ہندوستان سے تو نہیں آیا ہوگا۔ ہمارا ہی کوئی بھائی بند ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ احتجاج کے ساتھ ساتھ ہم اپنی صفوں کی بھی تلاشی لیں۔'' یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ ان دنوں رحیم یار خان ضلع کے علما اپنے مزاج اور رویہ کی وجہ سے سارے صوبے میں مشہور تھے۔ انتظامیہ ان سے خوف کھاتی تھی' جس تھانے میں سفارش کرنے چلے جاتے تمام عملے پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ ایک دفعہ میرے پیش رو اور SP نے ایک قادیانی وکیل کی دعوت قبول کر لی۔ سارے ضلع میں بھونچال آ گیا۔ ہر روز جلسے جلوس' احتجاج اور نعرہ بازی شروع ہو گئی۔ بال آخر انہیں مسجد میں جا کر معافی مانگنی پڑی۔ شروع شروع میں میرے ساتھ بھی انہوں نے پنجہ آزمائی کی کوشش کی لیکن جلد ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ شکایات کا پلندہ لے کر ایک وفد کی صورت میں میرے پاس آئے۔ وفد میں ایک چہرہ نامانوس تھا۔ پینتالیس برس کے پیٹے میں' کھلتا ہوا گندمی رنگ۔ مناسب لمبائی لیے ہوئے تراشیدہ داڑھی۔ عقابی نظریں جو بلوچوں کا خاصا ہیں۔ درمیانہ قد' دبلے پتلے یہ مولانا مکی تھے جو اتفاق سے ان دنوں رحیم یار خان آئے ہوئے تھے۔ مولانا صاحب نے ان کی باتیں سنیں پھر جب میں نے انہیں اصل بات بتائی تو فرمانے لگے۔'' شاہ صاحب درست کہتے ہیں۔ آپ اپنا رویہ بدلیں۔ مولانا مطیع الرحمن نے بھی ان کی تائید کی۔ اس ایک جملے نے کئی انتظامی مسائل حل کر دیئے اور میرے بقیہ چار سال بہت سکون سے گزرے۔ باہمی تکریم اور افہام و تفہیم کی فضا میں ہر مسئلہ حل ہوا۔ یہ مولانا مکی صاحب سے پہلی ملاقات تھی۔ علما سے تعلقات خوشگوار تو ہونے ہی تھے مولانا صاحب سے دوستی کا سلسلہ بھی اس دن سے شروع ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی بنیادیں گہری ہوتی گئیں۔ جب بھی کوئی دوست مکہ معظمہ سے پاکستان آتا مولانا صاحب خوشبو کا تحفہ ضرور بھجواتے۔ اسی

طرح وہ جب بھی پاکستان تشریف لاتے تو مجھے ملے بغیر واپس نہ جاتے۔ ملتان ملنے آئے۔ میری دعوت پر گوجرانوالہ میں ایک بہت بڑے وفد کے ساتھ تشریف لائے۔ مولانا عبدالقادر آزاد' مولانا حنیف جالندھری' مولانا سلطان محمود ضیا' خورشید عباس گردیزی' اشتیاق حسین جعفری وزیر غازی' اور دیگر احباب قاری حماد اللہ شفیق۔ مفتی عبدالقوی ان کے ہمرہ تھے۔ میں ان دنوں گوجرانوالہ میں ڈپٹی کمشنر تھا۔ ساری انتظامیہ اور مقامی علمائے کرام کو بھی مدعو کیا گیا۔ مولانا صاحب کی تقریر سن کر ڈی آئی جی اظہر حسن ندیم کہنے لگے۔ ''شاہ صاحب بڑے عرصے کے بعد ایک خیال انگیز تقریر سنی ہے۔''

رئیس وزیر بھونگ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے والد رئیس غازی بہاولپور ڈویژن کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔ ہزاروں ایکڑ اراضی کے مالک۔ بھونگ کی مشہور مسجد انہوں نے ہی بنوائی تھی۔ جن لوگوں نے اس مسجد کو دیکھا ہے وہ فن تعمیر اور کاریگروں کی صناعی پر عش عش کر اٹھتے ہیں۔ موزیق اور شیشہ گری کا کمال فن اپنے عروج پر پہنچا ہوا ہے۔ اس مسجد کو مراکو میں آغا خان ایوارڈ بھی ملا ہے۔ رئیس غازی ایک طویل عرصے تک اس کی تعمیر کرتے رہے۔ ان دنوں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ پیر فقیر نے انہیں بشارت دی ہے کہ ان کی زندگی مسجد کی تعمیر تک محدود ہے۔ جس دن مسجد مکمل ہو گئی وہ لمحہ چل چلاؤ کا ہو گا لہٰذا وہ اسے طول دیتے گئے۔ اس روایت کی صحت ایک لطیفے سے زیادہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں خوب سے خوب تر کی تلاش تھی۔ عشق عقل کو کہیں ٹھہرنے نہیں دیتا تھا۔ مسجد خدا کا گھر ہے۔ ہر بار انہیں یہ خیال دامن گیر ہوتا کہ کوئی کمی نہ رہ جائے۔

رئیس وزیر ایک نہایت زیرک انسان ہیں۔ رمز شناس۔ کاروبار کو پھیلانے کی بجائے انہوں نے اپنی خواہشات کو محدود کر لیا ہے۔ مدینہ میں ایک گھر بنوایا ہے۔ عوام کی سہولت کے لیے مولانا مکی کی طرح انہوں نے بھی بھونگ میں ایک خیراتی ہسپتال قائم کیا ہے۔ ہر سال فریضہ حج' باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں۔ سال میں دو مرتبہ روضہ رسول پر حاضری دیتے ہیں۔ دنیاوی جاہ و چشم تو انہیں ورثہ میں ملا ہے' دین کی دولت انہوں نے خود کمائی ہے۔

جب میں ملتان میں ڈپٹی کمشنر تھا تو میجر جاوید ملٹری انٹیلی جنس میں تھے۔ ان کا شمار بڑے اچھے افسروں میں ہوتا ہے۔ ایجنسیوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان میں وفا نہیں ہوتی۔ وفا کر بھی نہیں سکتے۔ پیشہ جو ایسا ٹھہرا۔ تعلقات کے محل چشم زدن میں مسمار ہو جاتے ہیں اور مانوس آنکھیں ماتھے پر جا لگتی ہیں۔ حکومتوں کو بھی اپنی پیشہ وارانہ مہارت سے ایسی رپورٹ دیتے ہیں جس کے کئی معانی نکل سکتے ہیں۔ میرے مرحوم دوست IB کے جائنٹ ڈائریکٹر نیر محفوظ کہا کرتے تھے کہ ہم Objective reporting صرف اس وقت تک کرتے ہیں جب تک Recipient اسے خوشدلی سے قبول کرتا ہے۔ جب جھنجھلاہٹ کے

آثار پیدا ہونے شروع ہو جائیں تو پھر صرف سب اچھا ہے' کی گردان کی جاتی ہے۔ سب اچھا ہے' کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک گلشن کا کاروبار چلتا رہے رپورٹ پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ اور اگر حالات دگرگوں ہو جائیں تو پھر باز پرس کا وقت نکل چکا ہوتا ہے۔ میجر جاوید کے دل میں اللہ کی لو جاگی تو انہوں نے نوکری سے استعفٰے دے دیا۔ ماتھے پر محرابیں بن گئیں اور ڈراڑھی خود رو ہو گئی۔ پہلے تو میں انہیں پہچان ہی نہ سکا لیکن جب انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں ''شاہ جی' کہا تو میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اوئے اے تے ساڈا ملتانی میجر اے۔''

قاری حنیف جالندھری کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ مدرسہ خیر المدارس کے علاوہ اب یہ لاہور میں بھی ایک بہت بڑا تعلیمی ادارہ کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مخصوص مسلک کے باوصف نہایت معتدل انسان ہیں۔ بذلہ سنج' ہنس مکھ اور بنیادی طور پر ایک ہمدرد دل رکھتے ہیں۔ ملتان میں میری آمد سے قبل میرے پیش رو نے انہیں کچھ ڈرا سا دیا تھا اور اس کا اظہار انہوں نے کمشنر طارق فاروق سے بھی کیا لیکن پہلی ملاقات میں ہی دل کے دریچے کھلتے گئے اور انہوں نے ہر وسوسے کو ذہن کے زندان سے نکال باہر کیا۔

مولانا ظفر احمد مدرسہ خالد بن ولید وہاڑی کے مہتمم ہیں۔ نہایت جید عالم دین ہیں۔ ملنسار' ہمدرد اور سچے عاشق رسول' میں نے روضہ رسول پر ان کے وداع ہونے کا منظر دیکھا ہے۔ آنسوؤں کی ایک جھڑی تھی جس نے ساری ڈاڑھی کو بھگو ڈالا تھا' ہچکیاں تھیں کہ رکتی ہی نہ تھیں۔ شرطوں کی سرزنش کے باوجود قدم بھاری پتھر بن گئے تھے۔

قاری طیب سے میری سرسری ملاقات تھی۔ یہ ہانگ کانگ کی مرکزی مسجد کے خطیب ہیں۔ آج سے چند سال پہلے جب میں ہانگ کانگ گیا تو ملاقات ہوئی۔ میرا یہ طریقہ ہے کہ جب بھی میں باہر جاتا ہوں' پاکستانی کمیونٹی کے نمائندوں اور علمائے کرام سے ملنے کی حتی الوسع کوشش کرتا ہوں۔ اسی دورے میں میں ٹوکیو کے اسلامک سنٹر کے انچارج امام عبدالعزیز سے ملا تھا۔ وہ بھی سعودی حکومت کی تنخواہ دار تھے۔ آج کل ہر جگہ مسلمانوں کو شک وشبے کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ حکومتوں اور ائیر پورٹ کے عملے کا رویہ خاصا مخاصمانہ ہے۔ اس میں کچھ قصور ہمارا اپنا بھی ہے۔ فرقہ واریت کا زہر آہستہ آہستہ باہر بھی پھیلتا جا رہا ہے۔ ہانگ کانگ کی حکومت کو اس سلسلے میں سخت اقدامات کرنے پڑے ہیں۔ ہانگ کانگ میں پاکستانیوں کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ ہزاروں غیر قانونی تارکین وطن برسوں سے جیلوں میں گل سڑ رہے ہیں۔ امام صاحب اور کمیونٹی کے صدر توفیق امدانی صاحب نے میری توجہ اس طرف دلائی اور اپیل کی کہ حکومت پاکستان ان کی رہائی اور وطن واپسی کے لیے خصوصی انتظامات کرے۔ جاپان میں اگر کوئی پکڑا جائے تو ایک وارننگ کے بعد چند دنوں کی مہلت دے کر واپس وطن بھیج دیتے ہیں۔

قاری وحید کسی زمانے میں سعودی عرب میں ملازمت کرتے تھے۔ گردش روزگار انہیں امریکہ لے آئی لیکن کشش کعبہ نے انہیں وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ سال میں دو مرتبہ' رمضان المبارک کے مہینے اور حج کے موقعہ پر سو مسلمانوں کا وفد لے کر سعودی عرب آتے ہیں۔ روضہ رسول پر حاضری دے کر انہیں حج کرواتے ہیں۔ امریکہ میں اکثر لوگ متمول ہیں لیکن ان کے ساتھ جو لوگ آتے ہیں ان کا اس معاشرے میں خاص مقام ہے۔ ڈاکٹر' انجینیر' بڑے تاجر۔ حج کے لیے کسی ملک کی کوئی قید نہیں ہے صرف مسلمان ہونا شرط ہے۔ سانولی رنگت' درمیانے قد اور ہلکے بالوں والے قاری صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔

قاری صاحب کو کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے' عربی' انگریزی' اردو تو ویسے ہی افراد خانہ میں شامل ہیں۔ حیدر آباد دکن کے رہنے والے ہیں اس لئیو لتے ہوئے کبھی کبھی ح' خ کے بوجھ تلے دب جاتی ہے۔

مولانا فضل الرحمن کے داماد اور فیروزہ کے شبیر صاحب سے ملاقات ہوئی' دونوں نوجوان ہیں۔ دونوں میں ادب اور خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مولانا صاحب نے انہیں بطور خاص منگوایا ہے۔ ان کے زیر تربیت میں ہیں گویا دین کی اکیڈمی کے پروفیشر ہیں۔

لیکن جس شخص نے مجھے نہایت متاثر کیا وہ ساؤتھ افریقہ کے احمد لمبات تھے۔ دبلے پتلے' گندمی رنگت' باریک ڈاڑھی' ہو چی من آنجہانی سے ملتی جلتی' کوئی ساٹھ کے پیٹے میں ہونگے۔ جوہانسبرگ میں چوٹی کے وکیل ہیں جو ڈیشنل کونسل کے اہم رکن ہیں۔ اختتام حج تک احرام نہیں کھولتے۔ رات کو دو بجے حرم شریف میں چلے جاتے اور عبادت میں مشغول ہو جاتے۔ نماز فجر کے بعد واپس آتے اور ناشتہ کے بعد استراحت فرماتے۔ قومی اور بین الاقوامی امور پر انہیں خاصا عبور حاصل ہے۔ بات کرتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے محبت اور خلوص بکھیر رہے ہوں۔ نہایت دھیما اور شفاف لہجہ' بذلہ سنج' معاملہ فہم اور زیرک انسان ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ زہد و تقویٰ کو کسی پر مسلط نہیں کرتے' اسے ذریعہ آزار بھی نہیں بناتے۔ اکثر لوگوں کو زاہدان خشک سے یہ شکوہ رہا ہے کہ وہ غرور زہد میں بندگان خدا پر زبان دراز کرتے ہیں' ان کے لب و لہجے میں شائستگی نہیں ہوتی اور ہر دوسرے شخص کو سزا کی بشارت اس طرح دیتے ہیں جیسے داروغہ دوزخ ہوں۔

◆◆◆

مدینہ منورہ

سعید شاہ آبادی سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی ان کا کراچی کے متمول لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ فربہ مائل جسم' درمیانہ قد۔ لمبی داڑھی کے پیچھے سرخ وسفید چہرہ' حلیم الطبع' چالیس پینتالیس سال کے ہونگے۔ داڑھی سے بسا اوقات عمر کا اندازہ نہیں ہوتا۔ چہرے کے خال وخد بھی نمایاں نہیں ہوتے۔ سید صاحب مجرد ہیں۔ جوانی میں ہی دین کی طرف راغب ہو گئے لیکن دنیا کا دامن بھی نہیں چھوڑا۔ سال میں دو مرتبہ مکہ مدینہ آتے ہیں۔ باقی وقت کراچی اور اسلام آباد کے درمیان گزرتا ہے۔ جب بات کرتے ہیں تو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے منہ میں شہد ڈال رکھا ہو۔ دھیما لہجہ' ہر کسی کو بھائی کہہ کر پکارتے ہیں۔

ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ دین کے مسائل' دنیاوی بکھیڑے' مسلمانوں کی حالت زار' اہل مغرب کا معاندانہ رویہ' مسلم حکمرانوں کی منافقتیں' کمزوریاں' مناقشت اور مفاد پرستی۔ یہ سلسلہ مزید چلتا کہ شبیر نے آخر اطلاع دی کہ نماز ظہر کا وقت ہو گیا ہے وضو کر لیں۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ نماز ظہر ہم نے گھر پر ہی مولانا صاحب کی امامت میں ادا کی۔ نماز پڑھ کر تھوڑی دیر آرام کیا تھا کہ سائیں جندوڈہ نے اطلاع دی کہ دستر خوان لگ گیا ہے۔ کھانا کھالیں۔ لائبریری سے ملحقہ کمرے میں سفید چادریں بچھ گئیں۔ مولانا صاحب کا دستر خوان واقعی بہت وسیع تھا۔ بھنا ہوا گوشت' چکن کڑاہی' سبزی' دال' پلاؤ اور سلاد۔ مولانا صاحب نے دعا پڑھی اور کھانا شروع ہو گیا۔ عرب روٹی کھانے کا پہلی مرتبہ تجربہ ہوا۔ بڑی موٹی' گول مٹول اور زود ہضم۔ پچیس تیس لوگوں کے لیے کھانا پروسا گیا تھا اور ان لوگوں میں مولانا صاحب کا ملازم جندوڈہ اور رفیق بھی شامل تھے۔ شہر رسول میں محمود وایاز کی قید مٹ گئی تھی۔ بندہ اور بندہ نواز کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھے تھے۔ کھانے کے بعد جندوڈہ پھل اور سویاں لے آیا۔ اس کے بعد چائے کا دور چلا۔ سبز چائے۔ یاسمین ٹی۔ مولانا صاحب چائے کا کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگے۔ سبز چائے بڑا عمدہ مشروب ہے' کھانا فوراً ہضم ہو جاتا ہے۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گا!

یقیناً! میں نے کہا" یہ علمائے کرام کا پسندیدہ مشروب ہے اس کو ناپسند تو کیا ہی نہیں جا سکتا۔

وہ کیسے؟ قدرے حیران ہوتے ہوئے بولے۔

"اس مشروب نشاط انگیز نے مولانا ابوالکلام آزاد کی طبع یورش پسند کو سرمستیاں عطا کیں۔ اسی جرعہ آب نے ان کی فکر عالم

آشوب کو آسودگیاں بخشیں اور یہی غبار خاطر کا محرک بنا۔ ایسے لگتا ہے کہ اگر زنداں میں انگریز چائے نوشی کی ممانعت کر دیتا تو لوگوں کو محض غبار نظر آتا اور کوئی اسے خاطر میں نہ لاتا۔"

"تعریف اور تضحیک میں بسا اوقات بال برابر فاصلہ ہوتا ہے۔" جنوبی افریقہ کے مولوی کڑوا بولے۔ میں نے ان کا تفصیلاً ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ اسم با مسمیٰ تھے مولانا مکی کہنے لگے "دراصل وہ طبعاً کالی چائے کے مخالف تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ چائے وہ ہے جو دودھ کی کثافت سے پاک ہو۔ کالی چائے کو وہ لیچو پیچو قسم کی چائے کہتے تھے۔ ایک دفعہ تو وہ پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی کہہ بیٹھے تھے کہ وہ لیچو پیچو قسم کی چائے نہ پیا کریں۔

"اور پنڈت جی نے ان کی بات نہ مانی۔" میں نے کہا۔ "اب امام الہند کو کون سمجھاتا کہ جو پنڈت جواہر لعل نہرو آپ کے کہنے پر چائے کی ایک پیالی سے دست کش نہیں ہوتا وہ مسلم دشمنی کیسے چھوڑ دے گا۔ دنیا کا کونسا ایسا نشتر ہے جو یہ زہر اس کے وجود سے نکالے گا۔ کشمیر کے مسلمانوں کے ساتھ آج جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے ذمہ دار بھی وہی تھے۔"

احمد لمبات بولے۔ یہ چائے کی پتی ہمیں کہاں لے آئی ہے۔ کشمیر میں تو زعفران کھلتے ہیں۔ کچھ ایسی باتیں کیوں نہ کریں کہ محفل زعفران زار ہو جائے۔ سبھی مسکرا دیے۔ تھوڑی دیر بعد مولانا صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنے لگے۔ "شاہ صاحب آپ آرام کریں۔ شبیر آپ کو نماز عصر کے وقت اٹھا دے گا۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

"اس قدر مرغن کھانے کے بعد نیند نے تو آنا ہی ہے؟" میں نے کہا۔ بولے "یہ میرا گذشتہ چالیس سال سے معمول ہے۔ نماز فجر ارظہر کے درمیان آرام کرتا ہوں۔ رات کو دو بجے سے پہلے لوگ سونے نہیں دیتے۔ فون پر شرعی مسائل پوچھتے رہتے ہیں۔"

میں اٹھ کر کمرے میں آ گیا۔ نیند کی ایک زبردست لہر آئی جو مجھے انجانی وادیوں میں لے گئی۔

نماز عصر سب نے مل کر پڑھی۔ مغرب کی اذان سے کچھ دیر پہلے شبیر نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ باہر سے ہی بولے۔ "شاہ صاحب وضو کر لیں۔ پارٹی حرم شریف جانے کے لیے تیار ہے۔" مولانا مکی کی سربراہی میں جب ہم باہر نکلے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی میں نے گھبرا کر گھڑی کی طرف دیکھا' مولانا صاحب کہنے لگے۔ فکر نہ کرو اقامت سے پہلے ہی ہم حرم شریف پہنچ جائیں گے۔"

کیا پندرہ آدمی کار میں بیٹھیں گے؟ میں نے رفیق ڈرائیور کی طرف دیکھا۔

بولے "اس کی ضرورت نہیں ہم پیدل ہی پہنچ جائیں گے۔

پانچ میل پانچ منٹوں میں؟" مجھے واقعی حیرت ہو رہی تھی۔

مولانا صاحب بولے پانچ سو گز کے فاصلے پر حرم شریف ہے یہ شارٹ کٹ ہے۔ پہاڑ کی سیڑھیاں اترتے ہی دائیں ہاتھ مڑو گے تو مسجد الحرام کے مینار نظر آئیں گے۔ ہم واقعی پانچ منٹوں میں حرم شریف کے سامنے کھڑے تھے لیکن حرم شریف میں داخل ہونے کے لیے اس سے کہیں زیادہ وقت درکار تھا۔ تمام حجاج کرام مسجد کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ حرم کے باہر سڑکیں۔ بازار۔ گلیاں لوگوں سے اٹی پڑی تھیں۔ کچھ لوگوں نے چھوٹی دریاں اٹھائی ہوئی تھیں۔ اکثریت ان لوگوں کی تھی جنہوں نے تارکول کی سڑک پر ہی جبین نیاز بچھائی تھی۔ مولانا صاحب تو اندر چلے گئے کیونکہ انہیں نماز کے فوراً بعد درس دینا تھا اور اس کے لیے حکومت نے حرم کا ایک خاص حصہ مختص کر دیا ہے۔ ہم نے سڑک پر ہی ڈیرے ڈال دیئے۔ نماز ختم ہوتے ہی دوکانوں کے شٹر اٹھنے لگے۔ ان کی رونق لوٹ آئی۔ کاروبار پھر سے شروع ہو گیا۔ امپورٹڈ مال۔ عرب دوکاندار' عجمی خریدار۔ بھاؤ تاؤ نہیں ہوتے۔ بھاؤ پوچھنے پر ہی ڈر لگتا ہے۔ ایک پلہ انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ کسی دل جلے نے خوب کہا تھا کہ پہلے جو لوگ حاجیوں کو صحرا میں لوٹتے تھے' اب زرق برق دوکانوں میں بیٹھ کر جیبوں پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ کوئی چیز بھی ملک میں نہیں بنتی' اٹلی کی تسبیحیں' جاپان کے کپڑے' فرانس کے کلون' کوریا کے جائے نماز' سوئٹزرلینڈ کی گھڑیاں اور جیولری' البیک کے لیے مرغیاں ارجنٹینا سے آتی ہیں۔ پھل اور سبزیاں یورپ اور ہندو پاکستان سے درآمد کی جاتی ہیں۔ جنگل میں منگل کا سماں ہے۔ پہاڑوں نے سیمنٹ اور سریے کی چادر اوڑھ لی ہے۔ گرد آلود راستوں کو کنکریٹ کے شکنجوں میں کس جکڑ دیا گیا ہے۔ خیمے خیابانوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ وزنی ائیر کنڈیشنر بادسموم کا منہ چڑاتے ہیں۔ فلسفی نام کا کوئی لفظ شہر کی لغت میں نہیں ہے۔ ہر کوئی پیٹ بھر کر سوتا ہے۔ رات کو دوکاندار جب کاروبار بند کر کے گھر جاتے ہیں تو ان کی عباؤں کی جیبیں ان کی توند کی طرح پھولی ہوئی ہوتی ہیں۔ صفائی کا معقول بندوبست ہے۔ زرد رو' مریل اور آبنوسی رنگت والے بنگالی ہمہ وقت صفائی کرتے رہتے ہیں۔ پولیتھین کے تھیلوں' سگریٹوں کے بٹ' فروٹ کے چھلکے زیادہ دیر تک سڑک کی سجاوٹ نہیں بنتے۔

ہجوم رفتہ رفتہ چھٹ گیا۔ اس کی مثال بھی سمندر کی اس لہر کی طرح ہوتی ہے جو سرمستی کے عالم میں ساحل سے ٹکراتی ہے اور پھر سرشار ہو کر واپس لوٹ جاتی ہے۔ جب ہم آب زم زم پی کر حرم کے اندر پہنچے تو مولانا صاحب کا لیکچر شباب پر تھا۔ چالیس سال کی ریاضت' لگن اور محنت نے ایک مجسم شکل اختیار کر لی تھی لوگوں کی ایک کثیر تعداد ہمہ تن گوش تھی۔ مولانا صاحب سیرت رسول مقبول پر روشنی ڈال رہے تھے۔ شرعی مسائل بیان کر رہے تھے۔ مناسک کے اہم پہلوؤں سے پردہ اٹھا رہے تھے۔ شرعی مسائل بیان کر رہے تھے۔ مناسک حج کے اہم پہلوؤں سے پردہ اٹھا رہے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ان کا وعظ سنا تھا۔ لفظ لو دے رہے تھے۔

آواز میں کوئی جھول نہیں تھا۔ استدلال میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ لہجے میں کوئی تلخی نہیں تھی۔ لذت تقریر سے لوگ سرشار ہو رہے تھے۔ ایسے پتہ چلتا تھا کہ وہ صرف شرعی مسائل سن نہیں رہے انہیں گرہ سے باندھ رہے ہیں' ذہن کے کمپیوٹر میں محفوظ کر رہے ہیں۔

مولانا صاحب کی تقریر ختم ہوئی تو سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا سوالوں کی ایک بوچھاڑ تھی۔ تحقیق۔ تشکیک۔ تحفظ پر مبنی سوالات تھے۔ بعض سوالات میں شرارت کا عنصر بھی موجود تھا۔ مقصد سوال نہیں ہوتا بلکہ مقرر کو زچ کرنا ہوتا ہے۔ مولانا صاحب ہر کسی کو اس کی سوچ' فہم اور ظرف کے مطابق جواب دے رہے تھے۔ ہر مفسد سوال کا توڑ بھیان کے پاس موجود تھا۔ بس ایک جملے سے منہ بند کر دیتے تھے۔

اکثریت سادہ لوح لوگوں کی تھی۔ سوالات بھی بڑے معصوم تھے۔ میرے احرام پر سالن گر گیا ہے' کیا کروں؟ کوئی نجس چھینٹ پڑ گئی ہے۔ بے خیالی میں سر کا بال توڑ ڈالا ہے۔ کوئی چیونٹی پاؤں تلے آ گئی ہے۔ کوئی خواب ٹھیک نہیں آیا۔ عادتاً منہ سے گالی نکل گئی ہے وغیرہ۔ حج واقعی مشکل کام ہے۔ اس کی آسانی اور قبولیت کے لیے لوگ سفر سے پہلے ہی دعائیں مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔

نماز عشا کے بعد جب قافلہ واپس لوٹا تو سائیں جندوڈہ نے دسترخوان بچھا دیا تھا۔ انواع و اقسام کے کھانے تھے لیکن طریق وہی قلندرانہ تھا۔ فرش محمدی چھری کانٹے کی بجائے دائیں ہاتھ کا استعمال' کھانے سے پہلے اور بعد میں دعائیں اور درمیان میں مکمل خاموشی۔ کھانے کا اس قدر لطف پہلے کبھی نہ آیا تھا۔

وہ رات بھی عجیب تھی۔ دو دن کی تھکن اور رتجگا' آرام دہ کمرہ۔ فوم کشن' ایرانی غالیچے' ایئر کنڈیشنر' ڈرائی فروٹ' منرل واٹر' جوس' ہر چیز کمرے میں موجود تھی لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے نصف گھنٹہ تک بستر پر لیٹ کر سونے کی ناکام کوشش کی۔ ایسے پتہ چلتا تھا کہ نیند نے ذہن کو شجر ممنوعہ سمجھ رکھا ہے۔ چند کروٹیں بدلنے کے بعد میں اٹھ بیٹھا۔ بتی جلائی تو گھڑی کی سوئیاں بارہ کا ہندسہ عبور کر چکی تھیں۔ میں نے ایئر کنڈیشنر بند کر دیا اور سامنے والی کھڑکی کھول دی۔ تمام شہر روشنیوں میں نہا رہا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر بنے ہوئے مکانوں کی بتیاں ستاروں کی طرح ٹمٹما رہی تھیں۔ سامنے حیات ریجنسی ہوٹل پر غنودگی چھائی ہوئی تھی۔ اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے۔ حرم شریف کو جاتی ہوئی شاہراہیں بھی اب خالی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی موٹر بھوں کر کے گذر جاتی۔

میں کہاں آ گیا ہوں؟ میں نے اپنے اندر جھانکا۔ اتنی بڑی تبدیلی کیسے رونما ہوئی؟ انجانے خوف کے بادل کیونکر چھٹے۔ وسوسوں کے جال سے کس طرح باہر نکلا۔ یورپ' امریکہ' افریقہ' آسٹریلیا' ایشیا' ایک طویل عرصے تک ساری دنیا کے گرد میں ایک سیٹلائٹ کی طرح پھرتا رہا۔ ایک بار۔ دو بار۔ کئی بار۔ لیکن یہ ایک سفر زندگی بھر کی مسافت پر بھاری تھا شاید اس کا حاصل تھا۔ عام سفر ذہن کے

بند دریچوں کو کھولتا ہے۔ لیکن یہ دل کے ہر دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ خشک آنکھوں کو نم بخش رہا تھا۔ وجود کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ اندر سے کوئی آواز آ رہی تھی۔ ''نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کر دو۔'' پرانے چراغ بجھانا مشکل کام ہوتا ہے لیکن اس کے بغیر سفر نو کا آغاز نہیں ہو سکتا۔ مجھ پر جب بھی جذبات کا ہجوم یلغار کرتا ہے تو میں خود بخود تاریخ کے حصار میں چلا جاتا ہوں۔

دیوار کعبہ قریباً چھ فٹ اونچی تھی۔ دیواریں بغیر چھت کے تھیں خشک پہاڑوں سے بارش کا پانی ایک شوریدہ سر ندی کی مانند کعبہ پر یلغار کرتا اور اس کی شکست و ریخت کا موجب بنتا۔ اہل شہر کو اس بات نے پریشان کر رکھا تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد یہ طے پایا کہ عمارت کو ڈھا کر تعمیر نو کی جائے۔ ان دنوں جدہ میں ایک تجارتی جہاز کنارے سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ قریش نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور رقم دے کو ولید بن مغیرہ کو اس کام پر معمور کیا کہ جہاز کے تختے خرید لائے۔ تختوں کے ساتھ ولید ایک رومی معمار باقوم کو بھی ساتھ لے آیا۔ چنانچہ اس طرح باہمی اشتراک سے تعمیر نو شروع ہوئی۔ قبائل کو تعمیر کے مختلف مراحل سے گزارا گیا۔ تعمیر ہو چکی تو حجر اسود نصب کرنے کا سوال اٹھا۔ کوئی قبیلہ بھی اس سعادت سے محروم نہیں ہونا چاہتا تھا۔ عرب تلواریں نیام سے باہر نکل آئیں۔ ممکن تھا کہ کشتیوں کے پشتے لگ جاتے کہ ہر نگاہ ایک چہرے پر پڑی۔ ایک شخص جو امین تھا' حسین تھا' فہم و ادراک کا مالک تھا' جواں عمری کے باوصف بزرگوں کی سی متانت' ذہانت اور فطانت رکھتا تھا۔ آنحضور نے سنگ اسود کو ایک چادر میں ڈالا' چادر کے کونے قبیلوں نے پکڑے اور اس طرح آپ نے مقدس پتھر کو مقام مقررہ پر نصب کر دیا۔ اس طرح خون آشام تلواریں نیام میں واپس چلی گئیں اور قبائل پھر سے شیر و شکر ہو گئے۔ لوگوں نے فرط مسرت اور عقیدت سے ان کے ہاتھ چوم ڈالے۔

وہی شخص جب اچانک ایک دن کہتا ہے کہ وہ خدا کا رسول ہے۔ اس پر وحی نازل ہوئی ہے' لوگوں کو بدعتوں' برائیوں اور کفر سے روکتا ہے تو مخالفت کا ایک طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔ عرب عصبیت' قبائل کا زعم برتری اچانک جاگ پڑتا ہے۔ برسوں کی فرسودہ روایات اس کا راستہ روکتی ہیں۔ اپنے پرائے سب اس کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ ہر جگہ اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ بچوں کے غول گلیوں میں اس کا تمسخر اڑاتے ہیں۔ ابوجہل کے ایما پر عقبہ حالت نماز میں ان کی گردن پر اونٹ کی اوجھ اور نجاست ڈال دیتا ہے۔ چھ برس کی بچی فاطمہ دوڑی ہوئی آتی ہیں اور رو رو کر اسے سرزنش کرتی ہیں۔ ''بدبخت تو نے میرے بابا کی کیا حالت بنا دی ہے۔!''

جب بازار مکہ میں آپ لوگوں کو دعوت اسلام دیتے ہیں تو ابوجہل آپ پر خاک ڈال دیتا ہے اور پھر بہ آواز بلند کہتا ہے۔ ''لوگو اس شخص کی باتوں میں نہ آنا۔ یہ فریبی تم سے لات و عزیٰ کی پرستش چھڑوا دے گا۔'' دشمنان دین کی ایک فوج تھی جو آپ کی جان کے

در پے ہوئی۔ ابوجہل' ابولہب' حارث بن قیس' ولید بن مغیرہ' امیہ' ابی بن خلف' ابوقیس بن خاکہہ' عاص بن واصل' نضر بن حارث' عاص بن ہاشم' عتبہ بن ابی مغیط' ابن الاصدی۔ حکم بن ابی العاص۔ سائب بن سیفی۔ وغیرہ۔

لیکن یہ وقتی کامیابیاں رسالت ماب کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ ذلت اور رسوائی نے مخالفین کو تتر بتر کر دیا اور بال آخر آفتاب رسالت اپنی پوری آب و تاب اور ضوفشانیوں کے ساتھ چمکا۔

زندگی ایک بہت بڑا امتحان ہے۔ تمام عمر انسان کو کئی جانسوز مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ''ہزار خار مغیلاں ہے کارواں کے لیے۔ قدم قدم پہ بڑی سختیاں ہیں جاں کے لیے۔ یہ امتحان اگر پیغمبروں کا ہو تو اور بھی کٹھن ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ اسلام کو کئی برس تک ان کی قوم نے زچ کیا۔ بال آخر انہیں بددعا مانگنا پڑی۔ عیسیٰ علیہ السلام منزل دار و رسن سے گزرے۔ موسیٰ ایک طویل عرصے تک ذہنی کرب میں مبتلا رہے۔ یونس مچھلی کے پیٹ میں تائب ہوئے۔ یعقوب کی آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں۔ ابراہیم تمثیلی خواب کو عینی سمجھ کر اپنے فرزند کی قربانی پر آمادہ ہوئے۔ خاتم الانبیا کا امتحان ان سب سے بڑھ کر تھا۔ طائف میں لوگوں نے پتھر مار مار کر لہولہان کر دیا۔ پاپوش مبارک خون سے بھر گئے۔ جناب بن الارت نے عرض کی'' ان گمراہ اور بدقماش لوگوں کے لیے بددعا کریں۔'' تو چہرہ مبارک گرما کے مثل صاعقہ طور ہو گیا۔ بولے۔ ''میں رحمت اللعالمین ہوں اپنی قوم کی ہدایت کے لیے دعا کر سکتا ہوں۔ بددعا کا تو سوچا بھی نہیں جا سکتا۔''

بال آخر پیار محبت' ایثار' قربانی' اور عزم و یقین رنگ لائے' قبائل جوق در جوق مسلمان ہوئے۔ ایک پیغمبر' ایک حکمران' ایک عظیم جرنیل لشکر جرار لے کر مکہ میں داخل ہوا۔ اہل مکہ لرزہ براندام تھے۔ انہیں اپنی ہرزہ سرائیاں' ناجوازیاں اور مظالم یاد تھے۔ سہمے ہوئے کافرین کا پنی پگڑیوں اور داڑھیوں کے درمیان موج خوں نظر آئی۔ سروں کی فصلیں جو پک چکی تھیں۔ انتقام۔ انتقام۔ مکہ کی ہواؤں کو پسینہ آ رہا تھا۔ فضا میں ایک بوجھل پن تھا۔

پھر ایک اعلان ہوا۔ ''بخش دو گر خطا کرے کوئی۔'' عام معافی خاص و عام کے لیے۔ سرکش فرعون صفت لوگوں کے لیے۔ وہ جنہوں نے گلے میں رسیاں ڈالی تھیں۔ وہ جنہوں نے سنگ اٹھائے تھے اور وہ بھی جنہوں نے فرزند اسلام کا کلیجہ چبایا تھا۔

باایں ہمہ مکہ کو مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ مکینوں کی سزا مکان کو نہیں دی جا سکتی۔ گلے شکوے بجا لیکن اسی جگہ کو اللہ نے اپنے گھر کے لیے منتخب کیا۔ اپنے محبوب کی ولادت کے لیے بھی اسی سرزمین کو پسند فرمایا تھا۔ آدم و حوا کا ملاپ بھی انہیں سنگلاخ وادیوں میں ہوا۔ ابراہیم و اسمٰعیل کا یہی رین بسیرا تھا۔

مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی۔ اے شہر رسول' اے رب کائنات کے پہلے اور آخری گھر۔ میں تیری عظمتوں کو سلام کرتا ہوں۔ میری خطائیں معاف فرما۔ ان گلوں شکووں کو درگذر کر جو وفور درد کی وجہ سے پیدا ہوئے۔

کھلی ہوئی کھڑکی سے بادصبگاہی کا ایک جھونکا آیا اور سارے وجود کو سرشار کر گیا۔ میں نے غسل خانے میں جا کر وضو کیا کہ نماز فجر کا وقت قریب آ رہا تھا۔ تمام احباب سو رہے تھے۔ جنوبی افریقہ کے احمد لمبات نوافل کے لیے حرم شریف چلے گئے تھے۔

کچھ دیر بعد حرم کے میناروں سے آواز اذاں گونجی۔ ساری عمارت کے دروازے کھٹ کھٹ کھلنے لگے۔ لوگ حمد وثنا کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''نماز نیند سے بہتر ہے۔'' ان چند لفظوں میں ایک دریائے معانی پوشیدہ ہے۔ خدا عظیم ہے۔ محمد اس کے رسول ہیں۔ اس کی گواہی تو کائنات کا ذرہ ذرہ دیتا ہے۔ ثبوت حق کے ساتھ پیغام حق بھی ضروری ہے اور یہ کام رسولوں کو سونپا گیا ہے۔ مکہ کی فضائیں صدیوں سے آواز اذاں سن رہی ہیں لیکن وہ ایک اذان جو چودہ سال قبل ایک کالے بھجنگ زبان والے حبشی نے کعبہ کی چھت پر کھڑے ہو کر دی تھی اس کی صدائے بازگشت آج بھی تاریکی مدفن سے سنائی دیتی ہے۔ وہ کون تھا؟

لیکن بلال ..... وہ حبشی زادہ حقیر
جس کی نظر تھی نور نبوت سے مستنیر

بتان رنگ وخون کو پاش پاش کرنے کا اس سے بڑا عملی مظاہرہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

مولانا صاحب کے ساتھ نماز فجر ہم نے قریبی مسجد میں ادا کی۔ فرمانے لگے۔ حرم شریف میں نماز پڑھنا افضل ہے لیکن اب جبکہ مکہ آئے ہو تو دیگر مساجد کی سج دھج بھی دیکھ لو۔ مسجد نمازیوں سے بھری پڑی تھی۔ زیادہ تعداد نائیجیرین اور انڈونیشیا کے حاجیوں کی تھی۔ آبادی کے لحاظ سے انڈونیشیا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور غالباً واحد ملک ہے جہاں حج کرنے والوں کی اکثریت نوجوانوں اور جوانوں پر مشتمل ہے۔ وہاں شادی سے پہلے حج کرنا نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ سارے مکہ کی مسجدیں خوبصورت ہیں۔ وال ٹو وال کارپٹ بچھے ہوئے ہیں۔ ائیر کنڈیشنڈ۔ وضو اور جوتے رکھنے کا معقول بندوبست اور سرکاری امام' ایک حکومت' ایک ہی مسلک اور ایک ہی پرچار۔ جگہ جگہ سرکاری کارندے مفت لٹریچر تقسیم کرتے ہیں۔ کتابیں صرف وہی بکتی ہیں اور پڑھی جا سکتی ہیں جنہیں سرکاری سرٹیفکیٹ حاصل ہو۔

واپس آ کر میں نے تین دن بعد شیو کی۔ ہر عمر کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ جوانی تو دیوانی ہوتی ہے۔ کسی چیز کی پروا نہیں ہوتی' شاید زیادہ ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ لیکن عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ کیموفلاج کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ آدمی یا تو باقاعدہ داڑھی رکھ

لے یا پھر روزانہ شیو کرے۔ درمیانی صورت میں چہرے پر ایک عجیب کھچڑی سی پک جاتی ہے اور آئینہ دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ ''یہ میں ہی ہوں۔''

ابھی ہم ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ اختر صاحب کا فون آ گیا۔ بولے۔ ''آپ تیار ہو جائیں میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔'' اختر صاحب میرے ایک شناسا کے چھوٹے بھائی ہیں اور ایک طویل عرصے سے جدہ میں مقیم ہیں۔ میری ان سے پہلے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ انہوں نے حسب ہدایت مجھے مکہ دکھانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ مولانا صاحب فرمانے لگے۔ میں نے رفیق کو ہدایت کر دی تھی کہ آپ کو مقامات مقدسہ کی زیارت کرائے لیکن اب جبکہ اختر صاحب پہنچنے والے ہیں تو بہتر ہوگا کہ جلد نکل جاؤ' دیر کر دی تو ٹریفک کے اژدہام میں پھنس جاؤ گے اور سارا دن ضائع ہو جائے گا۔

''دیر کس بات کی!'' میں نے کہا۔ مجھے صرف پانچ جگہیں دیکھنی ہیں۔ جائے ولادت رسالت مآب۔ جنت المعلٰے۔ غار ان حرا و ثور اور مسجد عائشہ۔

اس کے لیے شاید ایک دن کافی نہیں ہوگا۔'' مولانا صاحب کہنے لگے۔''

تمازت آفتاب کی وجہ سے غاروں تک پہنچنا بھی مشکل ہوگا۔ جہاں تک جا سکتے ہو چلے جانا۔ جائے ولادت کی جگہ ایک لائبریری بن چکی ہے جس کو اکثر تالا لگا رہتا ہے۔ میں آپ کا مزاج جانتا ہوں لیکن آپ فارسی کا وہ مشہور محاورہ تو سن چکے ہونگے۔

''قہر درویش بر جان درویش'' اس ملک میں شرطوں سے الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں البتہ نقصانات ناقابل تلافی ہو سکتے ہیں۔''

''اور وہ جنت المعلٰے ؟'' میرے لہجے میں لکنت تھی۔

''وہ جو کبھی تھا' اب نہیں ہے اور جو ہے وہ شاید کبھی نہ تھا۔'' مولانا صاحب ایک تلخ حقیقت فلسفے کی زبان میں بیان کر گئے۔

''تو پھر میں نے دیکھنا کیا ہے؟'' مجھے واقعی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

''بن دیکھے بھی ایک پھانس سی گلے میں محسوس کرو گے!''

''گویا میں فریاد اور پھانس کے درمیان لٹک گیا ہوں۔ دل کی یہ گرہیں کون کھولے گا۔؟''

''اوپر والا'' مولانا صاحب نے انگلی آسمان کی طرف اٹھائی۔ ''یہ جو علیم و خبیر ہے۔ جو دلوں کے حال جانتا ہے وہ ان کی گرہیں بھی کھول سکتا ہے۔ اس پر بھروسہ رکھو۔''

میں نے مولانا صاحب کو خدا حافظ کہا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ تھوڑی دیر بعد اختر صاحب بھی پہنچ گئے۔ درمیانہ قد۔

جوان۔صحت منداور کھلتا ہوارنگ'رسمی تعارف کے بعد کہنے لگے۔''شاہ صاحب جلدنکل چلیں سورج کے تیورٹھیک معلوم نہیں ہوتے۔ صبح سے ہی تلملا رہا ہے۔''

''اس ملک میں اس کا مزاج کبھی نرم نہیں پڑے گا۔دراصل یہ ملک نہیں بلکہ ایک امتحان گاہ ہے۔یہ وسیع وعریض صحرا'یہ بے آب وگیاہ پہاڑ'طویل فاصلے'دشوارگزار راستے حاجیوں کا امتحان لیتے ہیں۔''

''امتحانی پرچہ نسبتاً آسان ہوگیا ہے۔''اختر صاحب مسکرائے۔''آپ نے ۴۰'۵۰ یا اس سے پہلے کا سعودی عرب نہیں دیکھا۔ سواری کے لیے اونٹ کے ہچکولے'صحرائے عرب کے آتش فشاں بگولے'کھاری پانی'اور باسی روٹی'حاجیوں کو ہلکان کردیتی تھی۔ لوگ گھروں سے گناہ بخشوا کر نکلتے تھے اب تو موٹرگاڑیاں اور کوکا کولا نے سفر کی صعوبتیں ختم کرڈالی ہیں۔البتہ حج کے چند ایام مشکل ہیں۔وہ بھی کسی طور گذر ہی جاتے ہیں۔''

''آپ یہاں کیا کام کرتے ہیں؟''جب انہوں نے گاڑی سٹارٹ کی تو میں نے پوچھا۔

''کوئی ایسا کام نہیں جو میں نے نہ کیا ہو۔محنت مزدوری'ٹھیکہ داری'اور دوکانداری۔آج کل میاں نواز شریف جو سٹیل مل لگا رہے ہیں۔وہاں کی لیبر کو اشیائے خوردونوش فراہم کرنے کا ٹھیکہ میرے پاس ہے۔''

''میاں صاحب سعودی عرب میں اسٹیل مل لگا رہے ہیں!یقین نہیں آتا''

''مکمل ہونے والی ہے۔اگر یقین نہیں تو چلیں میں آپ کو دکھا دیتا ہوں۔''

''انہیں آئے ہوئے تو ڈیڑھ سال ہوا ہے؟''

بولے''محنت'ہمت۔تجربہ اس خاندان کا ورثہ ہے۔آپ انہیں سمندر میں پھینک دیں وہاں بھی ان کا وجدان ان کو زندہ رہنے کے طریقے سکھلا دے گا؟''

''پہلے کہاں چلنا ہے؟''میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

''مسجد عائشہ۔تاریخی مسجد جہاں حاجی احرام باندھتے ہیں۔یہ حدودحرم سے ملحق ہے۔''

''کیا یہ حرم کے قریب ہے؟ مجھے قدرے حیرت ہوئی۔''

''نہیں قریباً پانچ میل دور ہے۔جہاں حرم کی حد ختم ہوتی ہے۔''وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولے۔''

''حدودحرم میں کافی پابندیاں ہیں۔درخت نہیں کاٹا جاسکتا۔خون بہانا منع ہے۔''

ہم نصف گھنٹے میں مسجد عائشہ پہنچ گئے۔ راستے میں تھوڑی دیر کے لیے فارمیسی کی دوکان پر رکے۔ میرا گلا دکھ رہا تھا اور تجربے کی بنا پر مجھے علم تھا کہ یہ سوزش فلو کا پیش خیمہ تھی۔ پچیس لاکھ کا مجمع جب بیک وقت سانس لیتا ہے تو چھوٹے موٹے عوارض کا لاحق ہونا کوئی انہونی بات نہیں ہوتی۔ اتفاق سے سیلز مین بھی پاکستانی تھا۔ عرب ممالک میں بے شمار پاکستانی ہیں ویسے تو یہ خوشی کی بات تھی۔ کسی بھی ملک کے شہری ایک قسم کے سفیر ہوتے ہیں۔ ان سے ملک وقوم اقوام عالم میں متعارف ہوتے ہیں۔ زرمبادلہ کمانے کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ افسوس ناک بات صرف یہ ہے کہ ان کی غالب اکثریت مزدور پیشہ ہے اور بندہ مزدور کے اوقات ہمیشہ تلخ رہے ہیں۔ عربوں نے ان کی کمزوری پکڑ لی ہے۔ ہر سال اجرت بڑھانے کی بجائے کم کر دیتے ہیں۔ بنگلہ دیشی، سری لنکن اس سے بھی کم اجرت پر کام کرنے کے لیے مل جاتے ہیں۔ لوگ خوشی سے نہیں بلکہ مجبوراً ملک چھوڑتے ہیں۔ وطن عزیز میں آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اور روزگار کے مواقع گھٹ رہے ہیں۔ تشدد، دہشت گردی لوٹ کھسوٹ۔ مملکت خداداد! رب العزت کیا سوچتا ہوگا؟

جب ہم مسجد عائشہ پہنچے تو نماز ظہر کا وقت ہو رہا تھا۔ مسجد مدینہ جانے والی شاہراہ پر واقع ہے سڑک کے بائیں برف مسجد ہے اس کے پیچھے کافی عمارات بن گئی ہیں۔ دائیں طرف خشک پہاڑ ہیں۔ سیاہی مائل۔ صدیوں کی بادصموم نے انہیں جھلس دیا ہے۔ بے شمار لوگ احرام باندھ رہے تھے۔ مسجد کے باہر غسل خانے بنائے گئے تھے۔ احرام باندھنے سے پہلے وضو ہونا افضل ہے۔ چونکہ اذان ہو رہی تھی اس لیے ہم نے جلدی سے وضو کیا اور مسجد میں داخل ہو گئے۔ کافی بڑی مسجد تھی۔ دو تین ہزار لوگ بیک وقت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ خواتین کے لیے اوپر والی منزل پر نماز کا الگ انتظام ہے۔ ہلکے سبز رنگ کے دبیز قالین بچھے تھے۔ امام کے سامنے اور دائیں بائیں مائیک لگائے گئے تھے۔ قریباً پانچ سو آدمیوں نے نماز پڑھی۔ حج کے دنوں میں ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ حرم شریف میں جا کر سجدہ ریز ہو مساجد میں دو کا ندار یا کچھ مقامی لوگ ہی نماز پڑھتے ہیں۔

جب ہم نماز پڑھ کر باہر نکلے تو دن کا ایک بن رہا تھا۔ لوگ ہنوز جوق در جوق آ کر احرام باندھ رہے تھے۔ میں نے اختر صاحب سے پوچھا۔ ''حدود حرم کے باہر تو اور بھی بہت سی مساجد ہیں اس مسجد کے لیے بالخصوص کیوں حکم دیا گیا ہے۔؟''

''بولے کہ ایسا کوئی واضح حکم نہیں ہے۔ حضرت عائشہ نے ایک موقعہ پر عمرہ کی خواہش کا اظہار کیا تو رسالت مآب نے اس جگہ بنی ہوئی مسجد میں احرام باندھنے کی اجازت دی۔ اس وقت سے یہ رواج پڑ گیا کہ احرام اسی جگہ سے باندھا جائے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ خیال راسخ ہوتا گیا۔''

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا رسول اکرم ﷺ بہت خیال رکھتے تھے ازواج مطہرات میں سب سے کم عمر

تھیں۔ ان کی عصمت کی گواہی خود ذات باری تعالیٰ نے دی تھی۔ یہ ہماری اسلامی تاریخ کا ایک المناک باب ہے کہ مفسدین اور دشمنان اسلام ان کے اور حضرت علی علیہ اسلام کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کا واحد مقصد نوزائیدہ دین کو زک پہنچانا تھا۔ جنگ جمل ہوئی ایک طرف ام المومنین تو دوسری طرف امیر المومنین۔ ایک طرف عائشہ بنت ابوبکر تو دوسری طرف سگا بھائی محمد بن ابی بکر۔ جنگ ختم ہوئی' ام المومنین کو وہی عزت و تکریم دی گئی جس کی وہ حقدار تھیں۔ لیکن مسلمانوں میں مناقشت کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل پڑا۔ جنگ صفین نے جنگ جمل کی کوکھ سے جنم لیا۔ واقعہ کربلا پیش آیا۔ حجاج بن یوسف نے مکہ پر سنگ و آتش کی بارش شروع کر دی جس سے خانہ کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچا۔ عبداللہ بن زبیر شہید ہوئے۔ جب کوفہ کے محل میں ان کا سر عبدالملک کو پیش کیا گیا تو ایک صحابی نے آہ کھینچی۔

''کیا بات ہے؟'' عبدالملک نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

''عجیب مکافات عمل ہے!'' صحابی بولا۔ ''اسی محل میں میں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر ابن زیاد کے سامنے دیکھا۔ پھر اسی جگہ ابن زیاد کا سر مختار ثقفی کی ٹھوکروں میں تھا۔ پھر یہیں مختار ثقفی کا سر عبداللہ بن زبیر کو پیش کیا گیا۔ آج عبداللہ کے سر کا نذرانہ آپ کو دیا جا رہا ہے۔'' کہتے ہیں اموی حکمران عبدالملک کانپنے لگا اور اس نے محل کو مسمار کرنے کا حکم دے دیا۔

طارق بن زیاد ہسپانیہ میں بیٹھا یورپ کو فتح کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے تو اس کو بلا جواز واپس بلوا لیا جاتا ہے۔ اگر محض ذاتی عداوت کی بنا پر محمد بن قاسم کو ہندوستان سے نہ بلوایا جاتا تو برصغیر کی تاریخ کسی اور ڈھنگ سے لکھی جاتی۔ متعصب ہندویوں مسلمانوں کے خون سے ہولی نہ کھیلتے۔ تین چوتھائی ہندوستان مسلمان ہو چکا ہوتا۔ دین مبین نے ہمیشہ پیار' محبت اور سچائی کا درس دیا۔ ہوس و اقتدار نے ہمیشہ ان اعلیٰ انسانی اقدار کو پامال کیا۔ عبداللہ بن علی نے مروان ثانی کو دریائے زب (Zab) کے کنارے فیصلہ کن شکست دے کر اموی اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ چار سو شاہی خاندان کے افراد تہہ تیغ ہو گئے۔ اپنی روایتی عیاری سے کام لیتے ہوئے اس نے صلح کا ڈھونگ رچایا۔ اس نے اموی شہزادوں کو دعوت طعام دی۔ کھانا لگایا جا رہا تھا رقص ابلیس شروع ہو گیا۔ اس کے چھپے ہوئے سپاہیوں نے قتل و غارت شروع کر دی۔ گھر بلائے ہوئے مہمانوں سے اس قدر بہیمانہ سلوک؟ مرتے اور بلکتے ہوئے زخمی مہمانوں پر چمڑے کی چادر ڈال دی گئی اور میزبان نے اپنے حواریوں کے ساتھ لاشوں پر بیٹھ کر دعوت اڑائی۔

اسی فاتح زب کو اپنے بھتیجے ابوجعفر منصور کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ چچا جان کو بڑے احترام کے ساتھ بغداد لایا گیا۔ آخر خون کا رشتہ جو تھا۔ ان کی بزرگی اور مرتبے کو دیکھتے ہوئے ایک شاندار محل بنوایا گیا جس کی بنیادیں نمک پر رکھی گئیں۔ پہلی ہی بارش سے محل

مسمار ہو گیا اور چچا جان سینکڑوں من ملبے میں دفن ہو گئے۔

مسجد سے نکل کر ہم کھانے کے قریبی ریسٹورنٹ البیک میں چلے گئے۔ البیک کو کنٹکی فرائیڈ چکن کی version کہا جا سکتا ہے۔ سارے سعودی عرب میں اس کی شاخیں ہیں۔ عرب اس کا چکن بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ ایک تو گوشت حلال ہوتا ہے پھر مقدار بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ریسٹورنٹ بند تھا۔ باہر لوگوں کی ایک کثیر تعداد قطار بنائے کھڑی تھی۔ ریسٹورنٹ کا عملہ نماز پڑھ کر واپس نہیں آیا تھا۔ حکومت نے ماحول ہی ایسا بنایا ہے کہ بغیر نماز پڑھے کوئی چارہ نہیں ہے۔ نماز کے وقت سب کاروبار بند ہو جاتا ہے۔ جب ہر کوئی نماز پڑھ رہا ہو تو پھر اس ماحول سے باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کوئی شخص بھی نہیں چاہے گا کہ اس پر انگلیاں اٹھیں یا وہ طنز و تشنیع کا نشانہ بنے۔ جب ایک دفعہ نماز کی عادت پڑ جائے تو پھر یہ جاتی نہیں ہے۔

ہمیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ عملہ بھی غالباً مسجد عائشہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اختر صاحب کہنے لگے آپ کوئی خالی ٹیبل سنبھالیں میں کھانا لے کر آتا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھانا لے آئے۔ کھانا خاصا مزیدار تھا اور وافر مقدار میں تھا۔ روسٹ چکن کے ساتھ روسی سلاد تھا۔ ڈبل روٹی تھی۔ سویٹ ڈش کے طور پر ایپل پائی تھی۔ پانی کے بجائے جوس کے ڈبے تھے۔ اشتہا بڑھانے کے لیے کئی قسم کی چٹنیاں تھیں۔

البیک بہت بڑی کمپنی ہے۔ اس کی سینکڑوں شاخیں ہیں۔ اس نے میکڈونلڈ اور کنٹکی فرائیڈ چکن کی بزنس کو بڑا متاثر کیا ہے۔ یہ کمپنی ارجنٹینا سے مرغیاں درآمد کرتی ہے۔ عرب کے پولٹری فارم اس کی ڈیمانڈ پوری نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی جب سے تیل دریافت ہوا ہے یہ چھوٹی موٹی تجارت نہیں کرتے۔ پولٹری فارم بنا کر کون اس کی بو سونگھتا پھرے؟

''ہماری اگلی منزل غار حرا اور ثور ہے۔'' اختر صاحب کہنے لگے۔ ''وقت زیادہ ہو گیا ہے۔ تمازت آفتاب کی وجہ سے شاید ہم اوپر نہ جا سکیں لیکن آپ کو نیچے سے ہی کافی اندازہ ہو جائے گا۔'' غار حرا مکہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ ہم واقعی اوپر نہ جا سکے۔ ہمیں اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اوپر اس قدر لوگ جا چکے تھے کہ غار میں سورج غروب ہونے تک داخل نہ ہو سکتے تھے۔ حکومت نے کوئی باقاعدہ راستہ نہیں بنایا۔ تنگ پگڈنڈیاں بل کھاتی ہوئی اوپر تک پہنچتی ہیں۔ راستے میں مشروبات کے کھوکھے ہیں۔ ارباب بست و کشاد کو ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ مسلمان شرک کے مرتکب نہ ہو جائیں۔ پچیس لاکھ لوگوں کی سوچ کو کیسے مصلوب کیا جا سکتا ہے۔ کوئی رکاوٹ، کوئی دیوار، کوئی حصار حصار عاشقان رسول کا راستہ نہیں روک سکتے۔

ہر چند کہ غار خاصی بلندی پر ہے لیکن نیچے سے پہاڑی کا آخری کونا صاف نظر آتا ہے۔ غار مکہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے اور

پہاڑ کی چوٹی دو تین ہزار فٹ بلند ہوگی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس غار میں بیٹھ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ بعض اوقات تو مہینوں وہاں جا کر قیام فرماتے اور مراقبہ کرتے۔ اشیائے خورد و نوش ساتھ لے جاتے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ غار حرا میں تحنث یعنی عبادت کیا کرتے تھے۔ یہ کونسی عبادت تھی جو وحی آنے سے پہلے ہی شروع ہو گئی تھی؟ غور و فکر اور عبرت پذیری۔ کارلائیل رقمطراز ہے ''دوران سفر ان کے دل میں کئی سوال پیدا ہوتے تھے۔ میں کون ہوں؟ یہ عالم کیسا ہے؟ نبوت کیا شے ہے؟ میں کن چیزوں کا اعتقاد کروں؟ کیا حرا' کوہ طور' کھنڈر اور میدان کوئی ان سوالات کا جواب دے پایا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔'' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پچیس برس کی عمر میں شادی کی۔ ان کی زوجہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بے پناہ دولت کی مالک تھیں۔ ان کے قافلے کا سامان تجارت سب عرب تجار کے قافلوں کو ملا کر بھی زیادہ ہوتا تھا۔ رسالت مآب عمر کے اس حصے میں تھے کہ جہاں زندگی امنگوں' جذبوں اور رنگوں سے عبارت ہوتی ہے۔ چاہتے تو انہیں زندگی کی ہر سہولت میسر ہو سکتی تھی۔ عیش و آرام ان کے لیے اپنا دامن دراز کر دیتے۔ شام' مصر' عراق سب ان کی پہنچ میں تھے۔ آخر کیا بات تھی کہ انہوں نے سب عیش و آرام تج دیا۔ ان دنوں جبکہ بجلی نہ تھی' ذرائع آمد و رفت محدود تھے۔ آب خنک تو کجا پانی کی فراہمی ہی ایک مسئلہ تھی۔ اشیائے خورد و نوش کو اٹھا کر لے جانا اور پکانا کار دارد تھا۔ ستوؤں کی پوٹلی اور پانی کی چھاگل لے جا کر اس تنگ و تاریک غار میں جس کے اردگرد حشرات الارض کی فوج منڈلاتی رہتی تھی' مہینوں تک انہماک اور غور و خوض ہر کس و ناکس کے بس کا روگ نہ تھا۔ یہ سب علامات پیغمبرانہ تھیں۔ ہر روش درویشانہ تھی۔ کائنات کے اسرار و رموز' اپنی قوم کی فلاح و بہبود' انہیں قعر مذلت سے نکالنا آپ کی سوچوں کا محور و مرکز تھا۔ پہاڑ کی چوٹی پر یہ غار عزم و یقین کی علامت ہے۔ یہ اسلامی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔ اس تک پہنچنے کا ہر مسلمان کو حق ہے اور وہاں تک بوڑھوں' بچوں اور عورتوں تک کو پہنچانا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ ساری دنیا میں اہم پہاڑوں کی چوٹیوں تک ٹرینیں چلتی ہیں۔ یہاں بھی با آسانی بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ وہاں تک پہنچنے میں کوئی شریک پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں جا کر بھی لوگ خدائے واحد کی عبادت کرتے ہیں' پتھروں کو نہیں پوجتے۔ اسلام کسی کی جاگیر نہیں ہے۔ اس میں ٹھیکیداری کی بھی ممانعت ہے۔ چند لوگوں کی سوچ ملت اسلامیہ کے اجتماعی شعور کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اسلام کو سمجھنے کے لیے اس انسان کامل کا احترام بے حد ضروری ہے جو اسے لایا اور جس نے لوگوں کی روح سے روشناس کرایا۔ آخر جائے ولادت کو لائبریری بنانے میں کیا تک تھی۔ لائبریری بھی وہ جس کو ہر وقت تالا لگا رہتا ہے۔ لوگ باب عبدالعزیز' فیصل اور فہد سے تو گزر سکتے ہیں لیکن اس چوکھٹ تک نہیں جا سکتے جہاں سے محسن انسانیت گذارا کرتے تھے۔ انسانی سوچ پر اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ پہرے بٹھانے کی کوششیں کی گئیں جو ناکام ہوئیں۔ یہ کاوش بھی با آل آخر نقش بر آب ثابت ہوگی۔ کیونکہ یہ تاریخ کا سبق ہے۔ ان قافلوں کو

کبھی کوئی روک نہیں سکا۔ رسول بڑے بھائی نہیں ہوتے۔ وہ جو قرآن لایا تھا اس نے لوگوں کو سمجھایا بھی تھا۔ ناطق قرآن۔ جس کا ہر عمل، ہر فعل، قرآن کی تفسیر تھا جو آج نہ ہوتے ہوئے بھی ہم ہی میں موجود ہے جس کو ہم صبح و شام سلام کرتے ہیں۔ درود بھیجتے ہیں، آ۔ شفاعت مانگتے ہیں۔ خدا تک پہنچنے کا یہی آسان ذریعہ ہے۔ جو پیغام لاتا ہے، پہنچاتا بھی وہی ہے۔ یہی مشیت ایزدی تھی۔ یہی راز پروردگار تھا۔ نہیں تو جو کن فیکون سے عام کائنات بنا سکتا ہے وہ چشم زدن میں سارا قرآن لوگوں کے دلوں میں اتار دیتا۔ سب پیغام اذہان میں سمو دیتا۔ کیا مشکل تھی؟ کوئی مشکل نہ تھی۔ غار ثور میں ہجرت کے وقت تین دن تک آپ نے حضرت ابوبکر کے ساتھ قیام فرمایا تھا۔ یہ غار مکہ سے تین میل داہنی جانب ہے۔ پہاڑ کی چوٹی ایک میل بلند ہے۔ ان گنت حاجی اس غار کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ کچھ تو پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچتے ہیں بعض تھک کر راستے سے لوٹ آتے ہیں۔ باقی نیچے کھڑے ہو کر شوق دید پورا کر لیتے ہیں۔ نیچے کئی دوکانیں کھل گئی تھیں۔ ریسٹورنٹ، فوٹو گرافر کی دوکان اور اشیائے خورد و نوش کے سٹور ہیں۔ کفار نے ابوجہل کے مشورے پر آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ میں ہر قبیلے کا فرد تھا۔ حکمت عملی یہ تھی کہ سب مل کر آنحضرت کو قتل کریں گے تاکہ بنو ہاشم کسی فرد واحد یا قبیلے سے انتقام نہ لے سکیں۔ جب آپ حضرت علی کو اپنے بستر پر سلا کر باہر نکلے تو نیند کفار کو اپنی آغوش میں لے چکی تھی پیشتر اس کے کہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہوتے آپ رفیق نبوت کے ساتھ غار ثور میں پہنچ گئے۔ مکہ چھوڑتے ہوئے آپ نے کعبہ پر نگارہ ڈالی تو آبدیدہ ہو گئے۔ فرمایا۔ ''مکہ تو مجھے ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہے لیکن تیرے فرزندوں نے مجھ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے۔'' آپ تیس دن غار میں رہے۔ بکریوں کے دودھ پر گزارا تھا۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ حضرت اسما بنت ابوبکر شام کو گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتیں۔ یہ روایت مشکوک ہے۔ اس وقت جبکہ جاسوس ہر گلی، کوچے اور راستے کو سونگھ رہے تھے یہ غالباً ممکن نہ تھا۔ تلاش کرتے کرتے ایک دفعہ تو وہ غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ حضرت ابوبکر متفکر ہوئے۔ آپ نہایت سکون سے فرمایا۔ ''گھبراؤ نہیں۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ اس سلسلے میں کچھ دیگر روائتیں بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مکڑی نے غار کے دہانے پر جالا بن دیا۔ ببول کا درخت اگا اور اس کی ٹہنیوں نے آنحضرت کو چھپا لیا۔ ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور انہوں نے گھونسلے بنا کر انڈے دیئے۔ حرم کے کبوتر انہی کبوتروں کی نسل سے ہیں۔ امام بخاری نے ان روایات کو ضعیف قرار دیا ہے۔ دراصل قریش کا خیال تھا کہ آپ سیدھے مدینے گئے ہونگے۔ اسی لیے انہوں نے سب راستوں کی ناکہ بندی کی اور وہیں تلاش جاری تھی۔ ساتھ ہی تلاش کرنے والے کے لیے سو اونٹوں کا انعام بھی رکھا۔ سراقہ بن جعشم تو آپ تک پہنچ بھی گیا۔ باوجود کوشش کے تیر نہ چلا سکا اور بال آخر تائب ہوا۔

سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے آپ نے مدینے پہنچنا تھا، پہنچ گئے۔ اسلام نے چار سو پھیلنا تھا سو پھیل گیا۔ اہل مکہ کو

بال آخر رسوا ہونا تھا' ان کی تذلیل ہوئی۔ ڈری ڈری سہمی ہوئی روشنی کی کرن بقعہ نور بن گئی اور تاریک صحرا منور ہو گیا۔

جہنم واپس پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ اختر صاحب مجھے اتار کر جدہ واپس چلے گئے۔ بلڈنگ کے گیٹ پر سائیں جندوڈہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ بولا۔ ''بڑی دیر کر دی آپ نے۔ مولانا صاحب کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

کھانا لگ چکا تھا۔ سب پارٹی موجود تھی۔ مولانا صاحب کہنے لگے۔ ''شکر ہے تم واپس آ گئے ہو۔ مجھے تو تشویش ہو چلی تھی کہ کہیں راستہ تو نہیں بھول گئے۔''

''یہاں تو بھولا ہوا بھی راہ راست پر آ جاتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

غاروں کی سیر کیسی رہی.....؟ مولانا مطیع الرحمن نے پوچھا۔ ''مکانوں کو مکین سے نسبت ہوتی ہے۔ جس جگہ نے آنحضرت کے پاؤں چومے ہوں وہ مرجع خلائق بن جاتی ہے۔''

''دراصل لوگ وہاں جا کر رونا شروع کر دیتے ہیں' یہ بات مناسب نہیں ہے!'' جنوبی افریقہ کے مولوی کڑوا دل کا غبار باہر نکالتے ہوئے بولے۔

''تو کیا ہنسنا شروع کر دیں۔ قہقہے لگائیں!'' میرے لہجے میں تاسف تھا۔ ''یہ تاریخی اور متبرک مقامات ہیں۔ ان کا احترام واجب ہے۔'' مولانا صاحب بات کا رخ موڑتے ہوئے بولے۔

احمد لمبات پوچھنے لگے۔ ''شاہ صاحب' آپ نے مجموعی تاثر کیا لیا ہے؟'' ''اسلامی تاریخ تو کئی دفعہ پڑھی ہے یہاں دکھائی دینے لگتی ہے۔ سننے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہوتا ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ گھر بیٹھے بیٹھے حج کرنے کا حکم دے دیتا۔''

''یہ بات درست ہے۔'' مولانا صاحب بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ ''کیفیت کو مقام سے ایک خاص نسبت ہے۔ Seeing is believing یہی اس جگہ کی خوبی ہے۔ مقام پر پہنچ کر آدمی اپنے گردوپیش سے بے نیاز ہو جاتا ہے صرف مکین نظر آتا ہے۔''

''سنا ہے آپ کے ملک کے ایک علاقہ صاحب کو تو غار حرا میں مکین نے انواع و اقسام کے کھانے کھلائے تھے؟'' ہانگ کانگ کے قاری طبیب نے ازراہ تفنن پوچھا۔ ''کیا یہ بھی کوئی کیفیت تھی؟''

''کیفیت اور واہمہ میں فرق ہوتا ہے۔ ایک اور پیر صاحب مریدوں کی معیت میں چلتے چلتے ہوا کو جبریل سمجھ کر اس سے بغلگیر ہو جاتے تھے۔''

قاری وحید گنگنانے لگے۔

نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا
ہر خرقہ سالوس کے اندر ہے مہاجن

''سائیں! ان باتوں کا ذکر تو ہوتا رہے گا۔ کھانا کھالیں ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' سائیں جندوڈہ کو غالباً بھوک ستا رہی تھی۔ سب نے بسم اللہ پڑھی اور کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر کمرے میں آئے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو احمد لمبات کھڑے تھے۔ بولے۔ ''ڈسٹرب تو نہیں کیا؟''

''ہرگز نہیں! آپ سے مل کر تو مسرت دوچند ہو جاتی ہے۔''

کہنے لگے۔ ''ابھی نوافل میں چند گھنٹے باقی ہیں' سوچا آپ سے چند باتیں ہو جائیں''

''پہلے میرا تجسس دور کیجئے!'' میں نے کہا۔ ''آپ جنوبی افریقہ میں سپریم کورٹ کے کامیاب وکیل ہیں۔ وہاں کی جوڈیشل کونسل کے ممبر ہیں یہ ایک دم ماہیت قلب کیسے تبدیل ہوئی؟

بولے؟ ''دیر و حرم کی قید کیا جس کو وہ بے نیاز دے۔ کئی سال قبل ایک دن مجھے اچانک محسوس ہوا جیسے سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے۔ باہر روشنی ہے لیکن اندر گھپ اندھیرا ہے۔ عیش و آرام کو بے یقینی نے نگل لیا ہے اس کشمکش میں ہی حج کے لیے آ گیا۔ دفعتاً ایسے لگا جیسے متلاطم سمندر کی موجوں نے مجھے ساحل مراد پر پھینک دیا ہو۔ اندھیرا خود بخود چھٹنے لگا۔ وجود سے پھوٹتی ہوئی روشنی نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ اب میں ہر سال یہاں آتا ہوں۔ ہر دفعہ نئی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ روح کو بالیدگی ملتی ہے۔ سال کے بقیہ ایام سکون سے کٹ جاتے ہیں۔''

''آپ جنوبی افریقہ کب آئے؟''

بولے۔ ''ایک طویل عرصہ ہو گیا ہے۔ ہم بچے تھے کہ والد صاحب نے ہندوستان سے نقل مکانی کی۔''

''سنا ہے وہاں پر نسلی تعصب بہت زیادہ ہے؟''

''تھا! اب خاصی کمی آ گئی ہے۔ سفید فام لوگوں نے مقامی آبادی پر بے پناہ ظلم ڈھائے۔ یہ غالباً واحد ملک تھا جہاں پر نسلی برتری کو ریاستی پالیسی کے طور پر اختیار کیا گیا۔ ہر وہ شخص جس کی چمڑی سفید نہیں تھی ان کے نزدیک اچھوت تھا۔ قابل نفرت تھا۔ غلام تھا۔ گاندھی جی کے ساتھ انہوں نے جو سلوک کیا وہ تو آپ نے پڑھا ہی ہوگا۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے سے ٹھوکریں مار مار کر نیچے گرا

دیا۔ یہاں پر اٹھتی ہوئی ہر گردن کاٹ دی جاتی تھی اور بڑھتے ہوئے قدم توڑ دیئے جاتے تھے۔ مظلوم انسانوں کو ان کے خونخوار کتے بھنبھوڑتے تھے۔"

"بال آخر انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے!"

کہنے لگے "جب محکوم قوموں کا لہو گرم ہو جاتا ہے' جب اجتماعی شعور بیدار ہوتا ہے تو پھر ان کا راستہ روکنا مشکل ہو جاتا ہے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی کوئی حفاظتی دیوار نہیں ٹھہرتی۔

"باایں ہمہ مقامی لوگوں نے بدلہ نہیں لیا؟"

"اس کا کریڈٹ نیلسن منڈیلا کو جاتا ہے۔ تیس سال اس کو قید تنہائی میں رکھا گیا۔ ایک طویل عرصہ تک اس نے روشنی کی کرن نہیں دیکھی۔ اس کے ساتھ نہایت بہیمانہ اور وحشیانہ سلوک کیا گیا لیکن برسر اقتدار آتے ہی اس نے عام معافی کا اعلان کیا۔ ایسے انسان صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے تحمل' رواداری' محبت اور یقین نے مجسم شکل اختیار کر لی ہو۔"

"اس نے اقتدار کیوں چھوڑ دیا؟" میں نے پوچھا۔

"دنیا کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی مقبولیت عروج پر تھی کہ وہ از خود دست بردار ہو گیا۔"

"کاش ہمارے حکمران بھی کبھی ایسے طرز عمل کا مظاہرہ کرتے۔ میں نے سوچا۔ ہماری پچپن سالہ تاریخ کس قدر داغدار ہے۔ بابائے قوم کے ساتھ آخری لمحوں میں کیا سلوک کیا گیا۔ وہ بے مروت اور احسان فراموش بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئے۔ جاں بلب غلام محمد سے سکندر مرزا نے بندوق کی نوک پر استعفا لیا۔ سکندر مرزا کو جوانوں نے تھپڑ مار کر رخصت کیا۔

مسلسل جلسوں اور جلوسوں کے بعد ایوب خان کو احساس ہوا کہ "آمر بوڑھا ہو گیا ہے۔ یحییٰ خان سے جب لیلائے اقتدار چھینی گئی تو وہ نیم پاگل ہو گیا۔ بھٹو کو تختہ دار پر لٹکایا گیا۔ ضیاء الحق کے ساتھ کیا ہوا۔ بے نظیر اور نواز شریف بھی رخصت ہوئے۔

احمد لمبات سے کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ شرعی امور کے علاوہ نہیں قانون' منطق' فلسفہ' اور تاریخ پر بھی خاصا عبور تھا۔ اپنے دلکش لہجے میں میری معلومات میں اضافہ کرتے رہے۔ کمرے میں رخصت ہوتے وقت مجھے ساؤتھ افریقہ آنے کی دعوت دی۔ کہنے لگے مارچ میں کرکٹ کپ ہو رہا ہے۔ آپ ضرور آئیں۔ میں آپ کو سپانسر شپ لیٹر بھجوا دوں گا۔

۸ ذلحج جسے یوم الترویہ کہتے ہیں' کی صبح کو ناشتہ کے بعد مولانا صاحب نے مجھے کمرے میں بلایا۔ کہنے لگے۔ "آج شام احرام باندھنا ہے اور منیٰ کے لیے روانگی ہے! قاری وحید امریکہ سے پچاس ڈاکٹروں اور انجینیرز کا ایک گروہ لایا ہے ان کے بچے بھی ساتھ

ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس میں شامل ہو جائیں!''

''میں سمجھا نہیں!'' مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ ''میں تو آپ کی معیت میں حج کرنا چاہتا ہوں۔ شرعی مسائل کو سمجھنا' شرع پر عمل کرنا بھی تو ضروری ہے۔ تمام علمائے کرام آپ کے ہمراہ ہونگے کسی غلطی کا امکان نہیں رہے گا۔''

کہنے لگے'' یہ تمہارا پہلا حج ہے۔ تین میل کا مختصر سفر بڑا طویل اور پر آشوب ہے۔ پچیس لاکھ حاجیوں نے ایک ہی دن میں منیٰ پہنچنا ہے۔ سسکتی ہوئی گاڑیاں چلتی نہیں رینگتی ہیں' مورنا تواں کے مانند۔ باہر غضب کی گرمی' اندر حبس۔ پچاس سیٹوں والی گاڑی میں سو حاجی بیٹھتے ہیں۔ گاڑیوں کے انجن مسلسل ڈکراتے ہیں۔ ان کی روں' روں اور بھوں بھوں میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔''

''آخر آپ کو بھی تو جانا ہے۔ ایک دن کی تکلیف میرے لیے کچھ معانی نہیں رکھتی۔ زندگی کے طویل سفر میں ایسے بے شمار دن آتے ہیں۔''

''اس کی ایک اور وجہ بھی ہے!'' مولانا صاحب کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ ''امریکہ میں بسنے والے مسلمان ایک مخصوص ماحول میں اپنے شب و روز گزارتے ہیں۔ اسلام سے محبت رکھنے کے باوجود اس کی تاریخ سے پوری طرح واقفیت نہیں رکھتے۔ میں چاہتا ہوں کہ نماز عصر کے بعد تم اسلام' سیرت اور بنیاد پرستی پر انہیں لیکچر دو۔ چند باتیں اگر وطن عزیز کے متعلق بھی ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔''

اس کے لیے آپ سے بہتر کون شخص ہو سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''یہ ممکن نہیں۔ میرے ساتھ پچیس تیس علمائے کرام کا وفد ہوگا۔ اتنے لوگوں کو وہاں نہ تو لایا جا سکتا ہے اور نہ اس کی گنجائش ہے'' مولانا صاحب کا مشورہ حکم کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ میں نے ہامی بھری..... وہ دن عملاً میں نے حرم شریف میں گزارا۔ دن کا کھانا بھی ملحقہ ریسٹورنٹ کینٹکی فرائیڈ چکن میں کھایا۔ میرے دوست خلیل بھٹی صاحب ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں جا کر ان کا پتہ کیا لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ ہوٹل انتظامیہ نے بتایا کہ وہ مدینہ منورہ سے سیدھے منیٰ جائیں گے..... نماز ظہر اور عصر میں نے حرم شریف میں پڑھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حرم کی توسیع اور تزئین و آرائش میں حکومت نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس سے ملحقہ بے شمار ہوٹل اور عمارات گرا کر صحن کی توسیع کی گئی ہے۔ صفائی کا نہایت اعلیٰ انتظام ہے۔ آب زم زم اس قدر وافر مقدار میں موجود ہے کہ لاکھوں لوگ بھی اسے ختم نہیں کر سکتے۔ ستے خالی کولرز کو ہر وقت بھرتے رہتے ہیں۔ اتنی بڑی عمارت کی ایئر کنڈیشننگ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ حرم کے اندر ہزاروں فانوس ہیں جن میں لاکھوں بلب جگ مگ کرتے رہتے ہیں۔ مجال ہے کہ ایک بلب بھی فیوز ہو

جائے۔ بن لادن کمپنی کی ذمہ داری ہے کہ فوراً جلے ہوئے بلب کو تبدیل کرے نہیں تو بھاری جرمانہ ہوتا ہے۔ ترک تعمیر والا حصہ حرم کے چاروں طرف ہے۔ یہ اتنا بڑا نہیں لیکن منفرد طرز تعمیر کی وجہ سے دامن نگاہ تھامتا ہے۔ برسات میں حرم کی چھتوں سے بسا اوقات پانی رسنے لگتا ہے لیکن سینکڑوں سال گزرنے کے بعد بھی ان بھورے رنگ کے مخروطی گنبدوں سے ایک بوند بھی نہیں ٹپکی۔ طرز تعمیر کے علاوہ شاید اس میں سلاطین کی عقیدت بھی شامل تھی۔

کسی زمانے میں بارش کا پانی سارے صحن میں جمع ہو جاتا تھا۔ چونکہ مکہ کے چاروں طرف پہاڑ میں اس لیے برسات کا پانی کسی شوریدہ سر ندی کی مانند حرم شریف پر یلغار کرتا۔ ایک دفعہ تو اس قدر پانی جمع ہو گیا کہ طواف رک گیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک اژدہا اس پانی میں تیرتا ہوا طواف حرم کر رہا ہے۔

حج طلوع اسلام سے پہلے بھی ہوتا تھا لیکن اس میں کئی بدعتیں شامل ہو گئی تھیں۔ خانہ کعبہ ۳۶۰ بتوں سے اٹا پڑا تھا۔ مرد و زن برہنہ حج کرتے تھے۔ مکہ ۸ھ میں فتح ہوا۔ چونکہ امن امان پوری طرح بحال نہیں ہوا تھا اس لیے اس سال بھی مشرکین نے امور حج سر انجام دیے۔ مسلمانوں نے امیر مکہ حضرت عتاب بن اسید کے ساتھ فریضہ حج ادا کیا۔ ۹ھ میں کعبہ بتوں سے پاک ہو گیا تو رسول اکرم نے حضرت ابوبکر کی سرکردگی میں تین سو مسلمانوں کا وفد حج کے لیے بھیجا۔ اس میں حضرت ابوبکر کی سرکردگی میں تین سو مسلمانوں کا وفد حج کے لیے بھیجا۔ اس میں حضرت علی حضرت سعد بن ابی وقاص حضرت جابر اور حضرت ابوہریرا شامل تھے۔ قربانی کے لیے بیس اونٹ بھی لائے گئے۔ قرآن نے اس حج کو حج اکبر کہا ہے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ رسم حج سنت ابراہیمی کے مطابق ادا کی گئی۔ رسم کہن مٹا دی گئی اور اسلام کے تعلیمات کے مطابق مناسک حج ادا ہوئے۔

شام کو جب میں واپس آیا تو سارے لوگ احرام باندھ چکے تھے۔ شبیر نے کہا کہ میں بھی غسل کر کے احرام باندھ لوں۔ کھانے کے بعد وہ مجھے اس ہوٹل میں چھوڑ آئے گا جہاں امریکی مسلمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں نے غسل کر کے احرام باندھا اور دو رکعت نفل پڑھے۔ اس اثنا میں مولانا صاحب بھی بیدار ہو چکے تھے اور سائیں جندوڈہ نے کھانا لگا دیا تھا۔ کھانے کے دوران میں نے مولانا صاحب سے کچھ شرعی مسائل پوچھے۔ میرا خیال تھا کہ نماز ظہر' عصر' مغرب' عشاء اور ۹ ذی الحج کی نماز فجر منیٰ میں پڑھنی چاہئیں۔ مولانا صاحب نے بتایا کہ یہ افضل ہے لیکن ضروری نہیں۔ چونکہ حاجی کثیر تعداد میں ہوتے ہیں اس لیے ان کی اکثریت علی الصبح ہی منیٰ روانہ ہو جاتی ہے۔ رسالت مآب نے چونکہ منیٰ میں قیام کیا تھا اس لیے یہ سنت ہے' نہیں تو اہل مکہ منیٰ میں قیام کئے بغیر ہی عرفات میں پہنچتے ہیں۔ گیارہ بجے رات کو میں نے اپنا سفری بیگ اٹھایا اور شبیر کے ساتھ قاری وحید صاحب کو ملنے چلا گیا۔ قاری

صاحب کا ہوٹل حرم کے بالکل قریب تھا۔ مجھے ویسے ہی اندیشہ ہو رہا تھا کہ ہم لیٹ ہو گئے ہیں۔ جب ہوٹل کی لابی میں پہنچے تو روانگی کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔

کہیں ہم غلط جگہ پر تو نہیں آ گئے؟ میں نے شبیر سے پوچھا۔ یہ میرا فہم نہیں بلکہ شوق اور جنون بول رہا تھا۔ منیٰ پہنچنے کی شدید خواہش کروٹ پہ کروٹ لے رہی تھی۔

''جگہ تو وہی ہے!'' شبیر کہنے لگا۔ ''آج شام ہی ہم نے یہاں ایک امریکن ڈاکٹر کی دعوت ولیمہ میں شمولیت کی ہے۔ ڈاکٹر نے والدین کے اصرار پر امریکہ میں شادی کرنے کے بجائے حرم شریف میں مولانا مکی سے نکاح پڑھوایا اور پھر دوسرے روز ہی اپنے سر کو بالوں کے بوجھ سے آزاد کر دیا۔

وہ بڑا روح پرور منظر تھا۔ لوگ بڑی حیرت اور شوق سے اس نوجوان جوڑے کو دیکھ رہے تھے جو سات سمندر پار سے حرم کعبہ میں ایجاب وقبول کی منزل سے گزر رہا تھا۔ ہم لابی میں بیٹھ گئے۔ وحید صاحب سے ان کے موبائیل پر بات کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ جب ایک گھنٹہ گزر گیا تو میں نے شبیر کی طرف دیکھا۔ اب کیا کیا جائے؟''

ڈرائی فروٹ کھایا جائے اور جوس پیا جائے۔'' وہ مسکرایا اور باہر جا کر نصف کلو بادام' پستہ اور کاجو لے آیا۔ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔'' میں نے رسماً کہا۔

''وقت تو گزارنا ہے۔ لگتا ہے امریکی مسلمان سو گئے ہیں۔''

''اس وقت کوئی مسلمان سو نہیں سکتا' شاید ہم پہلے اگئے ہیں۔''

بولے ''ہم بروقت پہنچے ہیں۔ امریکیوں نے ہی دیر کر دی ہے۔'' ہم باتیں کر رہے تھے کہ ہوٹل کے مرکزی دروازے سے وحید صاحب اندر آتے دکھائی دیئے۔ معذرت کرتے ہوئے بولے۔ ''بسوں کے حصول میں دیر ہو گئی ہے۔ آپ تشریف رکھیں میں سب حاجیوں کو نیچے لاتا ہوں۔''

رات دو بجے بس چلی' روانگی سے قبل لابی میں وحید صاحب نے سب سے میرا فرداً فرداً تعارف کرایا۔ پاکستان کے علاوہ ہندوستان' بنگلہ دیش اور امریکی مسلمان بھی اس گروپ میں شامل تھے لیکن اکثریت پاکستانیوں کی تھی۔ ان کے لب ولہجے سے لگتا تھا کہ وہ امریکہ میں ایک طویل عرصے سے مقیم ہیں۔ مہذب' معقول پڑھے لکھے ہیں لیکن اس مادی ماحول میں رہنے کے باوجود اسلام کی محبت دل سے نکل نہیں پائی۔ قریباً سب اپنی بیگمات کے ساتھ آئے تھے۔ کچھ لوگ بچوں کو بھی ہمراہ لائے تھے۔ سب لوگ بیٹھ گئے تو

قاری صاحب نے گنتی کی۔ جب انہیں اطمینان ہوگیا کہ کوئی باقی نہیں رہ گیا تو انہوں نے عربی زبان میں ڈرائیوروں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ائیر کنڈیشنڈ بسوں کے انجن گڑگڑائے اور بسیں ایک دھچکے کے ساتھ منیٰ روانہ ہوگئیں۔ رات کا وقت تھا۔ مسافروں پر غنودگی چھائی ہوئی تھی۔ نیم خوابیدہ آنکھوں کے ساتھ وہ بس کی سیٹوں پر جھول رہے تھے۔ راستے میں اس قسم کا رش نہیں تھا جس کی پیشین گوئی کی گئی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ تو قاری وحید کا تجربہ تھا۔ انہیں پتہ تھا کہ رات کے دو بجے رش بتدریج کم ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ وہ گذشتہ پندرہ سالوں سے سال میں دو مرتبہ حج اور عمرہ کرنے والے مسلمانوں کے گروپ لاتے ہیں۔ عرب نفسیات اور ہر شاہراہ سے شناسا ہیں۔ رہائش کہاں رکھنی چاہیے۔ اعلیٰ ٹرانسپورٹ کہاں ملتی ہیں' کونسی شاہراہ پر کس وقت کتنا رش ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے امریکہ کے مسلمانوں میں ان کی کمپنی کی مشہوری ہے۔ نیویارک' لاس اینجلس' شکاگو' ٹیکساس' میامی' فلوریڈا سے لوگ ان سے رابطہ کرتے ہیں۔ یہ بھی کسی کو مایوس نہیں کرتے۔ مسائل حل کرنے میں ید طولے رکھتے ہیں۔

صبح کے چار بجے بسیں منیٰ میں داخل ہوئیں اور ان خیموں کے سامنے رک گئیں جن کی پیشانی پر ایک بہت بڑا سرخ بورڈ لگا تھا۔ Passenger's from USA- سعودی حکومت امریکی مسلمانوں کو نسبتاً زیادہ سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ سپر پاور کے شہری بھی سپر ئیر superior ہوتے ہیں۔ حکومتیں ان کی ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کرتیں۔ زیادتی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بسوں سے نکلنے اور خیموں تک پہنچنے میں ہمیں نصف گھنٹہ لگ گیا۔ جو دو خیمے ہمیں ملے تھے ان میں سے ایک تو خواتین کے لیے مختص کر دیا گیا دوسرے مردوں کو ٹھہرایا گیا۔ فرش پر دریاں بچھی تھیں جن پر فوم کے گدے تھے۔ جگہ یقیناً تنگ تھی لیکن Exclusive تھی۔ خیموں کے بالمقابل چھوٹے خیموں میں چائے' کافی اور پانی کا بندوبست تھا۔ سارے منیٰ میں جو خیمے نصب کئے گئے ہیں وہ فائر پروف ہیں' مستقل ہیں اور ائیر کنڈیشنڈ ہیں۔ خیموں کے عقب میں حاجیوں کی تعداد کے مطابق ٹائیلٹ ہیں۔ کافی غسل خانے بنائے گئے ہیں اور وضو کرنے کا نہایت اعلیٰ انتظام ہے۔ میں نے سامان رکھ کر وضو کیا اور پھر قریبی خیمے میں کافی کا ایک کپ پیا۔ اتنے میں نماز کا وقت ہوگیا۔ قاری عبدالوحید نے خیمے میں ہی نماز پڑھائی۔ نماز پڑھ کر اکثر لوگ سو گئے۔ میں نے بھی سونے کی کوشش کر گئی تھی۔ یہ جہاں جسم کو سکون پہنچاتی ہے وہاں باغ کو بھی جھنجھوڑ دیتی ہے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور خیمے سے باہر نکل آیا۔ بائیں ہاتھ مڑ کر کوئی فرلانگ ہی چلا تھا کہ سامنے ایک کھلی جگہ نظر آتی۔

پٹرول پمپ کے ساتھ بے شمار ریسٹورنٹ کھلے ہوئے تھے۔ اس اثنا میں سورج کی ڈری ڈری کرن نے ایک دو مرتبہ جھانکا اور پھر مشرق کی جانب نور تھوں والے شاہ خاور کی سواری نظر آئی۔ سورج اپنی آب و تاب اور تمام تر توانائیوں کے ساتھ طلوع ہوگیا تھا۔

میں نے قریبی چٹان پر کھڑے ہو کر منیٰ پر نظر ڈالی تو حیرت کے در ایک ایک کر کے کھلنے شروع ہو گئے۔ حد نگاہ تک سفید خیمے نصب تھے۔ پہاڑی کی چوٹی پر' کھلے میدان میں' چار سو خیمہ بستی آباد تھی۔ ایک شہر آرزو جو چشم زدن میں آباد ہو گیا تھا۔ ہوٹل' ریستوران' جنرل سٹورز' ٹیلی فون ایکسچینج' بجلی گھر' پی۔سی۔او' جنرل بس اسٹینڈز' مساجد' فروٹ شاپس' ہسپتال' ڈسپنسریاں' سرکاری دفاتر' پہاڑ کی چوٹی پر بنے محلات۔ روم کو بننے میں صدیاں لگی تھیں اس پل بھر میں بسنے اور اجڑنے والے شہر کے پیچھے صدیوں کی تاریخ تھی۔ کئی ہزار برس پہلے حضرت ابراہیم علیہ اسلام اس جگہ کس شان کے ساتھ آئے تھے۔ ایک ہاتھ میں چھری دوسرے میں فرزند عزیز' چہرے پر وثوق اور تیقن۔ بیٹا بھی آخر کس باپ کا تھا۔ ثابت قدم رہا۔ چال جیسے کڑی کمان کا تیر۔ کوئی لغزش پا نہ تھی۔ باپ کے خواب کو حکم ربی سمجھا۔ ابلیس نے شکوک وشبہات کی دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کی۔ ''تمہارا باپ سٹھیا گیا ہے۔ اسحاق ہوتا تو ہرگز ایسی حرکت نہ کرتا۔ کیا سارہ اس کو اجازت دیتی؟ اب بھی وقت ہے کہ بوڑھے ہاتھوں سے خنجر چھین لو' خبطی کو اس فعل سے روکو۔ ذرا سوچو' جب تمہاری دکھیاری ماں خاک اور خون سے لت پت تمہاری سر بریدہ لاش دیکھے گی تو اس پر کیا گزرے گی۔ سینے پر دو ہتڑ مار کر وہ غش کھا کر گرے گی۔ ایک گھر سے بیک وقت دو جنازے اٹھیں گے۔ لوگ کیا کہیں گے۔ خاک نشینوں کا خون تھا رزق خاک ہوا۔ تم ابھی جوان ہو' خوبصورت ہو' تم نے زندگی میں بہت کچھ دیکھنا ہے' کرنا ہے۔ اس جاں کو اس قدر ارزاں مت بناؤ۔''

''دور ہو جاؤ۔ ملعون۔ حضرت اسمٰعیل نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ جان دی کس کی ہوئی ہے۔ ذرا اپنے اندر جھانکو۔ تمہاری بھی کیا زندگی ہے حیات بے مصرف راندہ درگاہ۔ معتوب پروردگار۔ تم موت سے پہلے بھی کئی لاکھ مرتبہ مرو گے..... ''ایثار کا وہ ایک لمحہ تاریخ کے سینے پر نقش ہو گیا۔ آج بوڑھا ابراہیم نہیں ہے لیکن رسم جوان ہے۔ اسمٰعیل نہیں ہے لیکن وہ قربانی ایک سمبل بن گئی ہے۔

اس کے نام کی قربانی دی جا رہی ہے۔ کروڑوں لوگ ہر سال یہاں آتے ہیں اور انہیں یاد کرتے ہیں۔ میری مضطرب نگاہیں چار سو دوڑ گئیں۔ یہی وہ میدان تھا جہاں رسالت مآب نے ایک لاکھ لوگوں کے ساتھ اپنی ظاہری حیات مستعار کا آخری حج کیا تھا۔ وہ کونسی جگہ تھی جہاں حضور نے قیام فرمایا تھا۔ زمین کا وہ کونسا ٹکڑا تھا جہاں وہ خدائے لم یزل کے حضور سر بہ سجود ہوئے تھے۔ وہ آواز کدھر بکھر گئی ہے جو دہن مبارک سے نکلی تھی۔ قدموں کی وہ چاپ کیوں سنائی نہیں دیتی جو سراسر موسیقیت تھی۔

منیٰ تو محض ایک خیمہ بستی نہیں ہے بلکہ اسلام کی مکمل تاریخ ہے۔ تمہارے چٹیل میدانوں نے لاکھوں ذہنوں کو ہریالی بخشی ہے۔ تمہاری تاریک راہوں نے کروڑوں قلوب کو منور کیا ہے۔ تمہاری طرف بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں نے گنہگاروں کو صراط مستقیم دکھایا

ہے۔ وہ شیطان جس نے ساری دنیا میں فساد پھیلا رکھا ہے اور دندناتا پھرتا ہے یہاں آ کر بے بس ہو گیا ہے جو لعن طعن اور سنگباری اس پر ہوتی ہے وہ تاریخ عبرت کا ایک اہم حصہ ہے۔ اپنے انجام کا اگر اسے رائی بھر بھی گمان ہوتا تو شاید حکم عدولی نہ کرتا' فوراً آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا۔

میں بہت دیر تک تاریخ کے حصار میں رہا۔ کافی دیر منیٰ میں پھرتا رہا۔ ایک بے نام سی خواہش' ایک موہوم سا خیال۔ شاید کہیں حضور کے قدموں کا نشان مل جائے۔ شاید کوئی بکھری ہوئی آواز سنائی دینے لگے۔ اڑتی ہوئی خاک کا کوئی جھونکا میرے جسم سے مس ہو جائے۔ جب میں واپس آیا تو نماز ظہر کا وقت ہو رہا تھا۔ قاری وحید نے میری حیرت سے دیکھا ''کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میں کافی دیر سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔'' مولانا صاحب کا دو مرتبہ فون آ چکا ہے۔ انہوں نے یاد دہانی کرائی ہے کہ آج نماز عصر کے بعد آپ نے امریکیوں کو لیکچر دینا ہے۔

''یہ تو اپنے بھائی بند ہیں' امریکی کیسے ہو گئے؟''

''اپنے بھائیوں نے امریکی شہریت اختیار کر لی ہے ان میں یہ مولوی بھی شامل ہے۔'' انہوں نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ ''لیکن امریکہ میں رہتے ہوئے بھی ان کے دل مومن ہیں۔ عشق رسول سے سرشار ہیں اور اسلام کے ساتھ ان کی وابستگی پختہ ہے۔''

''تو پھر میں ان کی معلومات میں کیا اضافہ کر سکتا ہوں۔''

بولے۔ ''مجھے اس کا علم نہیں۔ یہ مولانا صاحب کا حکم ہے جس کی تعمیل بہر طور پر مجھے اور آپ کو کرنی ہے۔''

کہتے ہیں حکم حاکم مرگ مفاجات ہوا کرتا ہے لیکن عالم دین کا فرمایا فرض ہوتا ہے۔ میری اس سے بڑی اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی کہ خطیب حرم نے مجھے اس قابل سمجھا تھا۔

نماز عصر کے بعد قاری وحید نے میرا مختصر تعارف کرایا۔ اس سے پہلے دو امریکی حبشیوں نے اپنے مسلمان ہونے کی وجوہ بتائیں۔ ان کی مختصر تقریریں بڑی متاثر کن تھیں کیونکہ ہر لفظ دل کے نہاں خانوں سے نکل رہا تھا۔ انہوں نے یورپ کی مادیت پرستی کا ذکر کیا جس نے نئی نسل کا سکون غارت کر دیا ہے۔ دنیا کے دیدہ مذاہب کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ سب درد اور دکھوں کا مداوا اسلام میں ہے۔ دین مبین جو زندگی میں توازن پیدا کرتا ہے' ذہنی خلفشار دور کرتا ہے۔ آدمی کو انسان بناتا ہے۔ وہ ایک سجدہ جو ہزار سجدوں سے نجات دلاتا ہے۔

میں نے چالیس منٹ تک اسلام' بنیاد پرستی اور پاکستان کے متعلق اظہار خیال کیا۔ رسالت مآب کی شخصیت کا تقابلی جائزہ پیش

کیا۔ بطور ایک رسول اور انسان کامل کے وہ کاروان رسالت کے قافلہ سالار تھے۔ بطور ایک انسان' حکمران اور سپہ سالار اپنی مثال آپ تھے۔ کسی رسول کی شخصیت میں دین اور دنیا کا ایسا حسین امتزاج نہیں ملتا۔ امتحان کی کٹھن گھڑیوں میں ہر نبی نے پناہ مانگی۔ مدد ایزدی کے طلب گار ہوئے۔ دعائیں طائف کے زخمی نے بھی مانگی تھیں لیکن اپنے لیے نہیں بلکہ ان کے لیے جو حضور کی جان کے درپے تھے' آپ کے ازلی دشمن تھے' جو دین مبین کا برسر عام مذاق اڑاتے تھے۔ ایک نامور یہودی مورخ فلپ کے حتی نے آپ کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

With in the brief span of his mortal life Muhammad (*Sall Allaho Elehe Wassalam*) called forth out of unpromising material, a nation, never united before into a country which was hiterto but a geographial expression, Himself an unschooled person he was nevertheless responsible for the introduction of a book which is still considered by one eight of manking as embodiment of all science wisdom and theology.

''اپنی حیات مستعار میں انہوں نے ایک بکھری ہوئی قوم کی شیرازہ بندی کی اور اسے سیاسی وحدت کی لڑی میں پرو دیا۔ ایک جغرافیائی اکائی کو ملک بنا دیا۔ کسی درسگاہ میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کرنے کے باوصف ایک ایسی کتاب دی جسے انسانوں کا ایک بہت بڑا حصہ تمام علوم' اخلاقیات و ادراک کا مخزن سمجھتا ہے۔''

''ان مختصر جملوں میں ایک دریائے معانی پوشیدہ ہے۔ لطیف اشارے ہیں۔'' میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہر نبی کوئی نہ کوئی اعجاز لایا۔ کسی نے مردوں کو قم باذن اللہ کہہ کر زندہ کیا تو کسی کے عصا نے فرعون کو بے سروسامان کر دیا۔ کوئی اپنے تخت پر فضاؤں کی سیر کرتا تھا تو کسی کے بخت عزیز مصر کے محلوں میں جاگے۔ آنحضرت کا اس سے بڑا اعجاز اور کیا ہو سکتا تھا کہ انہوں نے ایک مردہ قوم کو حیات نو بخشی۔ امی ہونے کے باوصف ایک ایسی کتاب دی جس کی حفاظت کا ذمہ خود پروردگار نے لیا ہے۔ ایک ایسی کتاب جس میں کوئی گرائمر کی غلطی نہیں ہے۔ کوئی Constructional Error نہیں ہے جو فصاحت اور بلاغت کا نادر نمونہ ہے۔ جو کو لوگ حرف بحرف حفظ کر سکتے ہیں۔ جس کے متعلق عکاز کے میلے میں تمام عرب شعرا نے بیک زبان کہا تھا کہ یہ کلام بشر نہیں ہے۔ آپ کے قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ ساری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی۔ ایک ایسی کتاب جس کا ہر حرف ایک ورق تھا۔ ہر ورق ایک زریں اور درخشاں باب۔ آپ نے نہ صرف شاہی میں فقیری کی بلکہ فقر کو شاہی سے ہمکنار کر دیا۔ غلاموں کو شاہوں کا ہمرتبہ بنا دیا۔ اگر یقین نہیں آتا تو پوچھو بلال سے۔

ایک دن توتلی زبان میں اذان کی آواز نہیں آئی تو رسالت مآب پوچھتے ہیں۔ ''فاطمہ بیٹی کیا بات ہے۔ آج بلال نے اذان نہیں دی۔'' دراصل غلامی کا خاتمہ اس ایک استفسار نے کر دیا تھا۔ شاہ دو عالم کے گھر کئی کئی روز کھانے کو نان جریں نہیں ہوتا تھا۔ مدینہ میں خندق کھودتے ہوئے جب ایک صحابی نے بھوک کی شکایت کی تو وہ آپ کے پیٹ پر بندھے ہوئے پتھر دیکھ کر حیران رہ گیا۔

ڈاکٹر بڑی حیرت اور عقیدت کے ساتھ میری باتیں سن رہے تھے۔ ''آج جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے وہ تاریخ سے تعصب برتتے ہیں۔ آپ برصغیر کی مثال ہی لے لیں۔ قلوب کی تسخیر علمائے دین نے کی۔ مجدد الف ثانی' خواجہ اجمیر چشتی' نظام الدین اولیاء' داتا گنج بخش' سید علی ہمدانی۔۔۔۔۔۔ بادشاہوں نے تو الٹا زک پہنچائی۔ دین الٰہی کا فتنہ کس نے کھڑا کیا تھا۔ بھائی کو بھائی سے کس نے لڑوایا تھا؟ ہندو رانیوں کی کوکھ سے جنم لینے والا شخص بھلا اسلام کی کیا تبلیغ کرتا۔ یہی حال یورپ اور افریقہ کا تھا۔ آج جو یورپ اور امریکہ میں لوگ دھڑا دھڑ اسلام قبول کر رہے ہیں اس میں کونسی شمشیر کا دخل ہے؟ جیسے جیسے انسان بیدار ہو رہا ہے مغربی حکومتوں کی تشویش میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ فنڈامینٹل ازم' بنیاد پرستی! آخر یہ ہیں کیا؟ اس کا غالباً انہیں بھی پتہ نہیں جن کے ذرائع ابلاغ دن رات ایک ہی رٹ لگائے جا رہے ہیں۔ اگر بنیاد پرستی سے مراد خوف خدا' نماز پڑھنا' روزے رکھنا' حج کرنا اور سچ بولنا ہے تو پھر ہر مسلمان بنیاد پرست ہے۔ اگر اس کو قتل و غارت اور دہشت گردی کے معنوں میں لیا جاتا ہے تو پھر وہ لوگ جو اس میں ملوث ہیں اسلام کے دشمن ہیں۔ اس ایک لفظ کے معانی اور مفاہیم کا جائزہ لیا جائے تو پھر یہ اسلامی تاریخ کو مسخ کرنے کی شعوری کوشش ہے جو نہ کبھی پہلے کامیاب ہوئی ہے اور نہ اب ہوگی۔''

میں ایک لمحہ کے لیے رکا۔ سامعین کے تابناک چہروں کا جائزہ لیا اور پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تاریخ پاکستان اور تحریک پاکستان کا اس تناظر میں جائزہ لینا ہوگا۔ یہ ملک جو مملکت خداداد ہے جو صرف اسلام کے نام اور اسلام کی خاطر حاصل کیا گیا۔ دراصل جن لوگوں نے پاکستان بنایا تھا یا اس کی تحریک میں حصہ لیا تھا وہ راہی ملک عدم ہو چکے ہیں۔ آج کی نوجوان نسل کے اذہان میں بعض تکلیف دہ سوال اٹھ رہے ہیں جن کے جواب دینا لازم ہے۔ مشہور فرانسیسی مفکر روسو نے کہا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا تھا لیکن وہ ہر طرف زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ زنجیریں جبر و استبداد کی ہیں۔ ظلم اور زیادتی کی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسان ازل سے صید زبون شہریاری رہا ہے۔ انسان کی انسان کو غلام بنانے کی حرص و ہوس نے کبھی دم نہیں توڑا۔ اس نے اپنے ہی بھائی بندوں سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا ہے۔ الغرض آدمی کا شیطان آدمی رہا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کی بدقسمتی یہ تھی کہ ان کا پالا دو شیطانوں سے پڑا تھا۔ ایک وہ جو اپنی ایمپائر کے ڈوبتے ہوئے سورج کو بڑی حیرت اور حسرت سے تک رہا تھا اور دوسرا

صدیوں کا حساب چکانے کے لیے سنہری جال بن رہا تھا۔ مسلمان بقائے باہمی کے اصول پر اکٹھا رہنے کے لیے تیار تھے اور آئینی تحفظات چاہتے تھے لیکن ہندو کی سوچ کے قافلے اور راہوں پر گامزن تھے۔ اس تناظر میں مسلمانان ہند نے ایک آزاد اسلامی مملکت کا مطالبہ کر دیا۔ اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ مذاق اڑایا گیا۔ پھبتیاں کسی گئیں۔ لیکن جو ہونا تھا سو ہو کر رہا۔ اور پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ لیکن اس کے لیے بڑی طویل جدوجہد کرنا پڑی یہ ملک ہمیں چاندی کی طشتری میں رکھ کر پیش نہیں کیا گیا تھا۔ ایک قلزم خون تھا جسے عبور کر کے ہم نے آزادی حاصل کی۔ آزادی کی راہ میں ان گنت لوگ سر بریدہ ہوئے' کتنے جواں جسم خاک اور خون میں غلطیدہ ہوئے۔ کئی بوڑھے باپوں کی کمریں کمان بنیں۔ پتھرائی ہوئی بے نور آنکھوں نے رقص ابلیس ہوتے دیکھا۔ تب جا کر ہم آزادی کی منزل پر پہنچے۔ یہی بات نوجوان نسل کو بتانے اور سمجھانے کی ہے۔'' کافی دیر خاموشی رہی۔ ایک کربناک کیفیت تھی جس نے ہر ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اتنی بڑی قربانی؟ اکثر نوجوان اس حقیقت سے نا آشنا تھے۔ آزادی کے پھول خیرات میں نہیں ملتے۔ بہار صرف خون دل صرف کرنے سے آتی ہے۔ کوئی سوال؟'' میں نے پوچھا۔

تو کیا آزادی کے مجملہ مقصد پورے ہو گئے ہیں؟ نیویارک کے ڈاکٹر فیصل بولے:

''اگر آپ ایک لفظ میں جواب چاہتے ہیں تو وہ نفی میں ہوگا۔''

''اس کی وجہ؟'' ان کا تجسس کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

''کوئی ایک ہو تو بتاؤں! یہ ملک تو آزاد ہو گیا لیکن فکر و نظر آزاد نہیں ہو سکیں۔ انتظامی طریق سرگشتہ خمار رسوم و قیوم رہا ہے۔ ایک نہایت قلیل لیکن منظم گروہ قوم کے اعصاب پر پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہے۔''

''عوام ایسے لوگوں کا محاسبہ کیوں نہیں کرتے؟'' شکاگو کے ایک ڈاکٹر نے کہا

''ابھی اجتماعی شعور بیدار نہیں ہوا۔ اکثریت رہین ستم ہائے روزگار ہے۔ روٹی کپڑے کے چکر میں ہی دن سے رات ہو جاتی ہے۔''

''آج جب شہدا کی روحیں ایسی مملکت کا طواف کرتی ہونگی تو کیا سوچتی ہونگی؟ قاری وحید نے پوچھا۔

''ضرور مضطرب اور مضمحل ہوتی ہونگی۔ ان پچاس سالوں میں ہم نے اس ملک سے لیا تو بہت کچھ ہے' دیا کچھ بھی نہیں۔ کنگلے لکھ پتی ہو گئے ہیں۔ کوچہ بلی ماراں میں گول گپے بیچنے والوں نے ملیں لگا لی ہیں لیکن عوام کی تقدیر نہیں بدلی۔ معیشت دم توڑتی ہوئی۔ غربت ہاتھ جوڑتی ہوئی۔ کاروان حیات تنگناؤں اور مہیب گھاٹیوں سے گزرتا ہوا اور صدائے جرس کارواں کانوں میں زہر گھولتی ہوئی'

نہ منزل کا پتہ نہ نشان منزل!''

''عالم اسلام ان استعماری طاقتوں کے خلاف متحد کیوں نہیں ہو جاتا؟'' نیویارک کے نومسلم حبشی عبدالعزیز نے پوچھا۔

''جن سربراہان مملکت کی ساری دولت یورپی اور امریکی بنکوں میں پڑی ہو' متحد کیسے ہونگے۔ امریکی صدر کے پتلے ہونٹوں سے صرف ایک لفظ نکلتا ہے۔ Freez it اور اس کے ساتھ ہی ان کی رگوں میں گرم خون کی حرکت رک جاتی ہے۔ جب تک قومی دولت پر معدودے چند افراد کا تسلط رہے گا اتحاد کا خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔''

''لوگوں کو کب ہوش آئے گا؟'' ان کے لہجے میں تاسف تھا۔

''شاید عرب دنیا کو بھی ایک خمینی کی ضرورت ہے۔''

کافی دیر تک سوال و جواب کا سلسلہ چلتا رہا۔ کچھ پرچیاں خواتین کی طرف سے بھی آئیں جو دوسرے خیمے میں مائیک پر ساری باتیں سن رہی تھیں۔ ذاتی طور پر میرے لیے یہ بات اطمینان بخش تھی کہ امریکہ میں ایک طویل عرصہ تک رہتے ہوئے بھی سب کے دل نور ایمان سے منور تھے۔ مادیت پرستی ان کے دلوں میں گھر نہیں کر سکی تھی۔ انہیں فکر تھی' اسلام سے گہرا لگاؤ تھا۔ دور افتادگی کا کرب صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ صرف ایک گھنٹے نے ماحول بدل دیا تھا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے ہم ایک طویل عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں' آشنا ہیں' ہمدرد ہیں۔

نماز عشاء کے بعد جب میں خیمے سے باہر نکلا تو سارا منیٰ روشنیوں میں نہا رہا تھا۔ تاریکی کی رمق تک دکھائی نہ دیتی تھی۔ لوگ باہر سڑک پر گھوم رہے تھے یا بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ موسم میں خنکی آ گئی تھی۔ حرم شریف کی طرف سے آتی ہوئی ہوا منیٰ کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو فضا میں بکھیر رہی تھی۔ خیموں سے لبیک اللّٰھم لبیک کی آوازیں آ رہی تھیں۔ حاجیوں کی اکثریت خیموں کے اندر نوافل پڑھنے میں مصروف تھی۔ ایسے لمحے زندگی میں بار بار کہاں آتے ہیں۔ خدا کی عبادت خانہ خدا میں بیٹھ کر کی جائے۔ درود و سلام شہر رسول میں پڑھا جائے۔ اسوہ ابراہیمی اسی مقام پر ادا کیا جائے جس جگہ کی انہیں خواب میں بشارت ہوئی تھی۔ نیند کی یلغار کے باوصف میں کافی دیر تک گھومتا رہا۔ سونے کا کیا ہے۔ میں نے سوچا۔ ''مادی زندگی خواب غفلت میں گزر گئی ہے۔ بقیہ بھی گزر جائے گی۔ یہ لمحے غنیمت ہیں' حاصل زندگی ہیں۔ انہیں سمیٹ لیا جائے۔ ذکر الٰہی میں رات گزار دی جائے۔ ایک ایک کر کے لوگ خیموں کو جانے لگے۔ سڑک پھر ویران ہو گئی۔ خیموں میں بھی عبادت کی آوازیں مدھم پڑ گئیں۔ پٹرول پمپ کے ساتھ بنے ہوئے ہوٹل کے بیرے بھی اونگھنے لگے۔ بیت اللہ سے سندیسہ لانے والی ہوا بھی لوٹ گئی۔ ساری بستی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ صبح

نماز کے بعد سب کو میدان عرفات پہنچنا تھا۔ حج کی تکمیل وہیں ہونا تھی۔ میں بھی دو بجے رات بادل نخواستہ واپس خیمے میں آ گیا۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ چار سو مکمل خاموشی تھی، کبھی کبھی کھانسی اور خراٹوں کی آوازیں فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتیں۔ میں نے سفری بیگ سے گرم چادر نکالی اور فوم کشن کے بیڈ پر لیٹ گیا۔

اگلی صبح اگر قاری وحید نہ بھی جگاتے تو بھی سب بیدار ہو جاتے۔ کسی قریبی خیمہ سے اذان کی آواز سنائی دی تو سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ غسل کر کے ہم نے نماز فجر ادا کی۔ جب میں خیمہ سے باہر آیا تو بادِ نسیم بلکورے لے رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا میرے جسم سے ٹکرایا تو چادر پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ میں بے مقصد چلتا ہوا پٹرول پمپ کے بغلی ریسٹورنٹ میں جا نکلا۔ چولہوں پر نیلی کیتلیاں رکھی ہوئی تھیں جن سے دودھیا بھاپ نکل رہی تھی۔ قریبی کرسیوں پر کچھ حاجی بیٹھے ہوئے سٹرپ سٹرپ چائے پی رہے تھے۔ ''ہو جائے ایک کپ چائے'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ''بالکل۔ بالکل'' جسم کا ہر انگ پکار اٹھا۔ خواہش اور عمل میں فاصلہ ہی کتنا تھا۔ مجھے احساس ہی نہ ہوا کہ میں چائے کے دو گرم کپ حلق سے اتار چکا ہوں۔ قیمت دے کر جب میں واپس آیا تو بسیں آ چکی تھیں۔ امریکی حاجی ایک ایک کر کے سوار ہو رہے تھے۔ وحید صاحب مجھے آتا دیکھ کر کہنے لگے۔ ''شاہ صاحب مجھے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں آپ گم نہ ہو جائیں۔''

''منیٰ میں گم کیسے ہو سکتا ہوں۔ جگہ جگہ تو مددگاروں کے سنٹر بنے ہوئے ہیں۔''

''یہ لوگ اپنے آپ میں گم ہیں۔ اللہ نہ کرے آپ کو ان کی مدد کی ضرورت پڑ جائے۔

تو پھر ان کی افادیت کیا ہے؟

''عربی زبان بولنے والے استفادہ کر سکتے ہیں۔ انگریزی زبان سے یہ اس قدر بابلد ہیں جتنا کوئی انگریز اردو زبان سے ہوتا ہے۔

۹ ذی الحج کے سورج نے جب اپنی خواب گاہ سے باہر جھانکا تو بسیں چل پڑیں۔ اب کے انجنوں کا اتنا شور نہیں تھا جتنی پر کیف آوازیں لوگوں کے حلق سے نکل رہی تھی۔ مسافر بہ آواز بلند تلبیہ اور تکبیر پڑھ رہے تھے۔ ایک گھنٹے میں ہم وادی نمرہ پہنچ گئے۔ بسیں کچھ دیر کے لیے رکیں، چند لوگ غسل کے لیے اتر گئے۔ مسجد نمرہ کا کچھ حصہ عرفات میں ہے اور باقی منیٰ کی حدود میں آتا ہے۔ دراصل عرفات ایک پہاڑ ہے جس کے چاروں اطراف میں حجاج وقوف کرتے ہیں۔ وقوف کے لیے طہارت شرط نہیں ہے لیکن افضل ہے۔ یہاں غروب آفتاب تک وقوف کرنا ضروری ہے ہر چند کہ وقوف کا وقت اگلی دس ذالحج کی صبح طلوع آفتاب تک ہے لیکن عرفات میں

غروب تک قیام ضروری ہے۔ خوش قسمتی سے ہمیں میدان عرفات میں وہ جگہ الاٹ ہوئی جو جبل نور کے پہلو میں تھی۔ منیٰ کے برعکس یہاں عام خیمے لگائے گئے تھے۔ ائیر کنڈیشنگ بھی نہ تھی۔ فوم کے گدوں کی بجائے بوسیدہ دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ لیکن آسائشوں کے اس فقدان کا کسی کو ہوش نہ تھا۔ عقیدت کی لہر نے سب کو سرشار کر دیا تھا۔ برسوں کی خواہشات تکمیل کو پہنچ گئی تھیں۔ جب خورشید کی کشتی غرقاب نیل ہوگی تو ہوائیں گنگنانا شروع کر دیں گی۔ حاجیوں کے حج قبول' حاجیوں کے حج قبول۔ وہ جو علیم ہے۔ وہ جو خبیر ہے۔ جو دیکھتا ہے۔ سنتا ہے اور اپنی تخلیق پہ نازاں ہے۔ سب کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔

قاری وحید ہمیں بٹھا کر کھانے کے بندوبست کرنے چلے گئے۔ میری طبیعت کچھ بوجھل تھی۔ گلے اور سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ سفری بیگ کو سرہانے رکھ کر کچھ دیر کے لیے لیٹ گیا۔ خیال تھا کہ تھوڑی دیر ستا لوں لیکن اس روح پرور ماحول میں نیند کو کہاں آنا تھا۔ میں جلد ہی اٹھ بیٹھا۔ آدھا خیمہ خالی تھا۔ کچھ لوگ مسجد نمرہ چلے گئے تھے باقی غالباً میدان کی وسعتوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں باہر آ گیا۔ اب بھی اکا دکا بسیں حاجیوں کو منیٰ سے لا رہی تھیں۔ کیمپ کے بالمقابل ٹائیلٹس اور غسل خانے تھے۔ بائیں جانب پانی کی ٹینکی تھی۔ میں نے ٹینکی پر چڑھ کر میدان کا جائزہ لیا۔ حد نگاہ تک کیمپ لگے تھے اور حاجی آ جا رہے تھے۔ مسجد قریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھی لیکن بلند میناروں کی وجہ سے ایسے لگتا تھا جیسے پاس ہی ہو۔ شمال مشرقی جانب جبل رحمت تھا۔ میں کافی دیر کھڑا وہ نظارہ دیکھتا رہا۔ کافی دیر تک اپنے آپ میں گم رہا۔ یہ کیا مصلحت پروردگار تھی' دنیا کے کونے کونے سے لوگ اس چٹیل میدان میں جمع ہوئے تھے۔ یورپ کے مرغزاروں سے' مشرق وسطیٰ کے ریگ زاروں سے' ایشیا کے میدانوں سے' افریقہ کے ویرانوں سے' ہر رنگ' ہر نسل' ہر زبان کے لوگ' لباس مختلف تھے مزاج الگ تھے' قد کاٹھ میں فرق تھا' لیکن سوچ ایک تھی۔ آرزو مشترک تھی۔ رب کعبہ کے حضور نذرانہ عجز و عقیدت۔ اس دور میں اسرار نہانی کھل گئے ہیں۔ آدمی چاند تک پہنچ گیا ہے۔ ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ سائنس نے صدیوں کے توہمات کو روند ڈالا ہے۔ بتان ہیکل اوہام پاش پاش ہو گئے ہیں۔ علم ہر چیز کو پرکھ رہا ہے' کھنگال رہا ہے' تول رہا ہے۔ بے جان چیزیں بولنے لگی ہیں۔ فاصلے سکڑ رہے ہیں' سمٹ گئے ہیں۔ چار سو روشنی پھیل گئی ہے۔ بایں ہمہ آج سے چودہ سال پہلے ایک دریدہ کملی والے نے جو کہا' جو بتایا' جس چیز کا حکم دیا اس کو کروڑوں عاشقان رسول نے حرز جاں بنا لیا ہے۔ اس کی باتوں کو سچ مانا ہے۔ اس کے لائے ہوئے دین کو دل کی گہرائیوں سے قبول کیا ہے۔ اسی پہاڑ پر کھڑے ہو کر انہوں نے وہ آخری خطبہ دیا تھا جو معراج آدمیت تھا۔ جو بخشش انسان کا عنوان بن گیا۔

''جاہلیت کے تمام دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔''

لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے۔ تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ، سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ غلاموں کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو۔ وہی لباس پہناؤ جو خود زیب تن کرتے ہو۔ جاہلیت کے تمام خون باطل کر دیئے گئے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے ربیعہ بن الحارث کا خون معاف کرتا ہوں۔ میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے اس کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہو گے۔ وہ کیا چیز ہے۔ کتاب اللہ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے ساتھ نرمی کی ہدایت کی۔ سود کے متعلق احکامات دیئے۔

قریب کھڑے ہوئے لوگوں نے دور تک یہ آواز پہنچائی۔ ایک لاکھ کے مجمعے نے اس پیغام کو سنا۔ پھر یہ پھیلتا گیا، پھیلتا گیا اور چودہ سو سال کی تاریخ پر محیط ہو گیا۔ جب خطبہ ختم ہوا تو یہ آیت اتری۔

''آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا۔ اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے مذہب اسلام کو انتخاب کر لیا۔''

خطبے سے فارغ ہو کر آپ نے حضرت بلال کو اذان کا حکم دیا۔ ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کی۔ پھر ناقہ پر سوار ہو کر موقف تشریف لائے اور قبلہ رو کھڑے ہو کر دیر تک دعا مانگتے رہے۔

میں نے ٹینکی سے اتر کر خیمے میں جھانکا جو تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ دو بنگالی ایک کونے میں بیٹھے کہیں سے مانگا ہوا کھانا کھا رہے تھے۔ ہر نوالے کے ساتھ وہ پانی کا گھونٹ لیتے اور پیٹ پر ہاتھ مارتے۔ میں نے ان کی مصروفیت میں مخل ہونا مناسب نہ سمجھا اور جبل رحمت کی طرف چل پڑا۔ بے شمار لوگ پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔ دراصل وہ اس جگہ کو دیکھنا چاہتے تھے جہاں سے رسول مقبول نے خطبہ دیا تھا۔ عقیدت کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ یہ ہر رکاوٹ کو پھلانگ جاتی ہے۔ وقت کی قید سے آزاد ہوتی ہے اور کسی ضابطہ و تعزیر کی پابند نہیں ہوتی۔ اس کے مظاہرے آپ کو سعودی عرب میں جا بجا نظر آئیں گے۔ فرمان شاہی کو بھلا وہ لوگ خاطر میں کیا لائیں گے جو شاہ دو عالم کے غلام ہوں۔ میں پہاڑ پر بوجوہ نہ چڑھ سکا۔ اس کے قریب ہی خاردار تار لگائی تھی۔ دو فرلانگ کا فاصلہ دو کلومیٹر تک چلنے کے بعد طے کیا جا سکتا تھا۔ میں وہاں کافی دیر تک غرق نظارہ رہا۔ جب سورج کی کرنوں نے مسلسل جسم کو کچوکے دینے شروع کیے تو میں واپس لوٹا۔ راستے میں خیمہ مسجد نظر آئی تو میں اس میں داخل ہو گیا۔ مسجد کے چاروں طرف قناتیں تھیں۔ سارے صحن میں سرخ قالین بچھائے گئے تھے۔ مشرقی کناتوں کے اندر چند درخت بھی تھے۔ میں ایک درخت کے سائے تلے بیٹھ گیا اور کتاب کھول کر وہ دعائیں پڑھنا شروع کیں جو عرفات کے لیے مختص ہیں۔ میں کافی دیر تک عبادت کرتا رہا پھر اچانک مجھے اونگھ آ گئی اور وہیں لیٹ گیا۔

شاید ایک گھنٹے تک سوتا رہا۔ دفعتاً مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے جھنجھوڑ رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ قاری وحید تھے۔ بولے۔ ''اٹھئے کھانا تیار ہے پھر نماز کا وقت بھی قریب آ رہا ہے۔''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟''

''گروپ لیڈر اس طرح نہیں بنتے! وہ مسکرائے ''بڑا حساب کتاب رکھنا پڑتا ہے۔''

''پھر بھی''..... مجھے واقعی حیرت ہو رہی تھی۔''

''مساجد اور جبل رحمت' دو ہی ایسی جگہیں ہیں جہاں حاجی جا سکتے ہیں۔ یہ میدان عرفات ہے' جائے عبادات' نیویارک کا مین ہٹن نہیں جس کی ہر گلی ایک سندیسہ دیتی ہے۔''

''پیغام تو جبل رحمت بھی دیتا ہے صرف گوش نصیحت نیوش کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہ آپ غالب کو میدان عرفات میں کہاں لے آئے ہیں؟ وہ گوش نصیحت نیوش' کی ترکیب سن کر بولے۔

''حج کا بڑا شوق تھا' مرزا کو۔ سارا ثواب نذر شاہ کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔''

''لیکن شاہ ٹس سے مس نہ ہوا؟''

''مرزا کو بہت قلق ہوا ہو گا۔''

''یقیناً! سخنور تھے غصے میں سخن گسترانہ بات کہہ ہی ڈالی۔''

''اچھا! وہ کیا تھی؟'' قاری صاحب کا اشتیاق بڑھنے لگا۔

''استاد شاہ کے لتے تو لیتے ہی رہتے تھے ایک دن شاہ کو بھی رگڑ ڈالا۔'' ''کیسے؟''

لکھا:

بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوار یار میں
فرماں روائے کشور ہندوستان ہے

بولے ''میں تو اس کے کچھ اور معانی سمجھا تھا۔ قناعت۔ استغنا!

''مرزا کے ہر شعر کو تاریخی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ معذرت کرتے کرتے بھی استاد ذوق کو رسیاہ کہہ گئے تھے''

''ایسے عظیم شاعر کو تو ہر سال حج کرانا چاہیے تھا۔ قاری صاحب کے لہجے میں تاسف تھا۔''

''معاشی ناہمواریوں نے غالب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ شاہ کے ساتھ سیر چمن کرتے ہوئے بھی پھولوں پر نظر نہیں پڑتی تھی۔ پیڑوں پر آم گنتے رہتے تھے کہ شاید کہیں ان کا یا اجداد کا نام لکھا ہو۔''

''شاہ کو از خود خیال نہیں آتا تھا؟''

''میرے خیال میں اس کو شاعری کے علاوہ اپنی اصلاح کی بھی ضرورت تھی۔''

ہم اٹھ کر خیمہ میں آ گئے' کھانا تقسیم ہو رہا تھا۔ چکن' چاول اور جوس..... میدان عرفات میں حج کے روز اس قدر کھانا تقسیم ہوتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ مسلم حکومتوں کی طرف سے اور بڑی کمرشل کمپنیوں کی جانب سے بڑے بڑے ٹرالوں میں مفت کھانا تقسیم ہوتا ہے۔ پھل جوس اور دیگر اشیائے خورد و نوش بھی بانٹی جاتی ہیں۔ خیمہ میں لوگ ٹولیوں میں بٹے کھانا کھا رہے تھے۔ وہ بنگالی جو پہلے خیرات پر ہاتھ صاف کر چکے تھے ایکبار پھر خوش خوارکی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں اور وحید صاحب ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ جب ورکرز نے کھانا چنا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''ارے آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

بولے ''لیڈر کھانا کھاتا نہیں کھلاتا ہے۔ مجھے دیکھنے دیں کوئی گروپ ممبر رہ نہ گیا ہو۔''

''بظاہر ایسا نظر تو نہیں آتا!'' میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی

''پھر بھی! احتیاط لازم ہے۔ انہوں نے خیمے کا ایک چکر لگایا اور جب تسلی کر لی کہ ہر شخص تک کھانا پہنچ گیا ہے تو پھر آ کر بیٹھ گئے۔

''کیا امریکہ میں سب لیڈر آپ کی طرح ہوتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔''

''آپ کے ہاں کس قسم کے ہوتے ہیں۔'' انہوں نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر ڈالا۔

ہمارے لیڈر بڑے دردمند ہیں۔ کھانے کے ساتھ قوم کا غم بھی کھاتے ہیں۔ بڑے رقیق القلب ہیں اکثر چکن بریانی کے ساتھ مٹن کباب کھاتے ہوئے جب سوچتے ہیں کہ ہمارا ملک بہت غریب ہو چکا ہے تو بے اختیار ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔''

''اس کی وجہ بسیار خوری بھی ہو سکتی ہے!''

''وجہ چاہے کچھ بھی ہو قوم کو تو یہی باور کرایا جاتا ہے!''

''بڑی سادہ لوح ہے قوم آپ کی!'' قاری صاحب کے لہجے میں تاسف تھا۔ ''ابراہیم لنکن نے کہا تھا کہ آپ ایک شخص کو تمام عمر بے وقوف بنا سکتے ہیں۔ سب لوگوں کو ایک دفعہ بچہ دے سکتے ہیں لیکن تمام لوگوں کو ہمیشہ کے لیے چکمہ نہیں دے سکتے۔''

ہم بڑی زیرک قوم ہیں ہم نے اکثر بڑے لوگوں کے اقوال کو غلط ثابت کر کے دکھایا ہے۔

ہم کھانا کھا چکے تو ڈاکٹر فیصل آ گئے۔ کہنے لگے۔ ''شاہ صاحب چلئے ذرا میدان عرفات کو ایک مرتبہ پھر دیکھتے ہیں۔ جی نہیں بھرتا۔ قدرت نے اس میں ایک عجیب کشش پیدا کر دی ہے۔ ویرانے میں بہار..... ہم اٹھ کر باہر آ گئے۔ فیصل لکھنو کے رہنے والے ہیں۔ نیویارک میں Oncologist ہیں۔ دبلے پتلے۔ شفق رنگ' نرم آواز' دھیما لہجہ' اپنے تین چھوٹے بچوں اور بیگم کے ہمرہ حج کے لیے آئے ہیں۔

پوچھنے لگے۔ ''آپ نے یہ فن تقریر کہاں سے سیکھا ہے؟''

عرض کیا ''فن تقریر تو عطاءاللہ شاہ بخاری مرحوم کے ساتھ ہی دفن ہو گیا تھا۔ اب تو یہی غنیمت ہے کہ آدمی اپنا مافی الضمیر آسانی کے ساتھ بیان کر سکے۔''

بولے ''آپ کی تقریر سب نے بڑی پسند کی ہے۔ ہم سب ہیں تو غلامان محمد میں لیکن شان محمد کے کچھ پہلو نظروں سے پوشیدہ تھے۔''

''اس قدر عظیم المرتبت انسان کی شخصیت کے کئی پہلو ہمیشہ ہماری کم علمی کی وجہ سے نظروں سے اوجھل رہیں گے۔ انہیں صرف معرفت کی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔''

کہنے لگے ''کاش ہم یہ سب کچھ اہل مغرب کو ٹھیک طرح سے روشناس کرا سکتے۔

یہ کام علمائے دین کا ہے۔ بدقسمتی سے وہ اپنی نہیں نبیڑ سکتے اوروں کو کیا سمجھائیں گے!''

''کیا ہم انہیں اس جانب راغب نہیں کر سکتے۔ امریکہ میں کئی ایسی مسلم تنظیمیں ہیں جو ان کے اخراجات اٹھا سکتی ہیں۔''

میں نے کہا ''تبلیغ کے لیے زبان کا مسئلہ بھی بڑا اہم ہے۔ دینی مدارس میں انگریزی زبان کو مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ دنیاوی علوم پر بھی بوجوہ کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ سارا زور مسالک پر دیا جاتا ہے جس نے فرقہ بندی کو ہوا دی ہے۔''

بولے ''اب تو ہماری آنکھیں کھل جانی چاہیں۔ ۱۱ ستمبر کے واقعات نے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ امریکہ جیسے لبرل ملک میں بھی مسلمان اپنے آپ کو محفوظ خیال نہیں کرتے۔ ہر نگاہ چھنتی ہوئی محسوس ہوتی ہے' ہر ذہن مشکوک نظر آتا ہے۔ مسلمان' مسلمان ہوتا ہے چاہے اس کا تعلق کسی بھی خطہ ارض سے کیوں نہ ہو۔''

میں نے اپنی تقریر میں تقسیم کے حوالے سے ہندوستان کے متعلق کچھ سخت الفاظ کہے تھے' قاری وحید کو خدشہ تھا کہ کہیں آپ

لوگوں نے محسوس نہ کیا ہو!

''بالکل نہیں! آپ نے تاریخی حقائق بیان کئے ہیں ویسے بھی ہماری سلامتی پاکستان کی بقا میں مضمر ہے۔''

ہم چلتے چلتے مسجد نمرہ کے قریب پہنچ گئے۔ ہر طرف لوگوں کا جم غفیر تھا' ہاتھ میں تسبیحیں' زبان پر لبیک اور سفید براق لباس ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے زمین نے برف کی چادر اوڑھ لی ہو۔ آسمان پر بادلوں کے اکا دکا ٹکڑے تیر رہے تھے باوجود کوشش کہ وہ سورج کی کرنوں کو روک نہیں پا رہے تھے۔ مکے کا سورج بھی خاصا گرم مزاج ہوتا ہے اس کی تلملاتی ہوئی کرنیں سفید احراموں سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ انہیں شرمندگی اور ندامت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ جب بندگان خدا اپنے آپ کو خالق کے اس قدر قریب محسوس کریں تو پھر کوئی رکاوٹ' رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔

''آپ کا ہندوستان تو اکثر آنا جانا رہتا ہوگا؟'' میں نے خاموشی کا طلسم توڑتے ہوئے پوچھا۔

''کبھی کبھار' ایک تو پیشہ اس قسم کا ہے کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی پھر وہاں اب رکھا ہی کیا ہے!'' ان کے لہجے میں بلا کا کرب تھا۔

''آخر عزیز رشتے دار تو ہونگے؟''

اکثر پاکستان ہجرت کر گئے ہیں۔ بوڑھے والدین ہیں ان کو ہم نے امریکہ بلا لیا ہے۔''

''کیا انہیں وطن کی یاد نہیں آتی۔''

بولے'' یہ کمبخت یاد ایسی چیز ہے کو کبھی نہیں مرتی۔''

بے مہری یاران وطن کے باوصف اب بھی آہیں کھینچتے ہیں' لکھنو کی گلیاں' آموں کے پیڑ' کوئل کی کوکو' برسات کا موسم' باغوں میں جھولے' پھوار' پکوان۔''

''اور بچے؟''

''بچے حیران ہوتے ہیں۔ ایک دن میری چھوٹی بیٹی ان کی سفید داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔ دادا ابو آپ کو رولر کوسٹر اور پینگ میں فرق نظر نہیں آتا۔ ذرا میکڈونلڈ کا برگر کھا کر تو دیکھیں پکوان بھول جائیں گے۔ اس قدر کرپسی' کرنچی اور مزیدار!''

ابو اس کو گود میں لے کر کہتے ہیں۔''تم نے نیویارک دیکھا ہے' لکھنو کے باغوں کی سیر نہیں کی اس لیے یہ بے تکی تو تلی باتیں کر رہی

ہو۔"

"گویا عملاً آپ نے ہندوستان کو خیر باد کہہ دیا ہے!"

"ایسا ہی سمجھیں' میں نے امریکی شہریت لے لی ہے۔ بیوی بچے بھی امریکن نیشنل ہیں۔ والد صاحب کو کئی دفعہ کہا ہے کہ وہ بوسیدہ مکان اور بچی کھچی زمین بیچ دیں۔"

"کیا کہتے ہیں؟"

مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں' مکان گرتا ہے تو گر جانے دو۔ اینٹ' چونے اور گارے کی آمیزش سے مکان تو بن جاتے ہیں گھر نہیں بنتا۔ اس جگہ میرا بچپن گذرا ہے۔ وہ تمہاری جنم بھومی (جائے پیدائش) ہے۔ مجھے وہ لمحہ آج بھی یاد ہے جب نسیماں دائی نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا تھا۔ خان صاحب مبارک ہو۔ بیٹا ہوا ہے۔ بیٹا وہ محض مکان نہیں ہمارے خاندان کی تاریخ ہے۔ کبھی کوئی تاریخ کو بھی فروخت کرتا ہے۔"

میں نے کہا۔

"ناسٹیلجیا" یہ یادیں واقعی بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ جونک کی طرح چمٹ جاتی ہیں اور انسان کو دیمک کی طرح چاٹ لیتی ہیں۔"

بولے "اکثر حج پر جاتے ہیں تو لکھنو کا چکر بھی لگا لیتے ہیں بجائے فائیو سٹار ہوٹل کے اسی بوسیدہ مکان میں ٹھہرتے ہیں۔ ہر کمرے میں یادوں کی پوٹلی کھولتے ہیں بوڑھی آنکھوں میں بچے کھچے گدلے آنسو پیوند خاک کرتے ہیں اور واپسی پر کافی دیر تک افسردہ اور ملول رہتے ہیں ل۔"

کس قدر مختصر یہ حیات ہے۔ کتنے طویل آلام کے لمحے ہیں۔ کرب انگیز اذیتیں۔ جان لیوا جدوجہد' حد سے بڑھتی ہوئی سیمابیت۔ بے بسی' لاچاری' مجبوریاں اے رب کائنات! تو نے اگر یہ روحانی لمحات میسر نہ کئے ہوتے تو انسان بے موت مر جاتا۔ میدان عرفات نہ صرف انسانوں کے لیے اپنا سینہ کشادہ کرتا ہے بلکہ یہ دکھ اور درد کو بھی سمیٹتا ہے۔

سورج غروب ہوا چاہتا تھا۔ ہر نگاہ آسمان پر لگی تھی۔ میدان عرفات سے آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں البتہ دلوں کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ سب کو اس اندھیرے کا انتظار تھا جو روشنی کی نوید تھا جو زندگی کا کایا پلٹنے والا تھا۔ جس نے گنہگاروں کے گناہ معاف کروانا تھے' زہد و تقویٰ کو مزید دوچند کرنا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہوتی ہیں لیکن عرفات کا غروب طویل تر تھا۔ ہر لمحہ مہ و سال پر بھاری تھا۔

وقت نے بہر حال گزرنا تھا گزر گیا۔ وہ سورج بھی بال آخر غروب ہو گیا۔ مبارک۔ حج مبارک کی آواز سے میدان عرفات گونج اٹھا۔ اللہ اکبر الحمدللہ سبحان اللہ کا ورد ہونے لگا۔ حاجی ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔ خوشی کے آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی اور پھر قاری وحید صاحب کی آواز گونجی۔ ''اجتماعی دعا کے لیے خیمے کے باہر جمع ہو جائیں۔'' دعا خاصی طویل تھی بڑی موثر تھی۔ اس کے لیے ایک پاکستانی مولوی صاحب کا بندوبست کیا گیا تھا جو خود بھی ہر فقرے کے بعد رونے لگتے اور حاضرین کو بھی رلا رہے تھے۔ دعا دعا میں انہوں نے ملت اسلامیہ کی ساری تاریخ دہرا ڈالی۔ امت مسلمہ کے مسائل اور مصائب کا خاص طور پر ذکر کیا۔ ہنود و یہود کی گٹھ جوڑ سے آگاہ کیا۔ اور اہل مغرب کی ریشہ دوانیوں سے بروقت خبردار کیا۔

دعا ختم ہوئی تو موٹروں کی بھوں بھوں شروع ہو گئی۔ گاڑیوں کی سیٹیں چھت اور پائیدان حاجیوں سے بھر گئے۔ ہر کسی کو مزدلفہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ قاری صاحب نے بتایا کہ ہمارا گروپ رات دس بجے روانہ ہو گا اس لیے اگر کوئی آرام کرنا چاہے تو خیمہ میں لیٹ سکتا ہے۔ وہ تجربہ کار انسان تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ روانگی چاہے کسی وقت بھی ہو رات گیارہ بجے سے پہلے مزدلفہ پہنچنا ممکن نہ تھا۔ کیونکہ گاڑیاں بمپر ٹو بمپر چل رہی تھیں۔

چونکہ غسل خانوں پر دباؤ کم ہو گیا تھا اس لیے کچھ حاجی غسل کرنے چلے گئے باقی خیمے میں جا کر لیٹ گئے۔ میں بے مقصد میدان میں نکل گیا۔ اندھیرا ہو گیا تھا لیکن ان گنت ٹیوب لائیٹس کی وجہ سے روشنی کا ایک گولا آسمان کی طرف اٹھ رہا تھا۔ کافی خیمے خالی ہو چکے تھے۔ باقی ماندہ لوگ بھی بے تابی سے بسوں کا انتظار کر رہے تھے۔ ہر بس کو دو تین پھیرے لینے تھے۔ چلتے چلتے میں جبل رحمت کے پہلو میں آ گیا۔ وہی پہاڑ جو صبح ہاؤس فل کا منظر پیش کر رہا تھا اب بالکل ویران تھا۔ دور دور تک کوئی ذی نفس نظر نہ آتا تھا۔ تیز ہوا سرسراتی ہوئی پہاڑ سے میدان عرفات کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وقت کی کمی کی وجہ سے پہاڑ پر چڑھنا ممکن نہ تھا میں نیچے ہی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟'' مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے پہاڑ سرگوشیاں کر رہا ہے۔

ارے پربت بھی بولتے ہیں؟ میں نے اس بے آب و گیاہ پہاڑ کی طرف دیکھا جو اندھیرے میں گہرا سرمئی ہو گیا تھا۔

''جس چیز پر رسالت مآب کے قدم پڑ جائیں وہ بے جان نہیں رہتی۔''

اس کے لہجے میں تفاخر تھا۔

چودہ سو سال سے حاجیوں کا جم غفیر دیکھ رہے ہو۔ کیسا محسوس ہوتا ہے؟'' ''اس ایک دن کا انتظار سارا سال رہتا ہے۔''

''ایک دن کی چاندنی پھر اندھیری رات۔ تنہائی؟''

''نہیں ایسی بات نہیں۔ یہ ایک دن سارے سال پر بھاری ہے۔ حاجیوں کے حلق سے نکلے ہوئے اللہ اکبر' الحمدللہ اور سبحان اللہ کے لفظوں کی خوشبو سارا سال مجھے تروتازہ رکھتی ہے۔''

''وہ کیسا لمحہ ہوگا جب رسالت مآب تمہاری چوٹی پر کھڑے ہوئے آخری خطبہ دے رہے تھے؟''

''لوگوں نے تو محض سنا تھا۔ دہن مبارک سے نکلا ہوا ہر لفظ میرے سینے پر نقش ہو گیا۔ کیسا روح پرور منظر تھا۔ رسول اکرم صحابہ کرام کے جلو میں اپنے ناقہ قصویٰ پر بیٹھے تھے۔ دائیں بائیں صحابہ کرام کھڑے تھے۔ رفیق نبوت حضرت ابوبکر صدیق۔ حضرت عمر۔ اہل بیت' باب علم ابوتراب آپ کے عم زاد فضل بن عباس کم سن ابن عباس' حضرت بلال انصار مدینہ' مہاجرین' اہل قریش کتنے نام گنواؤں' وہ جنہوں نے اسلام کی راہ میں ان گنت قربانیاں دی تھیں۔ وہ بھی جنہوں نے حضور پر بے پناہ مظالم ڈھائے تھے۔ معافی جو مل گئی تھی۔ خطبہ سے فارغ ہو کر آپ نے حضرت بلال کو اذان کا حکم دیا۔ ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ ادا کی پھر روانہ ہوئے۔ حد نگاہ تک حاجیوں کے قافلے تھے۔ ہر شخص کی ژواہش تھی کہ آپ کے ساتھ چلے۔ چہرہ مبارک کا دیدار کرتا جائے۔ آپ کے ارشادات سنتا جائے۔ آپ ان کے صبر کی تلقین کرتے رہے۔ السکینہ یا ایھا الناس السکینہ' یا ایھا الناس۔ (لوگو سکون کے ساتھ' لوگو سکون کے ساتھ) راستے میں ایک جگہ اتر کر طہارت کی۔ اسامہ نے کہا نماز کا وقت قریب ہے۔ فرمایا نماز کا موقع آگے آتا ہے۔ جب مزدلفہ پہنچے تو نماز مغرب ادا کی پھر فوراً ہی نماز عشاء پڑھی۔'' وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔

''پھر کیا ہوا؟'' میرا اشتیاق جنون کی شکل اختیار کر گیا۔

''یہ طویل قصہ ہے۔ جاؤ اہل قافلہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں اگر دیر کر دی تو مزدلفہ نہ پہنچ پاؤ گے۔ پھر کبھی آنا۔''

ہم نصف شب کے قریب مزدلفہ پہنچے۔ منیٰ اور عرفات کے برعکس یہاں بہت کم روشنی تھی۔ بس سے اتر کر ارد گرد دیکھا تو حیران رہ گئے۔ کوئی خیمہ نہیں تھا۔ ایک نہایت وسیع و عریض میدان جس کے چار سو پہاڑ تھے۔ چھوٹے بڑے کنکر اور پتھر ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ شاہ گدا کی تمیز ختم ہو گئی تھی۔ مرد عورتیں' بوڑھے بچے فرش محمدی پر دراز تھے۔ جن کے پاس چادریں' دریاں بستر بند تھے انہوں نے بچھا لیے باقی ویسے ہی لیٹ گئے۔ ہمارے گروپ میں سو آدمی تھے۔ پچاس مرد اور قریباً اتنی ہی عورتیں اور بچے۔ حد نگاہ تک کوئی خالی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ قاری وحید کو میں نے پہلی مرتبہ پریشان دیکھا۔ بولے۔ ''کیا کیا جائے؟ مردوں کی تو خیر ہے عورتیں اور بچوں کو رات کاٹنا مشکل ہو جائے گی'' ''آپ یہیں ٹھہریں میں ریکی کرتا ہوں!'' میں نے انہیں تسلی دی اور ہجوم کو چیرتا' سوئے سوئے ہوئے لوگوں پر سے پھلانگتا ہوا میں خالی جگہ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ دو تین فرلانگ کے فاصلے پر مجھے ایک بہت بڑا ٹرالا کھڑا

ہوا نظر آیا۔ میں قریب گیا تو چند لوگ اس کے دائیں بائیں لیٹے تھے۔ قریب ہی ایک لڑکے نے چائے کا اسٹال لگا رکھا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں رات کو ٹرالا چل نہ پڑے لوگ اس سے ذرا ہٹ کر لیٹے ہوئے تھے۔ ہمارے گروپ کے لیے یہ بڑی موزوں جگہ تھی۔ میں فوراً واپس گیا اور قافلے کو لے آیا۔ تھوڑی سی تگ ودو کے بعد ہم نے اپنا کیمپ لگا لیا۔ پہلے سے جو چند لوگ لیٹے ہوئے تھے اور از خود اٹھ کر چلے گئے۔ جگہ تو مل گئی تھی اب غسل خانوں کی فکر ہوئی۔ اتفاق سے ٹائیلٹ دور نہ تھے لیکن بہت رش تھا۔ لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ بشریت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں حبشی عورتوں نے جب دیکھا کہ ان کی باری تک شاید معاملات بگڑ جائیں گی تو انہوں نے مردوں کے ٹائیلٹس پر دھاوا بول دیا اور قطار میں کھڑے ہوئے حاجیوں کو باہر دھکیل دیا۔ کچھ بوڑھے حاجیوں نے احتجاج بھی کیا لیکن اس نقار خانے میں طوطیوں کی آواز کون سنتا۔

سعودی حکومت نے منیٰ اور عرفات میں نہایت اعلیٰ انتظام کر رکھا ہے' پتہ نہیں مزدلفہ میں کمی کیسے رہ گئی ہے۔ ہوسکتا ہے کسی نے ٹھیک طرح سے ان کی توجہ نہ دلائی ہو۔ بال آخر سب نے وضو کر لیا۔ قاری صاحب نے مغرب اور عشاء کی نماز پڑھائی۔ اس قدر رش دیکھ کر ہمارے گروپ میں قدرے گھبراہٹ طاری ہوئی۔ سب سے بڑی فکر صبح کی تھی۔ صبح کیا ہوگا۔ طہارت وضو؟ بڑی سوچ بچار کے بعد یہ طے پایا کہ رات کو دو تین بجے ہی نہا لیا جائے اور وضو کر کے نوافل شروع کر دیئے جائیں۔ یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ مزدلفہ میں آدمی ٹھیک طرح سے سو نہیں سکتا غالباً فلسفہ بھی یہی کارفرما ہے کہ لوگوں کو زندگی کے اس پہلو سے آشنا کرانا۔ وہ جو ناز و نعم میں پلے ہوتے ہیں انہیں بھی احساس ہو کہ غریبوں کے شب و روز کیسے گزرتے ہیں۔ غربا' مساکین جن کے لیے ہر شب' شب مزدلفہ ہوتی ہے۔ سونے کے لیے سخت زمین' میونسپلٹی کے نل کا قطرہ قطرہ گرتا ہوا پانی' کھلا آسمان موسم نامہربان۔ وقت رینگ رینگ کر' کراہتا ہوا گزرتا ہے۔

رات کسی طور کٹنی تھی کٹ گئی۔ پتھروں پر لیٹے ہوئے عنائیت اللہ کے سیلز مین کے الفاظ یاد آئے۔ بستر لے جائیں ورنہ بڑی تکلیف ہوگی۔ بے آرامی ضرور تھی لیکن تکلیف کا احساس نہ تھا۔ بستر نہ لانے کا تاسف بھی نہیں تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں عمداً اس قسم کے تجربات سے گزرا تھا۔ سروس میں بھی بلوچستان کے اکثر شب و روز اس سے ملتے جلتے تھے۔ میں ٹرالے کے بالکل قریب لیٹا تھا اس قدر نزدیک کے اگر چلتا تو مجھے بھی ساتھ لے جاتا۔ میرے سرہانے نو بیاہتا جوڑا لیٹا تھا۔ وہ اپنا سفری بستر ساتھ لائے تھے۔ دلہن اپنے خاوند کو کسی رشتے کی خالہ کا تعارف کرا رہی تھی جس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش نو بیاہتا جوڑے میں نفاق پیدا کرنا تھا۔ دولہا کچھ سمجھتے ہوئے زیادہ نہ سمجھتے ہوئے ہاں ہوں کر رہا تھا۔ مجھے ایک دم احساس ہوا کہ غیر شعوری طور پر بھی باتیں سننا مناسب

نہیں ہے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور قریبی چائے کے اسٹال پر چلا گیا۔ اسٹال پر رش کم ہو گیا تھا۔ میں نے ایک کپ چائے کا آرڈر دیا۔ سیلز بوائے نے غور سے میری طرف دیکھا۔ ''آپ کا لہجہ دھنی کا ہے'' میں نے اثبات میں سر ہلایا تو خوش ہو کر بولا۔ ''میں بھی دھرابی کا ہوں۔ وطناں دی بوٹی۔ یہ کہہ کر وہ مجھ سے لپٹ گیا۔ یہ دنیا بھی عجیب تماشا گاہ ہے۔ وطن میں ہوں تو گاؤں میں اوپلوں پر بھی لڑائی ہو جاتی ہے اور دیار غیر میں ساری محبتیں لوٹ آتی ہیں۔ چائے پی کر میں نے واپس جانا مناسب نہ سمجھا اور اس کے ساتھ باتوں باتوں میں رات گزار دی۔

صبح نماز فجر کے بعد ہمارا قافلہ منیٰ کے لیے روانہ ہوا۔ مشعر حرام میں قبلہ رخ ہوئے۔ دعا مانگی ہی تھی کہ قاری صاحب نے اعلان کیا کہ بسیں تیار ہیں ناشتہ منیٰ میں ہوگا۔ جلدی کریں نہیں تو رش میں لٹک جائیں گے۔ نہایت تیزی کے ساتھ وہ ہمیں بسوں تک لے آئے۔ بڑی سرعت کے ساتھ ہم سوار ہوئے اور بسیں نہایت آرام کے ساتھ بغیر رکے سورج طلوع ہونے سے پہلے منیٰ پہنچ گئیں۔

خیمے میں جا کر ایک عجیب قسم کی طمانیت کا احساس ہوا۔ ناشتہ بھی خاصا بھاری تھا۔ چائے کے ساتھ کیک پیس۔ بسکٹ، بند مکھن۔ پنیر۔ جام اور پھل تھے۔ ناشتے کے بعد کچھ لوگ بضد تھے کہ فوراً ہی جمرہ اولیٰ کیا جائے۔ کنکریاں سب نے مزدلفہ میں ہی چن لی تھیں۔ قاری صاحب نے سختی کے ساتھ منع کر دیا ان کا استدلال یہ تھا کہ اس بھیڑ میں عورتوں اور بچوں کو لے کر جانا قرین عقل نہیں ہے۔ ہر سال بے احتیاطی کی وجہ سے کئی حادثات ہوتے ہیں۔ قافلے کے سالار کا حکم تھا اس لیے سب نے آمنا کہہ دیا۔ بارہ بجے کے قریب وہ پھر آئے اور کہنے لگے تمام راستے لوگوں سے اٹے پڑتے ہیں۔ بس وہاں تک نہیں جا سکتی۔ ۳ کلومیٹر کا راستہ پیدل طے کرنا پڑے گا۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ حبشی عبدالعزیز اور اس کے ساتھی نے اپنے مضبوط ہاتھوں میں کتبے اٹھائے اور قافلہ بڑے شیطان سے نبرد آزما ہونے کے لیے چل پڑا۔ سب سے آگے مضبوط مرد تھے ان کے پیچھے عورتیں اور بچے اور ان کے پیچھے ان کے والدین اور عزیز رشتہ دار۔ لبیک اللّٰھم لبیک۔ جب عبدالعزیز نے تلبیہ پڑھی تو سماں بندھ گیا۔ سات فٹ کا قد۔ تین فٹ کا کتبہ ایسے پتہ چلتا تھا کہ آواز حلق سے نہیں بلکہ جسم و جاں سے نکل رہی ہے۔ اس کی تقلید سب نے کی۔ منیٰ گونجنے لگا۔ راہ چلتے ہوئے لوگوں نے حیرت اور احترام کے ساتھ نگاہیں ہماری طرف پھیر لیں پھر ان کی آوازیں بھی ہماری آوازوں میں شامل ہو گئیں۔ سورج نصف النہار پر تھا اچھی خاصی گرمی تھی۔ فاصلہ بھی نسبتاً طویل تھا لیکن کسی کو ہوش نہ تھا۔ ہر شخص پر وجد طاری تھا۔ جوش اور جذبہ اپنی انتہا پر تھے۔ ہجوم بڑھتا گیا' آوازیں بلند ہوتی گئیں' قدم میکانکی انداز میں تیز تر ہوتے گئے۔ راستے میں کچھ پٹھان بھائیوں کا قافلہ ملا۔ ٹل اور ہنگو کے۔ وہ ہر تلبیہ کے بعد غصے سے چلاتے۔ ''خوچہ کدھر ہے وہ دیوس۔ ہم اس کا چمڑی ادھیڑ دے گا۔'' ویسے تو ابلیس ملعون کی

خوب مرمت ہوتی ہے لیکن جو درگت ہمارے پٹھان بھائی بناتے ہیں' اسے سارا سال یاد رہتی ہوگی۔ پتھروں کے ساتھ جاتے' جوتوں کے ساتھ پتھروں کی ہم وزن گالیاں۔ ہر گالی کے بعد اشارے۔ آخ تھو۔ اگر اس بدبخت کو ذات باری تعالیٰ ایک موقعہ اور دے دے تو شاید فوراً ہی آدم کے سامنے ماتھا رگڑنے لگے۔

بڑا عجیب منظر تھا۔ نہایت انوکھا نظارہ تھا۔ ہزار ہا آدمی طیش کے عالم میں ایک پتھر کے شیطان کو سنگسار کر رہے تھے۔ جوتے مار رہے تھے۔ تھوک رہے تھے۔ لعن طعن کر رہے تھے۔ آدمی پر آدمی چڑھا ہوا تھا۔ ہوائی چپلوں کا انبار لگ گیا تھا۔ لوگ پھسل رہے تھے' لڑکھڑا رہے تھے۔ گر رہے تھے۔ لیکن ہاتھوں کی حرکت تھمنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ مناسک حج کا یہ نہایت اہم جزو تھا۔ تین دن تک تین شیطانوں کو پتھر مارنا۔ دراصل شیطان ایک ہی تھا اس کے تین مختلف روپ تھے۔ ابلیس جو سارا سال لوگوں کو ورغلاتا ہے یہاں آ کر بے بس ہو جاتا ہے۔ بابا وقار انبالوی کہا کرتے۔ شاہ صاحب جب میں نے پہلی کنکری ماری تو بدبخت فٹ سے بول پڑا۔ You too Brutus اس دن بڑی مشکل سے ہم نے سات کنکریاں ماریں۔ مردوں کو جسم و جان کا پورا زور لگانا پڑا۔ زبردست ہجوم تھا لوگوں کا ایک ریلہ آتا اور کبھی ہم مشرق کی طرف لڑھک جاتے تو کبھی مغربی سمت جا نکلتے۔ بااین ہمہ رسم پوری کرنی تھی' سو ہو گئی۔ عورتوں کے لیے عام حالات میں پتھر مارنا مشکل تھا اس کے لیے بھی قاری صاحب کا تجربہ کام آیا۔ دس مرد ہاتھوں کا ایک دائرہ بناتے اور اس میں پانچ چھ عورتیں داخل ہو کر آگے بڑھتیں اس طرح ہجوم کی براہ راست یلغار سے بچ جاتیں۔

خدا خدا کر کے وہ مرحلہ ختم ہوا۔ جب ہم شیڈ سے باہر آئے تو جگہ جگہ لوگ سر منڈوائے بیٹھے تھے۔ حجام اور نیم حجام انہیں فارغ البال کر رہے تھے۔ ہم دو حصوں میں بٹ گئے۔ عورتیں اور بچے فیصل صاحب کی معیت میں واپس کیمپ چلے گئے۔ اور ہم عمرہ ادا کرنے قریبی بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑے۔ پبلک ٹرانسپورٹ کی بسیں کم تھیں اور سواریاں ہزاروں کی تعداد میں تھیں۔ جو بسیں ہمیں لائی تھیں وہ واپس چلی گئی تھیں۔ ٹکٹ لے کر ہم تین گھنٹے تک انتظار کرتے رہے لیکن باری نہ آئی۔ کھڑے کھڑے تمازت آفتاب نے برا حال کر دیا۔ میں نے قاری وحید کو کہا کہ میں واپس کیمپ جانا چاہتا ہوں اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔

کہنے لگے۔ ''آپ راستہ بھول جائیں گے۔''

''سیدھے تو آئے ہیں راستہ کیسے بھول سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

بولے ''جس بدبخت کو زدوکوب کر کے آئے ہیں وہ آپ کو مزید ہلکان کرے گا۔''

''Let us give him a chance'' میں مسکرا دیا۔

قاری وحید کے خدشات درست تھے۔ شیطانوں کو عبور کرنا ہی تھا کہ میں ایک موڑ غلط کاٹ گیا۔ زوروں کی گرمی پڑ رہی تھی۔ عملاً میں دو راتوں کا جاگا ہوا تھا پھر ہوائی چپلیں پہن رکھی تھیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ صحیح راستے پر جا رہا ہوں لیکن جب چلتے چلتے ایک گھنٹہ گزر گیا اور راہ میں کوئی نشانی نظر نہ آئی تو میرا ماتھا ٹھنکا کہ ملعون نے بدلہ لے لیا ہے۔ تھکن مجھے سارے وجود میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی ایسے لگتا جیسے پاؤں میں کسی نے بیڑیاں ڈال دی ہوں یا بھاری پتھر باندھ رکھے ہیں۔ چلتے چلتے مجھے ایک پاکستانی کیمپ نظر آیا۔ سامنے ایک آدمی کھڑا تھا۔ شلوار قمیض پہنے میں اس کے پاس پہنچا اور مدد طلب کرنے والا تھا کہ الٹا اس نے سوال کر ڈالا۔ ''آپ پاکستانی ہیں؟''

''یقیناً''

''رمی کرنے آئے تھے؟''

''ہاں۔ بابا ہاں''

''اب واپس جا رہے ہیں؟''

''بالکل''

''تو پھر مجھے بھی ساتھ لے چلیں، میں راستہ بھول گیا ہوں!'' میں نے سوال کو واپس حلق کی سرنگ میں ڈال دیا۔

اسی طرح کے ایک دو کیمپ نظر آئے لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ چلتے چلتے آخر سعودی حکومت کا قائم کردہ گائیڈ سنٹر نظر آیا تو جان میں جان آئی۔ وہاں گائیڈ تو کوئی نظر نہ آیا۔ البتہ چند طفلان خوش نہاد ادھر ادھر پھدک رہے تھے۔ ان کے اردگرد بھولے بھٹکے لوگوں کا ہجوم تھا۔ سب باتیں اشاروں کنایوں میں ہو رہی تھیں۔ نہ انہیں اردو۔ انگریزی۔ فارسی ترکی آتی تھی اور نہ حاجی جدید عربی بول سکتے تھے۔ وہ زبان نہ جانتے ہوئے بھی بڑے غور سے مسافروں کی بپتا سننے لگ جاتے اور جب مسافر داستان غم سنا سنا کر ہلکان ہو جاتا تو دوسرے شخص کی داستان امیر حمزہ سننے لگتے۔ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ حکومت کو اس تردد کی کیا ضرورت تھی۔ میرا مسئلہ اس سے بھی زیادہ گھمبیر تھا۔ وہ تعویز اور کڑا جو حاجی کیمپ نے مرحمت فرمایا تھا کسی کام کا نہ تھا کیونکہ میرا اپنے اصل کیمپ سے رابطہ مکمل طور پر کٹ چکا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کچھ حاصل نہیں ہوگا میں نے چند گھنٹے ان کے ساتھ مغز ماری کی اور پھر غصے سے پیر پٹختا ہوا نکل آیا۔ مولانا مکی صاحب کا نمبر میری ڈائری میں درج تھا۔ ڈائری کیمپ کا دور دور تک نام و نشان نظر نہ آتا تھا۔ میں پانچ گھنٹے تک منیٰ کی سڑکوں پر بے مقصد گھومتا رہا۔ قیافے اور قیاس کی بنیاد پر راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ہر سعی خواہش بے سود ثابت ہوئی۔ منیٰ میں ایک

بہت بڑا بازار تھا۔ سینکڑوں دوکانیں تھیں۔ ہزاروں لوگ ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ گاڑیوں کی آواز سے بے پناہ شور اٹھ رہا تھا۔ بھانت بھانت کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں جنگل بیابان میں آ نکلا ہوں۔ تن تنہا۔ میں ساری دنیا میں گھوما پھرا ہوں۔ ٹوکیو کے مشکل راستے۔ نیویارک کی بھول بھلیاں' پیرس کی پرفریب گلیاں۔ مصر کے صحرا' آسٹریلیاں کی وسعتیں' مجھے کبھی بھی کہیں بھی مشکل پیش نہیں آئی۔ راستہ بھول جائیں تو لوگ انگلی پکڑ کر منزل مقصود تک پہنچا دیتے ہیں۔ پولیس مین ڈیوٹی چھوڑ کر آپ کی رہنمائی کرتا ہے۔ جگہ جگہ ہیلپ سنٹر بنے ہیں۔ ایک ہی جملہ سننے کو ملتا ہے۔

Don't worry, You can't miss it. یہاں شرطے لاتعلق' لوگ بے حس۔ ہیلپ سنٹر بے بس۔ چلتے چلتے میں بیٹھ جاتا بیٹھے بیٹھے ایک ہوک سی اٹھتی تو چل پڑتا۔ ایک عجیب طرح کی شرمندگی۔ انوکھا احساس ندامت' جہاں گرد' سفرنامہ نگار' حاجی' تلہ گنگوی شاہ بابا راستہ بھول گیا ہے۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے سارے تلہ گنگ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا ہو۔ دل و دماغ پر تاریکی چھانے لگی۔ مایوسی کے ان لمحات میں اچانک بالکل اچانک بجلی کا ایک کوندا سا لپکا۔ اے سادہ لوح شخص! ارے انسانوں سے مدد مانگتا ہے۔ اوپر دیکھ۔ ذرا اپنے اندر جھانک' بھول گیا ہے کہ تو کس کا مہمان ہے۔ تجھے کس نے بلایا ہے! تجھے واپس کون بھیج سکتا ہے.....!

''یا پروردگار'' میری روح کی اتھاہ گہرائیوں سے آواز نکلی۔ ''حرم۔ حرم'' ایک ویگن کا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ میں لپک کر اس میں بیٹھ گیا۔

جب میں بلڈنگ میں پہنچا تو سب حیران رہ گئے۔ مولانا صاحب کہنے لگے۔ قاری وحید نے بتایا تھا کہ آپ واپس کیمپ میں چلے گئے ہیں یہ اچانک آمد کیسے ہوئی۔

''کیمپ میں جانے کی کوشش کی تھی' بس ایک موڑ غلط کاٹا اور راستہ بھول گیا۔''

''بس ایک غلط موڑ ہی صراط مستقیم سے دور لے جاتا ہے۔ انسان تمام عمر بھٹکتا رہتا ہے۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے۔ ''واپس مڑنا خاصا دشوار ہوتا ہے۔ دراصل منیٰ ایک امتحان گاہ ہے جہاں ہزار ہا برس سے لوگوں کے حوصلوں میں ہمتوں کو پرکھا جاتا ہے۔ کئی گھبرا جاتے ہیں جو ثابت قدم ہوتے ہیں وہ بال آخر راستہ تلاش کر لیتے ہیں۔''

میجر جاوید کہنے لگے ''آپ کی ثابت قدمی ہی آپ کو واپس لے آئی ہے!''

میں نے کہا ''ہمتوں اور حوصلوں کو بھی صرف وہ ہی استقامت بخشتا ہے نہیں تو راہوار عقل لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے۔''

''بے شک بے شک!'' مولانا مطیع الرحمن بولے۔ ''وہ جسے چاہے عزت و وقات بخشتا ہے اور ناراض ہو تو ذلت کے غاروں میں اتار دیتا ہے۔''

''آپ بال کٹوالیں۔ رات کو طواف کریں گے۔'' مولانا صاحب نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ رفیق گاڑی لے آیا۔ اس دن مکہ کی کوئی بار برشاپ ایسی نہیں تھی جو حاجیوں سے بھری نہ پڑی ہو۔ جس طرح عید کے دن قصابوں کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے اسی طرح حج کے روز حجاموں کی عید ہو جاتی ہے۔ ہاتھ اور استرے کے ساتھ زبان بھی مسلسل چلتی رہتی ہے۔ حجاموں کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ بڑے باتونی ہوتے ہیں پھر حجام پنجابی ہو تو باتوں کی پٹاری کھول دیتا ہے۔ تلاش میں ایک گھنٹہ لگ گیا لیکن کوئی دوکان خالی نظر نہ آئی۔ اب واپس چلیں' میں نے رفیق کو مشورہ دیا۔ رات کو کسی وقت کوشش کر لیں گے!''

''رات کو آپ کا جوڑ جوڑ ہل رہا ہوگا!'' رفیق مجھے سمجھاتے ہوئے بولا ''سفر قیام میں قیام نہیں کرنا چاہیے۔ چلئے مسجد عائشہ سے ملحقہ بازار میں چلتے ہیں۔ وہاں ایک واقف کار ہے امید ہے رش کم ہوگا۔'' وہاں رش تو کم نہیں تھا لیکن بار بر رفیق کا دوست تھا۔ کہنے لگا ''آپ مزیدار چائے پئیں' ایک گھنٹہ تک آپ کی باری آ جائے گی۔ چائے مزیدار تو نہ تھی لیکن جاندار ضرور تھی۔ ایسے پتہ چلتا تھا جیسے چینی اور گرم پانی پیالی میں دست و گریباں ہوں۔ دونوں کی کوشش تھی کہ زیادہ سے زیادہ جگہ گھیری جائے اور اس کشمکش میں چائے کی پتیاں بکھر گئی تھیں دودھ کا حلیہ بگڑ گیا تھا۔ میں نے ایک گھونٹ لیا تو ہونٹ جڑ گئے۔ گلے میں بے پناہ کڑواہٹ کا احساس ہوا۔ زیادہ میٹھا بھی کڑواہٹ میں بدل جاتا ہے اس بات کا ادراک اس دن ہوا۔

بال کٹوا کر واپس آئے تو پارٹی نماز عشاء کے لیے تیار کھڑی تھی۔ میں نے جلدی سے احرام کھولا غسل کیا اور صف میں شامل ہو گیا۔ نماز ختم ہوتے ہی کھانا لگ گیا۔ قربانی کا گوشت گھر پہنچ گیا تھا۔ مولانا صاحب ہر سال کئی بکرے ذبح کراتے ہیں۔ ایک شخص کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ وہ بکرے خرید کر ہم سب کی طرف سے قربانی کرے گا۔ موبائل فون پر اس کے ساتھ رابطہ تھا۔ منیٰ میں بہت بڑے ذبح خانے بنائے گئے ہیں جہاں حفظان صحت کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ بکرا یا اونٹ ذبح ہونے کے بعد مشینوں کے ذریعے کٹتا ہے۔ پہلے بہت زیادہ گوشت ضائع ہو جاتا تھا اس سے بیماریاں بھی پھیلتی تھیں۔ اب حکومت اس کو فوراً ہی جمبو جہازوں کے ذریعے غریب ممالک میں بھجوا دیتی ہے اسی طرح کچھ گوشت کو لڈ سٹوریج میں محفوظ کر لیا جاتا ہے لیکن جہاں تک دن میں پچیس لاکھ دنبے ذبح ہوں وہاں سارے گوشت کو استعمال میں لانا ممکن نہیں ہے۔ آج جب حضرت اسماعیل کی روح منیٰ کا طواف کرتی ہوگی تو یقیناً اس پر وجد طاری ہوتا ہوگا۔ عجز و نیاز اور تسلیم و رضا کا وہ ایک لمحہ جو امر بن گیا' وہ ایک ادا رب العزت کو اور قدر بھائی کے حشر تک باپ بیٹے کی یاد واجب کر دی۔ کروڑوں لوگ ہر سال چشم تصور سے اس نیک بخت بوڑھے ابراہیم کو دیکھتے ہیں جو ایک جوان بیٹے' تیز چھری اور مضبوط رسی کے ساتھ گھر سے نکلا تھا۔ قدموں میں لڑکھڑاہٹ نہ تھی ہاتھ میں لرزش کا شائبہ تک نہ تھا۔ ذہن ہر قسم کے گرد و غبار سے

پاک تھا۔ بیٹے کا جذبہ بے اختیار شوق بھی دیدنی تھا اور وہ الٹا باپ کو تسلیاں دے رہا تھا۔

کشتگان خنجر تسلیم راہ

ہر زمان از غیب جان دیگر است

رات گیارہ بجے ہم طواف کے لیے نکلے۔ مولانا صاحب کو علم تھا کہ رات گیارہ سے ساڑھے گیارہ بجے تک رش نسبتاً کم ہوتا ہے مگر اس کے بعد تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی۔ صبح کو ساڑھے نو سے دس بجے تک بھی کم لوگ ہوتے ہیں۔ طواف شروع کرنے سے پہلے مولانا صاحب نے چند شرعی باتیں بتائیں۔ سر کو نیچے کر کے تیز قدموں کے ساتھ طواف کرنا ہے۔ دائیں بائیں نہیں دیکھنا' تسبیح کے دانوں سے شوطوں کا شمار کرنا ہے' دعائیں جو مولانا صاحب نے پڑھنی تھیں اور ہمیں انہیں صرف دہرانا تھا۔

طواف شروع ہوا' ہم سب تیز قدموں سے چلے۔ دعائیں من وعن دہراتے رہے۔ خشوع وخضوع بھی قائم رہا' تسبیح کے دانے بھی برابر حرکت کرتے رہے لیکن دائیں بائیں دیکھنے والی پابندی قائم نہ رکھ سکے۔ طواف کعبہ کے وقت کعبہ کی جانب بے اختیار نگاہ اٹھ جاتی۔ ہر قدم قربت کے لیے ترستا۔ عظیم عمارت جس کی مٹی حضرت ابراہیم نے گوندھی تھی جس کے پتھر حضرت اسمٰعیل نے اٹھائے تھے جس میں رسالت مآب نے نماز شکرانہ ادا کی تھی' جس کو خالق کائنات نے اپنا مسکن بنایا تھا' اس کی طرف نگاہ کیسے نہ اٹھتی۔

ہر چکر پر کالے کمرے کو سلام کرتے گزرتے۔

طواف بال آخر ختم ہونا تھا سو ہو گیا۔ ہم نے صحن کعبہ میں ہی دو رکعت نماز پڑھی اور پھر سعی کے لیے صفا و مروہ کی طرف چلے گئے۔

رات ایک بجے تک ہم تمام فرائض سے فارغ ہو چکے تھے۔ واپسی پر رفیق گاڑی لے آیا تھا۔ مولانا صاحب کہنے لگے۔ تمہیں سیر مکہ کراتے ہیں۔ ہم نے ایک گھنٹہ تک مختلف سڑکوں پر ڈرائیو کی۔ رش کی وجہ سے وہ گاڑی کو سرکلر روڈ پر لے آیا ایسے پتہ چلتا تھا کہ مکہ اپنے آپ کو دریافت کر رہا ہے۔ بے شمار بلند عمارات کی تعمیر ہو رہی تھی۔ بزنس سنٹر کھل گئے ہیں۔ نئی کالونیاں بنائی جا رہی ہیں۔ چلتے چلتے ایک جگہ میکڈونلڈ برگر کی دوکان نظر آئی تو مولانا صاحب نے رفیق کو رکنے کا اشارہ کیا۔ بولے ''مجھے علم ہے کہ آپ کو برگر بہت پسند ہیں۔ چلو آج آپ کو من پسند کھانا کھلواتے ہیں۔''

میں نے کہا ''رات کا کھانا کھا کر چلے تھے اب گنجائش نہیں ہے پھر کسی دن کھالیں گے!'' مکے میں میکڈونلڈ! مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ حدود حرم میں کوئی غیر مسلم نہیں آ سکتا لیکن انہوں نے اپنے مشروبات اور مالا کوٹ پہنچا دی ہیں۔ حلال وحرام کا مسئلہ بھی کمپنی نے حل کر دیا ہے۔ جانور کمپنی کے اور قصاب عربوں کے۔ پیسہ کمایا عرب میں جاتا ہے اور منتقل امریکہ ہوتا ہے۔ باقی رہی گندم تو یہ حلال و

حرام کی قدغن سے مبرا ہے۔

جب ہم لوٹے تو رات کے دو بج رہے تھے۔ مولانا صاحب کہنے لگے۔ ''اب آرام کریں صبح نماز کے لیے شبیر جگا دے گا۔''

اگلے دو دن ہم نے جمرہ وسطیٰ اور جمرہ عقبہ کے ذریعے شیطانوں کی خوب خبر لی۔ پتہ نہیں یہ ابلیس ملعون کے چیلے تھے یا مختلف روپ۔ رسالت مآب نے جمرہ اولیٰ اور وسطیٰ کے بعد قبلہ رخ ہو کر دعائیں مانگی تھیں۔ ہر کنکری مارنے کے بعد بسم اللہ واللہ اکبر پڑھا تھا۔ سنت رسول واجب ہے تیسرے شیطان کو کنکریاں مارنے کے بعد آپ بغیر دعا کے واپس چلے آئے تھے ہم نے بھی ایسا ہی کیا۔ کنکریاں مارنے کے بعد ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے برسوں کا بوجھ اتر گیا ہو۔ ایک عجیب قسم کا کیتھارسس۔ وہ میل جو تہہ در تہہ دل کے ہر خانے پر جمی ہوتی ہے' تحلیل ہو جاتی ہے۔ بوجھل قدم ہلکے ہلکے محسوس ہوتے ہیں۔ جسم میں ایک انوکھی توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ میں نے حج کر لیا ہے۔ میں حاجی بن گیا ہوں' یہ سوچ ہی روح کو ہلکورے دیتی ہے۔

اگلے چند دن میں نے حرم کے اندر اور مکہ کی گلیوں میں گزارے۔ یہ سوچ کر کہ پھر آنا نصیب ہو یا نہ ہو حرم کے ایک ایک ستون کے ساتھ لپٹا۔ گھنٹوں بیت اللہ پر نگاہیں جمائے رکھیں۔ مرجع خلائق اس کالے کمرے کو ہر زاویے سے دیکھا' ہر دفعہ ایسے محسوس ہوا' جیسے وہ کمرہ نہیں کوئی عدالت ہو۔ کٹہرے میں ایک ملزم کھڑا ہوا ہے۔ ایک طویل فرد جرم پڑھی جا رہی ہو اور ہر دفعہ وہ اقبال جرم کر رہا ہو۔

مدینہ روانگی سے ایک یوم قبل اختر صاحب آ گئے۔ کہنے لگے۔ چلیں آپ کو باقی ماندہ شہر بھی دکھا دیں۔

''کیا کچھ باقی رہ گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

کہنے لگے ''مقامات مقدسہ تو آپ نے دیکھ لیے ہیں۔ آج میں آپ کو سبزی منڈی' فروٹ مارکیٹ اور منی وعرفات لے جانا چاہتا ہوں۔''

''لیکن حج تو ختم ہو گیا ہے اب وہاں کیا دیکھنا ہے؟''

''یہی تو دیکھنے والی بات ہے۔ پچیس لاکھ لوگوں کی نقل مکانی کے بعد شہر کیسا لگتا ہے۔''

''جیسے آپ کی مرضی!'' درحقیقت میرا اشتیاق بڑھ گیا تھا۔ سبزی اور فروٹ منڈی دیکھ کر خاصی حیرت ہوئی۔ شاید دنیا میں اس قسم کا اعلیٰ انتظام نہیں کیا گیا۔ مکمل طور پر ائیر کنڈیشنڈ بدبو اور تعفن جو کہ ہماری منڈی کا خاصا ہیں ان کی رمق تک نہ تھی۔ سڑکیں بالکل صاف شفاف۔ کیلے کا چھلکا تو کجا کاغذ کا ٹکڑا تک نظر نہ آیا۔ شور وغل بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ اپنے مال کو فروخت کرنے کے لیے

کہیں سے کوئی صدا نہ آتی تھی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے مارکیٹ اجناس سے بھری پڑی ہو لیکن دوکاندار مہر بلب ہو۔ ہماری منڈیوں میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ چار سو گندگی کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ دوکاندار مال یوں فروخت کرتے ہیں جیسے تجارت نہ کر رہے ہوں آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہوں۔

اس سلسلے میں لکھنو کی ایک سبزی منڈی کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ادبی دور تھا۔ بال بھی شعر و شاعری میں فروخت ہوتا تھا۔ دو کنجڑے ایک اہل زبان اور دوسرا پنجابی آمنے سامنے بیٹھے ککڑیاں بیچ رہے تھے۔ اہل زبان نے آواز لگائی۔

لیلیٰ کی انگلیاں ہیں' مجنوں کی پسلیاں ہیں' یہ میری ککڑیاں ہیں' یہ میری ککڑیاں ہیں۔ لوگ پل پڑے۔ پنجابی بے بسی اور لاچارگی سے دیکھتا رہا۔ جب دوسری دفعہ لکھنو کے کنجڑے نے وہی آواز لگائی کہ لیلیٰ کی انگلیاں ہیں' مجنوں کی پسلیاں ہیں یہ میری ککڑیاں ہیں' یہ میری ککڑیاں ہیں تو پنجابی کا صبر جواب دے گیا۔ وہ بھی چیخ چیخ کر یہ شعر پڑھنے لگا۔

میری بھی ایسیاں ہیں۔ میری بھی ایسیاں ہیں۔

دنیا جہان کا پھل وہاں دستیاب تھا۔ پائین ایپل' کئی قسم کے سیب' کیلیفورنیا کے مالٹے' کیلے' امرود' سٹرابری' چیری' انار' خوبانیاں' آلو بخارے' آڑو' پیپتے' گرمے' تربوز' ڈرائی فروٹ کی بھی بھرمار تھی۔ کوئی سبزی ایسی نہ تھی جو سلیقے سے پیک کر کے نہ رکھی گئی تھی۔ کھجوروں کا شعبہ الگ تھا کیونکہ یہ پرائیڈ آف عربیا ہیں مگران میں بیسیوں قسم کی کھجوریں ہیں۔ بیگم جنگی' مضاوتی' آب دندان' سبزو اور علینی وغیرہ۔ یہاں سینکڑوں اقسام تھیں۔ کوالٹی بھی ان سے بہتر تھی۔ مکران دراصل کھجوروں کے معاملے میں دریوزہ گر آتش بیگانہ ہے۔ وہ آگ یہیں سے گئی ہے۔ جب عرب حکمرانوں کو بتایا گیا کہ مکران کا پھل کڑوا ہے تو انہوں نے کھجور کے پودے بھجوائے۔ آج کل مکران کھجوروں کی ہمسری کا دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن اپنی کھجوروں پر نازاں ضرور ہے۔ ہم کھجوریں خرید رہے تھے کہ اذان ہو گئی۔ ساری مارکیٹ میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ تولتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ بولتی ہوئی زبانیں بند ہو گئیں۔ ہر قدم مسجد کی طرف اٹھنے لگا۔

نماز پڑھ کر ہم منیٰ کی طرف چلے ہی تھے کہ اختر صاحب کی گاڑی خراب ہو گئی۔ اتر کر پہلے تو وہ اس کے کل پرزوں کے کان مروڑتے رہے لیکن گاڑی خاصی ناراض لگتی تھی۔ پچکارنے پر بھی درست نہ ہوئی تو انہوں نے گاڑی کو دھکیل کر سڑک کے ایک جانب کھڑا کر دیا۔ ''واپس چلیں!'' مجھے قدرے مایوسی ہو رہی تھی۔

بولے ''اپنا پروگرام مکمل کر کے جائیں گے۔''

''لیکن گاڑی تو خراب ہوگئی ہے!''

''گاڑی خراب ہوئی ہے گاڑیاں تو خراب نہیں ہوئیں۔'' وہ مسکرائے

''میں کچھ سمجھا نہیں!'' مجھے واقعی حیرت ہو رہی تھی۔

بولے عرب بڑے اچھے لوگ ہیں۔ جس گاڑی کو چاہیں ہاتھ دے کر روک لیں وہ آپ کو منزل مقصود تک پہنچا دے گی!''

''کمال ہے!'' میں نے کہا ''اس قدر مہمان نواز! پہلے تو ایسے نہ تھے''

''اب بھی نہیں ہیں۔ ہر شخص لفٹ ضرور دیتا ہے لیکن اس کی قیمت وصول کرتا ہے اور اس میں کسی قسم کی سبکی محسوس نہیں کرتا۔''

ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ ایک گاڑی قریب سے گزری۔ اسے کوئی عرب نہیں بلکہ ایک بلوچ چلا رہا تھا۔ اختر صاحب نے ہاتھ دیا تو کچھ فاصلے پر جا کر گاڑی رک گئی اور وہ اسے ریورس کر کے پیچھے لے آیا۔ ''کہاں جانا ہے؟'' اس نے ہماری شکل صورت سے قومیت کا اندازہ لگا لیا۔

''منیٰ' مزدلفہ اور عرفات!'' اختر صاحب بولے۔

''چالیس ریال!'' اس نے غور سے اختر صاحب کے چہرے کا جائزہ لیا۔

''تیس'' اختر صاحب بھی آخر پاکستانی تھے اپنے بھائی بندوں کی نفسیات کو سمجھتے تھے۔

چلیں گا!'' اس نے دروازہ کھول دیا۔

یقین نہیں آتا تھا کہ ہم منیٰ کی طرف جا رہے ہیں۔ کھلی سڑکیں' گاڑی فراٹے بھر رہی تھی۔ کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ حد نگاہ تک کوئی ذی نفس نظر نہ آیا۔ منیٰ پہنچے تو حیرانی مزید بڑھ گئی۔ کوئی ویرانی سی ویرانی تھی۔ کیا شہر اس قدر جلد بنتے اور اجڑ جاتے ہیں؟ بالکل طلسماتی شہر لگتا تھا جہاں سوائے زخمی ابلیس کے کوئی نہ تھا۔ وہ مارکیٹیں' بازار' ہوٹل' ریستوران' ہاؤ ہو' شور وغل' سب ختم ہو چکا تھا۔ خیمے گڑے تھے لیکن مکین غائب تھے۔ شیطانوں کو قریب جا کر دیکھا تو اور حیرانی ہوئی۔ ان کے قریب پڑے ہوئے جوتوں کے انبار اور پتھروں کے ڈھیر صاف ہو چکے تھے۔ میونسپل کمیٹی کا عملہ صفائی میں مصروف تھا۔ ان کی مرہم پٹی کرنے والے مستری بھی اپنے کام میں جتے ہوئے تھے کیونکہ اگلے سال پھر انہیں مسلمانوں کے غیض وغضب کا شکار بننا تھا۔

مزدلفہ کی وسعت کا اندازہ بھی اب ہوا۔ نہایت وسیع وعریض میدان' پتھروں سے اٹا ہوا۔ عرفات سے خیمے اکھاڑے جا چکے تھے۔ یہ رقبہ کے لحاظ سے مزدلفہ سے بھی بڑا تھا۔ مزدلفہ ایک پٹی کی طرح ہے جو پہاڑ کے دامن میں بچھی ہوئی ہے۔ جبل رحمت عرفات

کی پیشانی ہے۔ باقی پہاڑ کافی پیچھے ہٹے ہوئے ہیں۔ ہم چند گھنٹے گھومتے رہے۔ جبل رحمت پر اب بھی کچھ لوگ چڑھ رہے تھے۔ مسجد نمرہ بالکل ویران لگتی تھی۔

واپسی پر بلوچ ڈرائیور سے گپ شپ رہی' نوجوان لڑکا تھا۔ قلات کے دور دراز علاقے سے والد کے ساتھ آیا تھا۔ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ کہنے لگا ''وڈھ میں جو بھوک پیاس ہم نے دیکھی ہے اس سے اس حکومت کی پابندیاں کہیں بہتر ہیں' کم از کم دو وقت کی روٹی تو آرام سے ملتی ہے۔ وہاں تو مفلسی ہاتھ جوڑتی نظر آتی ہے۔ میلوں تک سایہ دار درخت نظر نہیں آتا۔ اول تو پانی ملتا نہیں اور اگر کہیں مل بھی جائے تو گندہ اور بدبودار۔ اہل وطن کو اندازہ نہیں کہ لوگ وہاں کس طرح رہتے ہیں۔ وہ ہمیں بلڈنگ تک چھوڑ کر چلا گیا۔ اختر صاحب نے بھی اجازت چاہی بولے ''کسی مستری کو لے جا کر گاڑی ٹھیک کراؤں گا۔''

جب اوپر آیا تو سوائے جندوڈہ کے کوئی نہ تھا۔ سب حرم شریف جا چکے تھے۔ جندوڈہ نے کہا کہ مولانا صاحب کہہ گئے ہیں کہ آپ حرم شریف آ جائیں۔ میں نے منہ ہاتھ دھویا' وضو کیا اور چائے کی ایک پیالی پی کر فوراً چلا گیا۔ نماز مغرب شروع ہونے والی تھی۔ ہجوم اس قدر زیادہ تھا کہ مولانا صاحب تک پہنچنا محال تھا۔ میں نے نماز حرم کی بیسمنٹ میں ادا کی۔ نماز کے بعد جب بھیڑ کم ہوئی تو میں اوپر آیا۔ مولانا صاحب درس دے رہے تھے۔ ایک ہزار کے لگ بھگ لوگ ان کا درس سن رہے تھے۔ گزشتہ کئی دنوں سے وہ مناسک حج اور اس سے متعلقہ شرعی مسائل پر گفتگو کر رہے تھے اب جبکہ حج ہو چکا تھا تو مولانا صاحب سیرت نبی پر علم و حکمت کے موتی بکھیر رہے تھے۔ تاریخ حدیث۔ تفسیر قرآن اور منطق پر تو ہمیشہ ان کی گرفت مضبوط رہی تھی لیکن اب کے ایسے پتہ چلتا تھا جیسے دماغ سے نہیں دل سے باتیں کر رہے ہیں۔ مجمع پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ انسان کامل کی پیغمبرانہ شخصیت کے کئی نئے پہلو سامنے آ رہے تھے۔ مولانا صاحب کا لیکچر جاری تھا کہ عشاء کی اذان ہو گئی۔ مولانا صاحب نے لیکچر بند کر دیا اور صفیں درست ہونے لگیں۔

نماز پڑھ کر ہم باہر نکلے۔ صحن کعبہ خاصا وسیع تھا وہاں سے نکلنے میں ہمیں کچھ وقت لگ گیا۔ ایک تو کھوے سے کھوا چھل رہا تھا پھر بے شمار لوگ مولانا صاحب کو جانتے تھے۔ وہ انہیں نہایت عقیدت سے ملتے اور چلتے چلتے کوئی شرعی مسئلہ پوچھ لیتے۔ جب ہم صحن کے آخری کونے پر پہنچے تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ فرش پر شہباز شریف اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا صاحب کو آتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ان سے بغل گیر ہو گئے۔ مجھے دیکھا تو بڑے حیران ہوئے۔ مصافحہ کیا اور میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ شاہ صاحب کیسے پہنچ گئے؟''

''بس بلاوا آ گیا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہاں بلاوا ہی تو آتا ہے!'' ان کا لہجہ فلسفیانہ ہو گیا۔ کہنے لگے۔ ''بیوروکریسی سے میرا رویہ قدرے سخت رہا ہے لیکن میں آپ سے آخری ملاقات نہیں بھولا۔ مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ آپ نے وہ سب باتیں کس جرات کے ساتھ کر ڈالیں؟''

''اس میں میری جرات کم اور آپ کی عالی ظرفی زیادہ تھی۔ جب آپ نے کچھ پوچھ ہی لیا تھا تو میرا فرض بنتا تھا کہ بغیر خوشامد کے آپ کو سچی اور کھری باتیں بتلا دوں۔''

کہنے لگے ''میں اس قسم کی باتیں سننے کا عادی نہیں تھا لیکن اس دن آپ کی ہر بات دل میں اترتی گئی اور میں کئی دنوں تک تجزیہ کرتا رہا۔''

میں نے کہا ''جو کاسہ لیس ہوتے ہیں وہ ہر حاکم وقت کو سب اچھا کا راگ سنا کر شیشے میں اتارتے ہیں۔ پروفیشنل Honesty کا تقاضہ یہی ہوتا ہے کہ اندیشہ ہائے دور دراز سے بے نیاز ہو کر بات کی جائے۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا۔ آپ ناراض ہو جاتے۔ مجھے او۔ ایس۔ ڈی بنا دیتے''

جب ہم گھر پہنچے تو رات کے دس بج رہے تھے' سائیں جندوڈہ سب کا انتظار کر رہا تھا۔ ہم کھانا کھا کر مولانا صاحب کے کمرے میں جمع ہوئے۔ مکہ میں میری آخری رات تھی۔ اگلی شام مجھے شہر نبی جانا تھا۔ احمد لمبات' سعید شاہ آبادی اور مولانا ظفر صاحب بھی مدینہ جا رہے تھے لیکن ہم ہمسفر نہیں تھے۔ قواعد وضوابط کے مطابق مجھے معلم کی فراہم کردہ ٹرانسپورٹ میں جانا تھا کیونکہ پاسپورٹ اس کے پاس تھا اور وہ کسی قیمت پر میرے حوالے کرنے پر راضی نہ تھا۔ درحقیقت معلم سے ملاقات کی حسرت ہی رہی۔ یہ بات اس کے نائبین نے بتائی۔ مولانا صاحب نے مدینہ منورہ میں بھی میری رہائش کا بندوبست کر دیا تھا۔ مسجد نبوی کے بالکل قریب ان کا ذاتی مکان رباط مکی تھا۔ دراصل یہ مکان ان کے والد مرحوم نے خریدا تھا اور اسے عملاً انہوں نے دوست احباب اور پاکستان سے آئے ہوئے حاجیوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مولانا صاحب نے بھی اس روایت کو قائم رکھا اور لنگر کا اضافہ کر دیا۔ کہنے لگے۔ وہ مکان شاید اتنا آرام دہ نہ ہو لیکن میں نے اپنا ذاتی کمرہ آپ کے لیے مختص کر دیا ہے۔ منیجر مولوی منظور کو ضروری ہدایات دے دی ہیں وہ آپ کا ہر طرح سے خیال رکھے گا۔

''مسجد نبوی کے قریب پورا کمرہ! اور کیا چاہیے!'' میں نے کہا۔ مولانا صاحب نے مجھے مکان کا پتہ اور فون نمبر لکھ کر دیا۔ رئیس وزیر کہنے لگے۔ ''اڈے پر میرا خاص آدمی مہر سعید کار لے آئے گا اور آپ کو رباط مکی تک لے جائے گا۔ بڑا تابع فرمان ہے' آپ کو جب بھی گاڑی کی ضرورت ہو فون کر کے منگوا لیا کریں!'' میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ رئیس صاحب کا مدینہ شریف میں ذاتی مکان

بھی ہے لیکن وہ حرم شریف سے خاصا دور ہے۔

رات مولانا صاحب اور دیگر احباب سے کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ آخری رات تھی' علمائے دین کی صحبت روز روز کہاں نصیب ہوتی ہے۔ مولانا صاحب نے سیرت نبی پر اپنے لیکچرز پر مبنی چالیس کیسٹیں دیں۔ کہنے لگے۔ انہیں سن لینا کتاب لکھتے وقت خاصی مدد ملے گی۔ میں نے کہا۔ ''یہ کیسٹیں یقیناً تجسس و تحقیق اور علمیت کی مظہر ہیں اور میں انہیں ضرور سنوں گا لیکن میں جس کیفیت میں مبتلا ہوں وہاں دماغ نہیں بلکہ دل کے دروازے کھولنا پڑتے ہیں۔ تمام عمر جو سنا' جو سوچا' جو چاہا' کل ان خواہشوں کی تکمیل ہونے والی ہے۔'' مولوی کڑوا بولے'' پاسبان عقل کو دل کے ساتھ رکھنا چاہیے نہیں تو شرک کی سرحدیں کچھ اتنی دور نہیں ہوتیں۔''

''وہ آپ جیسے عالموں کا کام ہے جو ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتے ہیں' تجسس و تحقیق کی تگناؤں سے گزرتے ہیں۔ عشق ماورائے فہم و ادراک ہے۔''

''آپ بھی کس بحث میں پڑ گئے!'' مولانا صاحب مسکرائے۔ شاہ صاحب! کوئی ایسا شعر سنائیں کہ محفل وجد میں آ جائے۔''

''شعر تو نہیں اگر کہیں تو ایک لطیفہ سنا دوں'' احمد لمبات کہنے لگے۔

''اس قدر ریاضت اور عبادت کے بعد بھی آپ کو لطیفے یاد ہیں!''

کہنے لگے۔ ''ہر چیز کا اپنا وقت ہوتا ہے۔ عبادت کے وقت عبادت' کام کے وقت کام۔''

مولانا صاحب ان سے اتفاق کرتے ہوئے بولے۔ ''آپ نے ان کو جنوبی افریقہ میں نہیں دیکھا یہ کام بھی عبادت سمجھ کر کرتے ہیں لیکن زاہد خشک نہیں ہیں۔''

کافی دیر باتیں ہوتیں رہیں۔ پھر میں اجازت لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ رات بھیگ رہی تھی۔ میں نے کپڑے تبدیل کئے اور کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ مکہ اونگھ رہا تھا۔ حج سے پہلے والی گہما گہمی نہ تھی۔ حاجیوں نے مدینہ منورہ جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ لوگ جو پہلے مدینہ گئے تھے اب واپس وطن جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ شہر پر آبادی کا جو بے پناہ دباؤ تھا وہ بتدریج کم ہو رہا تھا۔ اس شہر سے میں نے بے شمار گلے شکوے کئے تھے۔ کبھی کبھی غم و غصے کا اظہار بھی کیا تھا لیکن اس آخری رات جب میں نے کھڑکی سے جھانک کر شہر پر الوداعی نظر ڈالی تو دل بھر آیا۔ ایک عجیب سی کسک مجھے اپنے سینے میں محسوس ہوئی۔ عقیدت و احترام کا مدوجزر ابھرا۔ چودہ سو سال کی تاریخ نگاہوں میں گھومنے لگی۔ وہ تاریخ جس کی ابتدا اس شہر سے ہوئی تھی۔ روشنی کے دائرے پھیلتے گئے' پھیلتے گئے حتیٰ کہ ایک جہاں ان کی ضیا پاشیوں سے منور ہو گیا۔ اس شہر نے کئی دور دیکھے۔ مختلف مراحل سے گزرا۔ مسرت و انبساط' درد و داغ' لیکن اس

کا پائے استقامت متزلزل نہ ہوا۔ اللہ کا گھر جو ٹھہرا۔ مولد نبی' حضرت ابراہیم کے خوابوں کی تعبیر۔ اموی' عباسی' فاطمی' عثمانی' کئی خاندان برسر اقتدار آئے۔ اکثر اقتدار کے نشے میں چور چور رہے لیکن یہاں آ کر ہر اکڑی ہوئی گردن جھک گئی۔ شاہ گدا ایک نظر آئے سب مانگنے والے۔ دعائیں' مسلسل التجائیں' آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی' دل کے نہاں خانوں سے نکلتی ہوئیں۔ کسی شہر کی عظمت' ہیبت اور جلال کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

ماڈرن سعودی عرب کی تاریخ ۱۹۰۲ سے شروع ہوتی ہے جب شاہ عبدالعزیز اور اس کے حامیوں نے ریاض پر قبضہ کر لیا اور اس طرح سعودی حکومت کی داغ بیل ڈالی۔ عبدالعزیز ۱۸۸۰ میں پیدا ہوا۔ اس نے دشت غربت میں آنکھ کھولی۔ اپنے والد کے ساتھ جلاوطنی کی حالت میں کویت میں رہا۔ جوانی تک وہ انتقام کی آگ میں سلگتا رہا۔ ایک ہی خواہش جنون بن کر اس کے حواس پر سوار رہی۔ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کا حصول۔ جفاکشی عزم و ہمت' اور چالاکی اس کی شخصیت کے نمایاں پہلو تھے۔ آل رشید کے ساتھ اس کی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ حاکم حجاز الرشید بھی اس کی طرح بڑا جفاکش تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ کسی مغربی سفیر سے صحرائی خیمے میں ملاقات کر رہا تھا کہ ایک بچھو اس کی عبا میں گھس گیا اور اسے کاٹنا شروع کر دیا۔ ناقابل برداشت درد کے باوجود اس نے کوئی اضطراری حرکت نہ کی اور نہ مہمان کو یہ تاثر دیا کہ وہ کس عذاب میں مبتلا ہے۔ جب سفیر ملاقات کر کے چلا گیا تو اس نے عبا اتار کر بچھو کو مسل دیا۔ اس وقت تک اس کا سارا جسم زخمی ہو چکا تھا۔ آل رشید نے اس جدوجہد کے دوران ایک دفعہ عبدالعزیز کو لکھا کہ ان دونوں کی دشمنی کی وجہ سے سارا حجاز پریشان ہے اور بے شمار عرب مارے جا چکے ہیں۔ آؤ کیوں نہ ہم آپس میں ڈوئیل لڑ لیں جو حق پر ہو گا جیت جائے گا اور اس طرح مسلمان کو اس عذاب مسلسل سے نجات مل جائے گی۔"

"ان دو آدمیوں میں ایک بنیادی فرق ہے۔" عبدالعزیز نے جوابی خط لکھا "ایک وہ جو مرنے پر مصر ہے اور دوسرا وہ جو زندہ رہ کر حکمرانہ کرنا چاہتا ہے۔"

عبدالعزیز نے بال آخر ایک طویل جدوجہد کے بعد اسے شکست دی اور اس طرح ماڈرن سعودی خاندان کا بانی بنا۔

عبدالعزیز نے ایک بکھری ہوئی سلطنت کی شیرازہ بندی کی' امن امان بحال کیا اور انتظامی ڈھانچے کی تنظیم نو کی۔ سرداری نظام کے تحت ہر شیخ اپنے قبیلے کا مالک و مختار تھا لیکن بادشاہ کو مخصوص حالات میں مداخلت کا اختیار تھا۔ سب کو اس بات کا ادراک تھا کہ دشمن اندر نہیں باہر ہے۔ مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور جوڑ توڑ سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس کا خمیازہ بھی بھگت چکے تھے۔ چنانچہ شاہ کو قبیلے کے سرداروں کی وفاداریاں حاصل کرنے میں کوئی خاص وقت پیش نہ آئی۔

جس عزم، جانفشانی اور محنت سے شاہ عبدالعزیز نے سلطنت کے حصول اور بعد میں استحکام کے لیے کام کیا تھا اس کا اثر صحت پر پڑنا ہی تھا۔ وہ تہتر سال کی عمر میں فوت ہو گیا' تو اس کے بڑے بیٹے سعودی بن عبدالعزیز نے عنان حکومت سنبھالی۔ چونکہ اندرونی استحکام حاصل ہو چکا تھا اس لیے اس نے اپنی تمام تر توجہ خارجی امور پر دی اور پڑوسی ممالک کے ساتھ تعلقات استوار کئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے تعلیم کے فروغ اور سماجی کاموں پر بھی خاصی محنت کی۔ خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کی توسیع کا کام بھی اس کے زمانے میں شروع ہوا لیکن اس وقت تک دولت کی ریل پیل نہ تھی۔ کالا سیال (تیل) کالے سونے میں تبدیل نہ ہوا تھا۔ ترقیاتی کاموں کے لیے جو مناسب رقم درکار تھی وہ فراہم نہ ہو سکی۔ گیارہ سال کی حکمرانی کے بعد وہ اپنے بھائی شاہ فیصل کے حق میں حکومت سے دست بردار ہو گیا۔

شاہ فیصل زیادہ زیرک اور بیدار مغز تھا۔ اس وقت تیل کی آمدن بھی توقع سے زیادہ ہونے لگی۔ اس نے دوررس پالیسیاں مرتب کیں جن کا مقصد معاشی استحکام کے علاوہ لوگوں کا معیار زندگی بلند کرنا تھا۔ پہلا ترقیاتی منصوبہ ۷۰-۱۹۶۹ء میں شروع کیا گیا۔ فیصل کے دور میں سعودی عرب دنیا کا سب سے بڑا تیل برآمد کرنے والا ملک بن گیا اور دولت کی چمک نے ہر بدو کی آنکھ کو خیرہ کر دیا۔ خوشحالی نے چار سو ڈیرے ڈال دیئے۔ اب صحرائی جہاز (اونٹ) صحرا میں نہیں چلتا بلکہ ائیر کنڈیشنڈ پک اپس میں سفر کرتا ہے۔ بدو اس کے کوہان سے نکلا ہوا گدلا پانی نہیں پیتے بلکہ مغربی مشروبات سے اس کی تواضع کرتے ہیں۔ فیصل اسلامی دنیا کا غیر اعلانیہ روحانی لیڈر بن گیا۔ خادم حرمین شریفین' دوررس نگاہ رکھتا تھا' زیرک اور معاملہ فہم تھا۔ اس قسم کا مسلمان معروضی حالات میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتا۔ وہ بال آخر مغرب کی آنکھ میں کھٹکنے لگا۔ مسلم اتحاد مغربی معیشت کے لیے تازیانہ تھا۔ کہتے ہیں کہ مسلمان واقعے کے بعد سوچتا ہے۔ لیکن تاجر انگریز پہلے سے پیش بندی کرتا ہے۔ چنانچہ وہی ہوا جو اکثر چھوٹے ملکوں کے بیدار مغز حکمرانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک گہری سازش کے تحت اس کو اپنے بھتیجے کے ہاتھوں قتل کروایا گیا۔ جانشینی کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ عبدالعزیز بیٹوں کی ایک فوج کھڑی کر گیا تھا۔ اس کا بھائی شاہ خالد تخت نشین ہوا اور فہد بن عبدالعزیز کو کراؤن پرنس بنا دیا گیا۔

تیل سے پہلے ہی بڑی آمدن تھی اب اس کے چشمے سونا اگلنے لگے۔ شہر پھیلنے لگے۔ عمارتیں ثریا سے سرگرم سخن ہونے لگیں۔ لوگوں کا معیار زندگی بلند سے بلند تر ہوتا گیا اور شاہی خزانہ کناروں سے چھلکنے لگا۔ اس کے باوجود سخت گیر قوانین کی وجہ سے بغاوت کے آثار پیدا ہوئے لیکن باغیوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ سراسر عاقبت نااندیشانہ اور احمقانہ تھا۔ ۱۹۷۹ میں کئی سو باغیوں نے حرم شریف پر قبضہ کر لیا۔ لاؤڈ اسپیکروں کی مدد سے انہوں نے شاہی خاندان پر تنقید شروع کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ لوگ ان کی ہمنوا ہو کر

مملکت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونگے لیکن یہ خیال خام تھا۔ لوگوں نے خانہ کعبہ کی بے حرمتی کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ دس دن کی لڑائی کے بعد ۱۱۷ باغی مارے گئے باقی ۶۳ پکڑے گئے اور وہ بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئے۔

خالد جون ۱۹۸۲ میں فوت ہو گیا تو شاہ فہد تخت نشین ہوا۔ ایران عراق جنگ اور بعد میں عراق کویت کشمکش اس کے دور میں ہوئیں۔ ۱۹۸۰ میں سعودی حکومت نے امریکی فوجیوں کی مملکت میں آنے کی اجازت دے دی۔ کویت کی جنگ تو جیتی گئی لیکن مملکت کا خزانہ خالی ہو گیا۔ ایک سفید ہاتھی گھر کو تباہ کر دیتا ہے جہاں لاکھوں کی تعداد میں آ جائیں وہاں مملکتیں ہل جاتی ہیں۔ یہ غالباً واحد جنگ تھی جس میں مغربی ممالک کو مالی فائدہ ہوا۔ ہزاروں عراقی سپاہی خندقوں میں زندہ دفن کر دیئے گئے باقی الجوع الجوع (بھوک۔ بھوک) کہتے ہوئے باہر نکل آئے۔ عراق معاشی طور پر تباہ ہو گیا اس کی عسکری قوت تہس نہس ہو گئی۔ لوگ نان جویں کو ترسنے لگے۔ اس واقعہ کو بھی بارہ سال ہو گئے ہیں۔ ایک نئی نسل جوان ہو گئی ہے لیکن صدام ہنوز زندہ ہے۔ حکمران ہے اور عرب دنیا کا ہیرو ہے۔

صبح اگر شبیر دروازے پر مسلسل دستک نہ دیتے تو میری نماز قضا ہو جاتی۔ میں نے اٹھ کر وضو کیا اور مولانا صاحب کے ساتھ نماز پڑھنے قریبی مسجد میں چلا گیا۔ واپسی پر ناشتہ کے بعد انہوں نے کہا کہ طواف وداع کر آؤ کیونکہ اس وقت بھیڑ کم ہو گئی۔ میں نے جلدی جلدی ہوائی چپلیں پہنیں اور اکیلا ہی طواف کے لیے چل پڑا۔ راستے میں انڈونیشیا کی عورتوں نے جگہ جگہ زمین پر سامان کے سٹال لگا رکھے تھے۔ ان کے زیادہ تر گاہک بھی اہل وطن تھے۔ یہ غریب لوگ حج کے لیے آتے ہیں بازار جا کر تھوک کے بھاؤ بدیشی اشیا خریدتے ہیں اور پھر سارا دن اس کڑکتی دھوپ میں پرچون کا سامان بیچتے ہیں۔ مجھے راستے میں ایک دو جگہ انہوں نے روکنے کی کوشش کی لیکن ایک تو زبان اجنبی تھی پھر مجھے کچھ خریدنا نہ تھا۔ میں نو بجے حرم پہنچا تو وہاں رش کم تھا۔ طواف کرتے ہوئے کم وقت صرف ہوتا ہے۔ لیکن آدمی جی بھر کر خانہ خدا کو دیکھتا ہے شرطوں کی سرزنش کے باوصف دیواروں کو مس کر سکتا ہے' چوم سکتا ہے اور دل کا غبار نکال سکتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ بڑی عجیب کیفیت تھی جیسے وطن سے غریب الوطن ہو رہے ہوں۔ نعمت غیر مترقبہ سے محروم ہو رہے ہوں۔ خون رگوں میں سرپٹ دوڑنے لگا۔ آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی۔

طواف ختم ہو گیا' مراحل صفا و مروہ طے ہو گئے۔ نماز شکرانہ ادا ہوئی لیکن قدم بھاری پتھر بن گئے۔ بوجھل دل' بھیگی آنکھیں' ڈگمگاتے قدم' کیسے واپس جاؤں' میں نے سوچا۔ میں کافی دیر تک حرم کے صحن میں بیٹھا رہا۔ لوگوں کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ ایرانی حاجی' ترک' انڈونیشی' پاکستانی۔ سارا ماحول تلاوت قرآن کر رہا تھا۔ ایک بے نام سی خامشی ایک موہوم سی امید' ایک انوکھا خیال۔ لاشعور میں تہہ در تہہ کلبلاتا ہوا۔ رگ جاں میں گردش کرتا ہوا۔ رخ سے نقاب اٹھا کر بڑی دیر ہو گئی۔

میں واپس آیا تو سورج نصف النہار پر تھا۔ گرمی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ انڈونیشی عورتیں بھی اپنا سامان سمیٹ کر کمروں میں چلی گئی تھیں۔ میں کمرے میں جانے کی بجائے نیچے سائیں جندوڈہ کے پاس بیٹھ گئے۔ جندوڈہ لیاقت پور کے گاؤں ٹھل حمزہ کا رہنے والا تھا۔ گزشتہ کئی سالوں سے مولانا صاحب کے پاس ملازم تھا۔ ان کی شفقت کی وجہ سے بالکل فرد خانہ لگتا تھا ویسے بھی اس شہر پروقار میں کوئی نوکر نہیں ہوتا' کوئی مالک نہیں ہوتا۔ جہاں مالک کائنات رہتا ہے وہاں سوائے عجز و نیاز کے کچھ نہیں ہوتا۔ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔

اپنے غلاموں کو بھی وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو۔ وہی پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔ یروشلم میں لوگ دم سادھے' نظریں جمائے بڑے شوق سے شہر کے مرکزی دروازے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اچانک ایک ناقہ نمودار ہوتا ہے۔ ایک شخص نے اونٹ کی مہار پکڑ رکھی ہے غبار میں اٹا ہوا ہے۔ دوسرا مزے سے کجاوے میں بیٹھا ہے۔ شور بلند ہوتا ہے بلند تر ہو جاتا ہے۔ مشتاق نگاہیں کجاوے کی طرف اٹھتی ہیں۔ وہ رہا امیر المومنین سب انگلیاں ایک ساتھ اٹھتی ہیں..... ''نہیں! کہیں سے آواز بلند ہوتی ہے۔'' وہ دوسرا! جو اونٹ کی مہار پکڑے ہوئے ہے۔''

''تو آپ آج جا رہے ہیں؟'' جندوڈہ کی آواز میں بلا کا خلوص تھا۔

''ہاں' سائیں! جانا تو ہے؟''

کچھ دن اور کیوں نہیں رک جاتے؟

''کاش ایسا ہو سکتا! لیکن جانا تو ایک دن ہے ہی!''

''پھر کب آئیں گے۔''

''جب وہ بلائے گا۔ میں نے بیت اللہ کی طرف اشارہ کیا۔''

''لیکن یہ علما صاحبان تو سال میں دو مرتبہ آتے ہیں!''

''یہ نیک لوگ ہیں۔ گنہگاروں کو کبھی کبھی دعوت ملتی ہے۔''

''وہ آپ کو ضرور بلائے گا۔'' جندوڈہ نے پیش گوئی کی۔

''اچھا! وہ کیسے؟'' مجھے اس کا لہجہ اچھا لگا۔''

''آپ لکھتے دکھتے ہیں؟''

''ہاں۔تھوڑا بہت!''

''وہ آپ کوضرور بلائے گا۔''اب کے اس کے لہجے میں بلا کا وثوق اور تیقن تھا۔

رات روانگی کے وقت میں نے مولانا صاحب سے مصافحہ کیا تو دل بھر آیا۔اس قدر محبت اور شفقت۔عام حالات میں اس تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا مولانا ملکی درویش صفت انسان ہیں۔ارباب بست وکشاد اور صاحب ثروت لوگ ان کے اردگرد منڈلاتے رہتے ہیں اور ان سے مل کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ایک عجیب شان استغنار کھتے ہیں۔ایک بڑا آدمی درس کے وقت شاید اس امید پر کھڑا رہا کہ وہ متوجہ ہونگے لیکن انہوں نے درس جاری رکھا اور اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔میری پاکستان میں ان سے کئی ملاقاتیں ہوئیں لیکن مختصر تھیں پھر ان میں اکثر اوقات میری حیثیت ایک میزبان کی تھی۔یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ انہوں نے مجھے شرف میزبانی بخشا تھا۔کہنے لگے۔شاہ صاحب آپ کو پھر آنا ہوگا۔کھل کر باتیں نہیں ہوئیں۔حج کا موسم نہایت مصروفیت کا وقت ہوتا ہے۔''رئیس وزیر' مولانا مطیع الرحمن۔شبیر' میجر جاوید' احمد لمبات' قاری طیب' قاری وحید' سب سے باری باری ملا۔جب میں نیچے آیا تو رفیق میرا سامان کار کی ڈگی میں رکھ چکا تھا۔

معلم کا دفتر کچھ زیادہ دور نہ تھا اگر ہوتا بھی تو رفیق کی ڈرائیورانہ صلاحیتوں کا میں معترف ہو چکا تھا۔ہزار گاڑیوں میں سے دائیں بائیں گھومتا گاڑی نکال لیتا۔جب ہم معلم کے دفتر پہنچے تو رات کے دس بج چکے تھے۔حسب توقع معلم غائب تھا لیکن اس کا نائب موجود تھا۔وہ ملتان کا رہنے والا تھا اور جب سرائیکی میں بات کرتا تو اپنائیت کا احساس ہوتا۔اس نے بڑے اہتمام سے کڑک چائے منگوائی۔کہنے لگا۔رات کا سفر ہے۔یہ بڑی جاندار چائے ہے آپ کو اونگنے نہیں دے گی۔چائے واقعی مزیدار تھی گرم تھی لیکن یہاں بھی چینی کا فراخدلانہ استعمال کیا گیا تھا۔ہر گھونٹ کے بعد محسوس ہوتا جیسے گرم سیال حلق کے نیچے اتر رہا ہے اور چینی رگوں میں جذب ہو رہی ہے۔میں نے رفیق کو مشورہ دیا کہ وہ چلا جائے لیکن وہ اس کے لیے تیار نہ تھا۔کہنے لگا۔مولانا صاحب نے حکم دیا ہے کہ جب تک بس نہیں چلتی تم نے واپس نہیں آنا۔ہمیں کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔کرسٹر بھی مشرقی محبوب کی طرح غمزہ وعشوہ ادا دکھلا رہی تھی۔گیارہ بجے آئی اور جھلک دکھلا کر چلی گئی۔استفسار پر پتہ چلا کہ تیل ڈلوانے گئی ہے۔آدھے گھنٹے بعد جب کنگھی پٹی کر کے آئی تو آتے ہی پھر سرک گئی۔مزید کریدنے پر معلوم ہوا اصل ڈرائیور کو تلاش کرنے نکلی ہے۔مزید ایک گھنٹہ گزر گیا۔کھڑے کھڑے حاجیوں کی ٹانگیں دکھنے لگیں۔اب کے آئی تو اس کے سرکا سائیں بھی ساتھ تھا۔سائیں دولہا کم اور سادھو زیادہ لگتا تھا۔ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے ربڑ کے بت میں جان پڑ گئی ہے۔پستہ قد' خودرو داڑھی' چھوٹی لیکن چمکدار آنکھیں اور میلے پیلے دانت' یہ مصری ڈرائیور تھا جو

ٹرانسپورٹ کمپنی نے حج کے دنوں کے لیے پارٹ ٹائم ملازم رکھا تھا۔ مصری ڈرائیوں کے متعلق ہمیں بتایا گیا تھا کہ جب تک ان کی ہتھیلی گرم نہیں کی جاتی یہ مسافروں کو پریشان کرتے ہیں۔ کوسٹر کے سولہ مسافروں میں سے اکثریت پیسے دینے کے حق میں نہیں تھی۔

خدا خدا کر کے بارہ بجے رات کوسٹر چلی۔ میں نے رفیق کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہا تو گاڑی موڑ کاٹ کر مرکزی شاہراہ پر آ گئی۔ گاڑی چلنے سے پہلے رفیق نے ہشیاری سے میرا سامان فرنٹ سیٹ پر رکھوا دیا تھا اس لیے میں کسی کے ساتھ سیٹ شیئر نہیں کر رہا تھا بلکہ ڈرائیور کا مدمقابل تھا۔ یعنی ایک طرف ڈرائیور دوسری طرف میں' سامنے ونڈ اسکرین اور پیچھے' کھانستے' چیختے چلاتے' باتیں کرتے لوگ۔

کوسٹر مرکزی شاہراہ پر تو آ گئی تھی لیکن اس نے سپیڈ نہیں پکڑی تھی۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے چل نہیں رینگ رہی ہے۔ ڈرائیور کی باڈی لینگوئج سے پتہ چلتا تھا جیسے کسی ذہنی خلفشار کا شکار ہو۔ وہ نصف گھنٹہ تک شہر کی مختلف سڑکوں پر گھومتا رہا آخر جب اس نے گاڑی حرم شریف کی طرف موڑی تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ خریت تو ہے؟ میں نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔

''نہیں!'' اس نے ہاتھ کو الٹا سیدھا جھٹکا۔ اس نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی اور اتر کر ٹریفک کانسٹیبل سے چند منٹ باتیں کرتا رہا۔

دراصل وہ راستہ بھول گیا تھا اور شہر سے باہر نہیں نکل پا رہا تھا۔ اب کے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تو اس کے چہرے پر خود اعتمادی تھی۔ کچھ دیر تو وہ سیدھا چلتا رہا اور زیر لب گنگنانا بھی شروع کر دیا لیکن پھر ایک غلط موڑ اور ہم جہاں سے چلتے تھے وہیں پہنچ گئے۔ پیچھے ایک شور سا اٹھا۔ احتجاج۔ مذاق اور مایوسی یکجا ہو گئے تھے۔ اب کے وہ گاڑی سے نہ اترا بلکہ بیٹھے بیٹھے ہی ایک راہگیر سے راستہ پوچھا۔ الاطول۔ راہ گیر نے بیزاری سے اسے دیکھا۔ یہ کیسا ڈرائیور ہے جو مدینہ کا راستہ نہیں جانتا۔ ڈرائیور غالباً طول اور عرض کا فرق نہیں سمجھتا تھا اس لیے ہر بار غلطی کر جاتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے سواریوں پر غصہ اتارنے کے لیے اس نے یہ ڈرامہ رچایا ہو۔ خدا خدا کر کے وہ مکہ سے باہر نکلا۔ رات کا ایک بج گیا تھا۔ جب گاڑی مدینہ شاہراہ پر کچھ دیر چلی تو سواریاں اونگنے لگیں۔ پیچھے سے چند ایسے جاندار خراٹے آئے کہ انجن کا شور بھی ان سے دبتا ہوا محسوس ہوا۔ ''تم نے نہیں سونا'' اس نے اشاروں میں مجھے سمجھایا' نہیں تو میں بھی سو جاؤں گا۔

''برے پھنسے۔'' میں نے سوچا۔ مجھے علم تھا کہ ڈرائیور رات کے وقت فرنٹ سیٹ کے مسافر کو سونے نہیں دیتے کیونکہ اس کا براہ راست اثر ڈرائیور پر پڑتا ہے۔

جدہ تک تو میں جاگتا رہا۔ گاڑی شہر میں داخل نہ ہوئی بلکہ بائی پاس سے گزر گئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں عربی نہیں سمجھتا وہ میرے ساتھ عربی میں باتیں کرتا رہا۔ میں بھی ہاں ہوں کرتا رہا۔ دراصل وہ ٹیسٹ کرنا چاہتا تھا کہ کہیں میری آنکھ تو نہیں لگ گئی۔ ساتھ ساتھ پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ مجھے سائیڈ اسکرین ایڈجسٹ کرنے کا کہتا۔ جدہ سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک چھوٹ سا گاؤں آیا تو اس نے تیل ڈلوانے کے لیے گاڑی روکی۔ ہاتھ کی انگلیوں سے سمجھاتے ہوئے اس نے ہمیں دس منٹ دیئے کہ اگر کوئی چائے پینا چاہے تو پی لے۔ کوئی شخص نہ اترا۔ میں نے اتر کر دو کپ کافی کے پیئے۔ منہ پر پانی کا چھٹا مارا اور ٹھنڈی ہوا میں چند گہرے سانس لیے۔ وقتی طور پر میری نیند کافور ہو گئی تھی۔

اب کے گاڑی چلی تو اس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ انگریزی میں پوچھنے لگا۔ ''وات از یور نیم؟ وچ کنٹری؟'' ارے تم انگریزی جانتے ہو!'' میں نے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

''تل بتل!''

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا'' میں نے گلہ کیا۔

کہنے لگا ''میں بروکن انگلش ''ٹوٹی پھوٹی' انگریزی بولتا ہوں۔''

''مجھے تو تمہاری عربی پر بھی شک ہے!''

''وہ کیسے؟'' اس نے پہلی مرتبہ مجھے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

''جو شخص مدینے کا راستہ پوچھے وہ اہل زبان نہیں ہو سکتا!''

''ہو سکتا ہے!'' وہ لفظوں پر بوجھ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''میں قاہرہ کا رہنے والا ہوں۔ حجاز سے پوری طرح واقف نہیں۔''

''تو پھر تمہیں آنا نہیں چاہیے تھا۔''

پیسہ بہت ملتا ہے۔ وہ بے حیائی سے مسکرایا''

''کونسا تم نے لندن کی سٹاک مارکیٹ میں جانا ہے۔ در رسول پر ایک منٹ کی تاخیر بھی جو کو ہلکان کر دیتی ہے۔ تم مصر کے باسی ہو' پتہ نہیں ان باتوں کو سمجھتے بھی ہو یا نہیں!''

''سمجھتا ہوں!'' وہ ناک چڑاتے ہوئے بولا۔ ''اگر عرب مصر فتح نہ کرتے تو ان کے پاس موم بتی نہ ہوتی۔ اولڈسٹ سولائزیشن ..... لینڈ آف فیراز.....!''

''لیکن انہوں نے تو خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور بال آخر غرق نیل ہوئے۔''

بولا'' تھے تو جی دار انسان۔ یزداں سے ٹکرا گئے۔''

''تم نے ریمسز دوم کی اہ وزاری نہیں سنی۔ کس طرح بچوں کی طرح بلبلایا تھا۔ گڑگڑایا تھا۔ رویا تھا۔ اور غرق ہونے سے پہلے اپنے گناہوں کی معافی مانگی تھی۔''

''کیا تم اس وقت تھے؟'' اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

''نہیں! لیکن اس کی ہچکیوں کی آواز آج بھی تاریخ کے مدفن سے سنائی دیتی ہے۔

''اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!'' اس نے تین مرتبہ نعرہ بلند کیا اور گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ گاڑی میں مکمل خاموشی تھی۔ خراٹے آنے بھی بند ہو گئے تھے۔ ڈرائیور گاڑی کو محتاط انداز سے چلا رہا تھا۔ میری نیند اڑ چکی تھی۔ کافی اپنا اثر دکھا گئی تھی۔ ڈاکٹر جانسن کے متعلق مشہور ہے کہ کافی کے بیسویں کپ کے بعد وہ لکھنا شروع کرتا تھا۔ میں نے دوسرے کپ کے بعد ہی بولنا شروع کر دیا۔

مدینے کا راستہ طویل ہو گیا تھا۔ رات کے سفر نے گاڑی کی رفتار کو محدود کر دیا تھا۔ ڈرائیور کو بھی نیند کے ایک دو جھٹکے لگے تو مجھے خیال آیا کہ اس کو کچھ عرصے کے لیے آرام کا مشورہ دیا جائے۔

''تم چاہو تو گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے کچھ دیر سو سکتے ہو!''

بولا'' اس کی اجازت نہیں ہے۔ راستے میں گاڑی کھڑی نہیں کی جا سکتی اگر کمپنی کو پتہ چل گیا تو میں بلیک لسٹ ہو جاؤں گا۔''

''اور اگر نیند کی حالت میں کسی پہاڑی سے ٹکرا گئے تو؟''

''تو کمپنی کی شامت آ جائے گی!''

ہم نے پھر باتیں شروع کر دیں۔ اب کے میں نے سوچا کہ اس کو باتوں میں مصروف رکھا جائے۔ کہتے ہیں نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے' یہ تو پھر ائیر کنڈیشنڈ کوسٹر پر بیٹھا ہے۔

آہستہ آہستہ اندھیرا چھٹنے لگا۔ رفتہ رفتہ سپیدہ سحر نمودار ہونا شروع ہوا۔ مشرق سے سورج تو نہیں نکلا تھا لیکن آثار بتا رہے تھے کہ کسی وقت بھی روشنی کی یلغار ہو سکتی ہے۔ میدنے سے پچاس میل پہلے آخری پڑاؤ تھا اس نے گاڑی روک دی۔ بلند آواز سے بولا۔

''حاجی نماز پڑھ لیں۔ آدھے گھنٹے کی مہلت دی جاتی ہے۔''

سب مسافر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہوٹل کے ساتھ ہی مسجد تھی۔ مسجد سے ملحقہ غسل خانوں میں وضو کا معقول بندوبست تھا۔ سب

نے نماز پڑھی۔ نماز پڑھ کر میں کافی پینے چلا گیا۔ جاگنے کا نسخہ میرے ہاتھ آ چکا تھا۔ جب میں کافی پی کر گاڑی میں آیا تو مسافر باہر کھڑے تھے۔ میرے استفسار پر ایک مسافر نے بتایا کہ ڈرائیور گاڑی کے دروازے بند کر کے اندر سو رہا ہے۔ ہم نے مسلسل شیشوں اور دروازے کو کھٹکھٹایا تو اس نے مرغ کی طرح سرخ آنکھیں کھولیں۔ دو تین دفعہ انہیں اپنے میلے کچیلے ہاتھوں سے ملا اور چہرے پر مصنوعی حیرت طاری کرتے ہوئے بولا۔ ''اتنی جلدی نماز ختم کر ڈالی؟''

جب سواریاں بیٹھ گئیں تو کہنے لگا ''اب میں نماز پڑھنے جاتا ہوں۔ آپ انتظار کریں۔''

انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ جب وہ کافی دیر تک واپس نہ آیا تو میں چند مسافروں کو لے کر اس کی تلاش میں نکلا۔ وہ مسجد کے ایک کونے میں دبیز قالین پر مزے سے سو رہا تھا۔ میں نے اسے سختی سے جھنجھوڑا۔ ''اٹھو اور فوراً کوسٹر چلاؤ نہیں تو مجھے تحریری طور پر کمپنی کا شکایت کرنی پڑے گی۔''

''تو کیا کمپنی مجھے پھانسی پر لٹکا دے گی۔'' اسے میری سرزنش اچھی نہ لگی۔

''بلیک لسٹ ہو جاؤ گے۔ پھر وہیں قاہرہ میں اہراموں سے سر ٹکراتے رہو گے۔''

وہ غصے سے پیر پٹختا ہوا گاڑی کی طرف چل پڑا۔ مدینہ پہنچنے تک اس نے کسی سے بات نہ کی۔ صبح آٹھ بجے گاڑی مدینہ منورہ کے مضافات میں جا کر رک گئی۔ رپورٹنگ اسٹیشن پر بے شمار گاڑیاں کھڑی تھیں وہاں سے ہمیں ٹوکن حاصل کرنے میں ایک گھنٹہ لگ گیا۔ اب کے جو گاڑی چلی تو سیدھی پاکستان ہاؤس جا کر رکی۔

باہر نکلتے ہی مست ہوا کا جھونکا آیا اور روح کو سرشار کر گیا۔ چار سو بڑی عجیب سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جس نے مشام جاں کو تر و تازہ کر دیا۔ گاڑیاں آ جا رہی تھیں' لوگ سامان اتار رہے تھے لیکن مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ سارے وجود میں ایک عجب سی ہلچل مچی تھی۔ جبین نیاز میں سجدے تڑپ رہے تھے ایسے محسوس ہوتا جیسے دل میں بجلیاں دوڑ رہی ہوں۔ برس ہا برس کی تمنا ایک خوشگوار حقیقت بن کر میری نظروں کے سامنے تھی۔ مسجد نبوی کہاں ہے؟ ''روضہ رسول پر حاضری میں اس قدر تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔'' میں اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا! اچانک چودہ سو سال کی تاریخ ایک بار پھر روشن سورج کی طرح میری نظروں کے سامنے ابھری۔ یہ میں دیکھ رہا ہوں۔ کالی کملی اور خوبصورت زلفوں والا یہ کون شخص ہے جو قصویٰ پر بیٹھا شہر میں داخل ہو رہا ہے۔ سارا شہر گھروں سے باہر نکل آیا ہے۔ مرد' عورتیں' بوڑھے' بچے کئی روز سے منتظر تھے' پیغمبر آ رہے تھے۔ رسول اللہ پہنچنے والے ہیں۔ یہی دو لفظ ہر شخص کے ورد زبان ہیں۔ استقبال کرنے والوں میں انصار مدینہ کے علاوہ مہاجرین بھی ہیں۔ انتظار کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹتیں۔ یہ کون لوگ ہیں جو دیدہ و دل

فرش راہ کیے بیٹھے ہیں۔ جناب امیر' حضرت ابوعبیدہ' مقداد' خباب' سہل' صفوان' عیاض' عبداللہ بن مخترمہ' وہب بن سعد' ممرین بن ابی سرح' عمیر بن عوف..... اچانک دور سے چند سوار نظر آتے ہیں۔ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا پھر قرائن' شواہد اور کوائف کی رو سے جان گیا کہ رسالت مآب تشریف لا رہے ہیں۔ اس کے حلق سے نکلی ہوئی صدا دیر تک فضا میں گونجتی رہی۔ ''اے اہل عرب' انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ سنو' سنو مژدہ جانفزا۔ سرور کونین تشریف لاتے ہیں۔'' چار سو خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ نعرہ تکبیر سے فضا گونج اٹھی۔ لوگ پروانہ وار لپکے۔ مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلے پر قبا کے مقام پر عمرو بن عوف کا مکان تھا۔ آپ نے پہلے چودہ دن وہیں قیام فرمایا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں مسجد کی بنیاد رکھی جو آج کل مسجد قباء کے نام سے مشہور ہے۔ پہلی مسجد تھی' اس کی شان میں آیت تو اترنی تھی سو خوب اتری..... چودہ دن کے بعد جمعہ کے روز آپ نے شہر کی طرف کوچ فرمایا۔ شاہ دو عالم کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے دو رویہ صفیں لگ گئیں۔ ہر شخص اپنا تن' من' دھن نچھاور کرنے کے لیے تیار تھا۔ عرب عورتوں نے دف پر گانا شروع کر دیا۔ ''کوہ وداع کی گھاٹیوں سے چاند نکل آیا ہے۔ خدا کا شکر ادا کرو۔ کیا اچھا ہمسایہ نصیب ہوا ہے..... ہر شخص کی خواہش تھی کہ آنحضور اسے شرف میزبانی بخشیں لیکن یہ رتبہ بلند جسے ملنا تھا مل گیا۔ کوکبہ نبوی حضرت ایوب انصاری کے گھر جا کر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے مجھے جھنجھوڑا۔ ''کہاں کھو گئے ہو؟ سب مسافر جا چکے ہیں۔ اپنا سامان اتارو' میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔'' میں نے اپنا اکلوتا سوٹ کیس چھت پر سے اتارا اور بلڈنگ میں داخل ہونے والا تھا کہ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بولا: ''حدیث ہے کہ مسلمانوں کو زیادہ دیر تک ایک دوسرے سے ناراض نہیں رہنا چاہیے۔ یہ شہر رسول ہے یہاں کبیدہ خاطر ہونا منع ہے۔''

''شکر ہے کہ تم نے اس تمام عرصے میں کوئی تو صحیح بات کی ہے۔'' ہم دونوں بغلگیر ہو گئے۔

سامان لے کر میں کاؤنٹر پر آیا چند پاکستانی اہلکار کھڑے تھے۔ میں نے انہیں کارڈ دکھایا۔ انہوں نے رجسٹر پر ضروری اندراج کیا اور چوتھی منزل پر میرے کمرے کی نشاندہی کی۔ میں نے چابیاں مانگیں تو مسکرا کر کہنے لگے۔ ''کمرہ کھلا ہے ایک کمرے کی چار چابیاں نہیں ہوتیں۔'' بعض مسکراہٹیں ہزار وضاحتوں پر حاوی ہوتی ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے 3x6 فٹ کا گدا الاٹ ہوا ہے' کمرہ نہیں دیا گیا۔ یہ کمرہ مکہ کے کمرے سے بھی گیا گزرا تھا۔ وہاں ٹائیلٹ کمرے کے اندر تھا یہاں اس تکلف سے بھی پرہیز کیا گیا تھا۔ البتہ حاجی دو تھے۔ میں نے ان سے مصافحہ کیا۔ ایک تو سابق چیف جسٹس فرنٹیئر چیف کنڈی کے صاحبزادے تھے اور دوسرے صاحب

برطانیہ میں پاکستانی ہائی کمشن کے اہلکار تھے۔ ان سے کچھ دیر رسمی باتیں ہوتیں رہیں۔ زیادہ زور ڈائریکٹر حج کے عملے کی ناجوازیوں پر تھا۔ میں نے سفری بیگ کھول کر صابن برش اور ٹوتھ پیسٹ نکالی اور جب کمرے کے باتھ روم میں جا کر شیشے کے سامنے کھڑا ہو کے اپنا سراپا دیکھا تو مارے حیرت کے صابن فرش پر جا گرا۔ بائیں آنکھ گرما کے مثل صاعقہ طور ہوگئی تھی۔ اس میں سے پانی مسلسل بہہ رہا تھا۔ پلکوں کو دیکھ کر یوں گمان ہوتا تھا جیسے کسی نے ان پر مائع لگا دی ہو۔ رتجگا اپنا کام کر گیا تھا۔ میں نے دانت صاف کیے اور چہرے پر مسلسل پانی کے چھپکے مارے لیکن آنکھ اور پلکیں ٹس سے مس نہ ہوئیں...... اب کیا کیا جائے! میں یہ سوچتا ہوا نیچے لابی میں آ گیا۔ اتفاق سے بلڈنگ کی ڈسپنسری کھلی تھی۔ وہاں ایک پاکستانی لیڈی ڈاکٹر ڈیوٹی پر موجود تھی۔ میں نے معائنہ کرایا تو حیران ہوتے ہوئے بولی۔ کیا کرتے رہے ہو۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے ساری رات اس سے کشتی لڑی ہے۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں' بس میں نے اسے جھپکنے نہیں دیا''

''جبھی یہ بغاوت پر اتر آئی ہے۔'' اس نے نسخہ لکھا اور دو قسم کے آئی ڈراپس دے کر بولی۔ ''انفیکشن ہوگئی ہے دوا اور ٹھنڈے پانی کا مسلسل استعمال ہی کچھ ریلیف دے دے گا۔ دوا لے کر میں واپس کمرے میں آیا اور آنکھوں میں دوا ڈال کر لیٹا ہی تھا کہ مسجد نبوی کے میناروں سے ظہر کی اذان بلند ہوئی۔ میں یوں ہڑبڑا کر اٹھا جیسے وہ زندگی کی آخری نماز تھی۔ شہر رسول میں حدیث رسول یاد آئی۔ چالیس مسلسل نمازیں مسجد نبوی میں۔ رسالت ماب نے جنت کی بشارت دی تھی اگر نہ بھی دیتے تو مسجد بذات خود جنت سے کم نہ تھی۔ دیگر روم میٹ بھی بیدار ہو گئے۔ وضو ہم نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ بھاگم بھاگ مسجد جا پہنچے جو زیادہ دور نہ تھی۔ مسجد میں نماز پڑھ کر وہ تو واپس آ گئے لیکن میں باوجود شدید تھکن کے رباط مکی کی تلاش میں چل پڑا۔ مسجد کے بالمقابل' سڑک کے دوسری جانب اوبرائے ہوٹل ہے جتنے ہی بڑے ہوٹل یا ہائی رائیز بلڈنگز ہیں وہ مسجد اور حرم کے اردگرد بنائی گئی تھیں۔ پانچ وقت نماز پڑھنے میں آسانی رہتی ہے۔ اوبرائے کے ساتھ ہی تین چار بازار ہیں۔ میں نے چند لوگوں سے عمارت کا پتہ پوچھا لیکن انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ چلتے چلتے مجھے ایک پنساری کی دوکان نظر آئی جہاں ایک پستہ قد مین اپنے ساتھی دوکاندار سے جھگڑ رہا تھا۔ گالیوں کی غلیظ بوچھاڑ تھی وہ مشین گن کی گولیوں کی طرح ٹک ٹک مخالف پر برسا رہا تھا۔ گالیاں اس قدر خود ساختہ اور رس بھری تھیں کہ مخالف نے ہتھیار ڈال دیئے اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو پا رہا تھا۔ مدمقابل نہ دیکھ کر اس نے ان کا رخ اپنی طرف موڑ دیا اور اس دن کو کوسنے لگا جب اس نے دوکان پر نوکری شروع کی تھی۔ کچھ دیر تو میں اپنی محدود و کیملری میں اضافہ کرتا رہا مگر تا کیے! میں نے ڈرتے ڈرتے اس سے رباط مکی کا پتہ پوچھا۔ مجھے علم نہیں........ اس نے غصے کا بھاوڑا مجھے بھی کھینچ مارا...... میں مایوس ہو کر چلنے والا ہی تھا

کہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''ذرا رکیے۔ کیا کہا؟

''مولانا مکی کا گھر کہاں ہے؟'' میں نے سوال دہرایا.....

''اوہ بھئی معاف کرنا۔ میں پہلے سمجھا نہیں۔ اس لیے تو کہتے ہیں کہ غصہ حرام ہے۔ حضرت مولانا کا گھر وہ سامنے ہے۔'' اس کا سارا غصہ واقعی کافور ہو گیا تھا۔

گیٹ پر مولانا صاحب کا ملازم مولوی منظور میرا انتظار کر رہا تھا۔ کہنے لگا: ''مولانا صاحب کا دو مرتبہ فون آ چکا ہے۔ اتنی دیر لگا دی۔ خیریت تو تھی؟ سامان کہاں ہے؟''

''سامان پاکستان حج مشن میں ہے شام تک آ جائے گا۔''

''تو آئیں میں آپ کو کمرہ دکھا دوں۔ وہ مجھے کمرے میں لے آیا۔ خاصا کھلا کمرہ تھا۔ ایک پلنگ کے علاوہ فوم کا گدا بھی فرش پر بچھا ہوا تھا۔ اٹیچڈ باتھ روم کی سہولت بھی میسر تھی۔ ''ٹھیک ہے؟'' مولوی منظور نے اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

''ایکدم فرسٹ کلاس''

''تو دوسری منزل پر چلیں کھانا تیار ہے'' مولوی منظور نے مرغ کری اور دال بنا رکھی تھی۔ تنور کی گرم گرم روٹیاں بھی اس کا نائب لے آیا۔ اس دن کھانے کا مزہ ہی کچھ اور تھا.....

بستر پر لیٹ تو گیا لیکن باوجود شدید تھکن کے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ایک موہوم سا خوف کہ اگر آنکھ لگ گئی تو نماز قضا ہو جائے گی۔ میں انہیں سوچوں میں غرق تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو وہاڑی کے مولانا ظفر احمد اور احمد لمبات کھڑے تھے۔ بولے ''جلدی کریں عصر کی نماز کا وقت ہو رہا ہے۔''

اس دن بہت رش تھا۔ ساری مسجد اس کے اوپر کا حصہ اور صحن لوگوں سے بھرے پڑے تھے۔ ''یہیں صحن میں جائے نماز بچھا لیتے ہیں' میں نے مولانا ظفر کو مشورہ دیا۔

''ہرگز نہیں! نماز روضہ رسول سے ملحقہ جگہ پر پڑھیں گے اس جگہ نے آنحضور کے قدم بار بار چومے تھے۔'' ان کے لہجے میں بلا کا یقین تھا۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولے: ''دراصل لوگ بھیڑ اور دھکم پیل سے گھبراتے ہیں بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔''

''اگر جگہ نہ ملی تو؟''

بولے: مل جائے گی جو بلاتا ہے جگہ کا انتظام بھی وہی کرتا ہے۔'' مولانا کی بات درست تھی۔ ہم صفوں کو پھلانگتے جب کنوپی کے

نیچے پہنچے تو اس رش میں بھی ایک خلا نظر آیا۔ ہم صف میں کھڑے ہو گئے۔ نماز کے بعد جب لوگ کم ہوئے تو میں نے مولانا صاحب کو کہا کہ روضہ مبارک کی زیارت کی جائے۔ کہنے لگے شام کو دروازہ کھلے گا' نماز عشاء کے فوراً بعد ہم جی بھر کر زیادرت کریں گے ابھی میں آپ کو مسجد دکھلاتا ہوں۔

اگر مسجد نبوی کی نفاست' وسعت' حسن اور طرز تعمیر کی تفصیل بیان کی جائے تو پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ یہ یقیناً ماڈرن طرز تعمیر کا شہکار ہے جس میں جگہ جگہ اسلامی کلچر جھلکتا ہے۔ جمال وجلال کا حسین امتزاج۔ اٹلی کا سنگ مرمر برماٹیک' چیکوسلواکیہ کے شینڈلیر موزیک' کشیدہ کاری' سلیک ستون' خود بخود کھلنے اور بند ہونے والی چھتیں' سونے کے پانی سے لکھی ہوئی قرآنی آیات' خطاطی کا بہترین نمونہ' گہرے سبز دبیز قالین' اسکیلیٹر' بہترین ساؤنڈ سسٹم دامن نگاہ تھامتے ہوئے۔ عقیدت وحیرت جب یکجا ہو جائیں تو آدمی وجد اور سرور کی آخری منزلوں تک پہنچ جاتا ہے۔

کسے معلوم تھا کہ حضور نے جس مسجد کی بنیاد رکھی ایک دن ساری دنیا میں اس کے تذکرے ہوں گے۔ دنیا بھر کے مسلمان نماز پڑھنے آئیں گے۔ ماہرین اس کے فن تعمیر پر بحث کریں گے۔ ٹیلی ویژن پر خصوصی پروگرام نشر ہوں گے۔ ابتدا کیا تھی! حضور نے خاندان نجار سے زمین کا ایک ٹکڑا خریدا۔ جب گارے سے تعمیر شروع ہوئی تو شہنشاہ دوعالم مزدوروں کے لباس میں تھے۔ رجز کے درمیان صحابہ پتھر اٹھا کر لاتے تو آپ بھی اس آواز میں اپنی آواز شامل کر دیتے۔

اے خدا کامیابی صرف آخرت کی کامیابی ہے۔ اے خدا انصار اور مہاجرین کو بخش دے۔

مسجد سادگی کا نمونہ تھی۔ کچی اینٹوں کی دیواریں' کھجور کے ستون' اس کے پتوں کے چھپر' پہلے قبلہ بیت المقدس کی طرف تھا لیکن جب کعبہ کا حکم آیا تو شمالی سمت ایک نیا دروازہ بنایا گیا۔ پہلے کچا فرش تھا بارش کی صورت میں کیچڑ پھیل جاتی جس سے نماز پڑھنے میں دشواری پیش آتی۔ صحابہ کرام نے اس کا حل یہ نکالا کہ کنکریاں لے آئے۔ رسالت مآب کو یہ ترکیب پسند آئی اور سنگریزوں کا فرش بنوا دیا۔ مسجد کے ایک طرف مسقف چبوترا تھا جو صفہ کہلاتا تھا یہ ان لوگوں کے لیے تھا جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا لیکن اپنے گھر بار نہیں رکھتے تھے۔ چھوٹی سی مسجد اس سے ملحقہ امہات المومنین کے حجرے' حضور جب اعتکاف میں ہوتے تو سر مبارک باہر نکال لیتے اور وہ ان کے بال دھو دیتیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ مسجد کی توسیع ہوتی رہی۔ بادشاہان وقت اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہے۔ آج اگر مادی اور روحانی اعتبار سے دیکھا جائے تو دنیا کی کوئی عبادت گاہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کلیسا' سائینا گاگ' مندر' دھرم شالے سب اس کو حیرت وحسرت سے دیکھتے ہیں۔

ہم کافی دیر تک مسجد میں گھومتے رہے لوگ ٹولیوں میں بٹے بیٹھے تھے۔ کچھ تلاوت کر رہے تھے' جو زیادہ تھک گئے تھے وہ وہیں لیٹ گئے تھے..... چلتے چلتے مجھے خیال آیا کہ سامان تو ابھی حج مشن کی بلڈنگ میں پڑا ہے۔ مولانا ظفر احمد صاحب سے بات کی تو بولے۔ ابھی نماز مغرب میں کافی وقت ہے۔ چلیں لے آتے ہیں۔ پاکستانی حج مشن کی عمارت ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ ہم پیدل ہی پہنچ گئے۔ کمرے میں کنڈی صاحب اور ان کے دوسرے ساتھی موجود نہ تھے۔ خیال تھا کہ نصف گھنٹے کے دوستوں سے مل کر جانا چاہیے لیکن زیادہ دیر انتظار بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے سوٹ کیس اور سفری بیگ اٹھایا اور لفٹ کے ذریعے نیچے آ گیا۔ مولانا صاحب لابی میں موجود نہ تھے۔ ریسپشنسٹ نے بتایا کہ باہر کسی شخص سے باتیں کر رہے ہیں۔ مولانا صاحب باہر ایک نوجوان شخص سے اپنی واپسی کے متعلق پروگرام بنا رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ''شاہ صاحب! مقصود صاحب سے ملیں یہ بھی تلہ گنگ کے رہنے والے ہیں۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا لیکن پہچان نہ سکا۔ کہنے لگے۔ ''میں ملک انور کا بیٹا ہوں اور محلہ پیر بخاری میں رہتا ہوں۔'' مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ ان کے والد نہایت حلیم الطبع انسان تھے اور تلہ گنگ میں ان کی نسوار بنانے کی فیکٹری تھی۔ وہ گذشتہ چھ سال سے یہاں تعینات تھے۔ بولے ''آپ نہ جائیں میں آپ کو علیحدہ کمرہ دیتا ہوں۔''

میں نے معذرت کی۔ ''رباط مکی مسجد نبوی سے ایک اذان کے فاصلے پر ہے۔ مشن بلڈنگ سے پانچ وقت آنا جانا مشکل ہوگا۔'' مقصود صاحب نے مشن کی کار منگوائی اور ہم سامان لے کر رباط پہنچ گئے۔

نماز عشاء بھی ہم نے اسی جگہ پر پڑی۔ امام کی قرات بڑی دلنشین تھی لیکن امام عبدالرحمن والی بات نہ تھی۔ نماز کے بعد رش بڑی تیزی سے گھٹنے لگا۔ سارے دن کے عبادت گزاروں کو واپس جانے کی جلدی تھی کیونکہ اکثریت نے پھر علی الصبح تہجد اور نماز کے لیے مسجد آنا تھا۔ زیارت روضہ رسول! میں نے مولانا کی طرف دیکھا۔ جذبہ بے اختیار شوق نے سارے وجود کو تپا دیا تھا۔ بولے ''جلدی کریں۔ نصف گھنٹے میں دروازے بند ہو جائیں گے۔ وہ نصف گھنٹہ کیسے گزرا! جسم و جاں کی تمام حسیات سمٹ کر ایک نکتے پر مرکوز ہو گئیں تھیں۔ جب روضہ کی بیرونی جالی کو تھاما تو اشکوں کی لڑی نے چہرے کو تر کر دیا۔ میں حاضر ہوں یا رسول اللہ۔ عقیدت بھری آواز میرے حلق سے نکلی۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے کاندھے سے پکڑ رہا ہے۔ جالی سے الگ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہاں بھی شرک شرک کی کھردری آوازیں سنائی دیں۔ اتنے میں زائرین کا ایک زبردست ریلا آیا جو شرک اور شرطے کو بہا کر لے گیا۔ آہ و بکا۔ گریہ وزاری تمام مجمع فریاد کناں' نوافل پڑھنے کا کس کو ہوش تھا۔ مولانا ظفر بھی زار قطار رو رہے تھے۔ آنسوان کی گھنی داڑھی میں یوں ٹک گئے تھے جس طرح برسات میں سبز پتوں پر شبنم جم جاتی ہے ہر کوئی اشک بہا رہا تھا ہر شخص درود شریف کا ورد کر رہا تھا۔ ہر

کسی کو یقین تھا کہ رسالت مآب اس کی آواز سن رہے ہیں۔ ہر فریاد پر غور فرما رہے ہیں۔ اپنے جانثاروں کو دیکھ رہے ہیں۔ اپنے غلاموں کے سر پر دست شفقت رکھ رہے ہیں۔ رحمت العالمین اپنے غلاموں کی نہ صرف عاقبت بلکہ دنیا بھی سنوارتے ہیں۔

لحد شریف کے اردگرد دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ دیواروں کو آہنی جالیوں میں جکڑ دیا گیا ہے۔ پتنگوں کو شمع سے دور بھی رکھ دیا جائے تو بھی ان کا سوز دروں نہیں جاتا۔ شمع رسالت کی روشنی کو کوئی دیوار نہیں روک سکتی کوئی بھی سیاست درباں کارگر نہیں ہوتی۔ روضہ مبارک کی حدود میں داخل ہوتے ہی ہر اندھیرا چھٹ جاتا ہے۔ وجود روشن ہو جاتے ہیں۔ کثافت کافور ہو جاتی ہے۔ وہ نصف گھنٹہ جو میرا اپنا تھا۔ وہ مختصر گھڑیاں جو تمام عمر پر حاوی تھیں' وہ لمحے جو ماورائے زمان و مکان تھے۔

نصف گھنٹہ گزر گیا۔ اب کے دربان زیادہ تعداد میں اندر داخل ہوئے اور لوگوں کو باہر دھکیلنے لگے۔ ہم باہر نکل آئے۔ مولانا پر ہنوز رقت طاری تھی۔ ہم گنبد خضریٰ کے سائے میں بیٹھ گئے۔ ہمارے وجود' کھجور کی شاخ کی طرف لرز رہے تھے۔ کچھ دیر ہم چپ چاپ گم سم بیٹھے رہے پھر جونا گہاں میری نگاہ اوپر اٹھی تو درد ایک مرتبہ پھر لہر در لہر میرے وجود میں اترنے لگا۔ گنبد خضریٰ پر چند بلب جل رہے تھے یا مظہر العجائب۔ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ ہمیں کیا ہو گیا ہے ہمارے دلوں پر تالے لگ گئے ہیں۔ ہمارے ذہن ماؤف ہو گئے ہیں۔ سارا شہر روشنیوں میں بار ہا ہے۔ مسجد ہزاروں برقی قمقموں کی وجہ سے جگ مگ' جگ مگ کر رہی ہے۔ اندھیروں کو شہر بدر کر دیا گیا لیکن گنبد خضریٰ پر اس قدر خست سے کام لیا گیا ہے۔ سبز رنگ بھی ماند پڑ گیا ہے پتہ چلتا ہے کافی دیر سے رنگ روغن نہیں ہوا۔ انسان عجیب مخلوق ہے بعض اوقات اپنے محسن کو بھی نہیں پہچانتا۔ اگر نعوذ باللہ رسالت مآب نہ آتے تو کیا ہوتا۔ عرب میں خاک اڑتی۔ ردائے عقل کی دھجیاں صحرائے نجد میں اڑتیں۔ دولت کی ریل پیل محض خواب میں خیال ہوتی۔ فکر انسانی ارتقال منازل طے نہ کر پاتی' ہر طرف کفر و الحاد کی حکمرانی ہوتی..... ہم مقرض ہیں' ہمارا بال بال قرض رسالت میں جکڑا ہوا ہے۔

جب ہم رباط مکی پہنچے تو مولوی منظور ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''بڑی دیر کر دی۔ احمد لمبات نے بھی آپ کی وجہ سے کھانا نہیں کھایا۔'' آپ ہاتھ دھوئیں میں کھانا لگاتا ہوں۔'' کھانا کھا کر ہم کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ مولوی منظور اور احمد لمبات میں نوک جھونک ہوتی رہی۔ منظور ساٹھ کے پیٹے میں ہوگا' قد جتنا لمبا ہے اتنا ہی چوڑا ہوگا۔ فیروزہ کا رہنے والا ہے۔ فیروزہ خانپور اور لیاقت پور کے درمیان ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ منظور گزشتہ بارہ سال سے سعودی عرب میں ہے۔ مولانا صاحب کا ملازم بھی ہے اور منیجر بھی۔ تمام بلڈنگ کا انتظام و انصرام اس کے پاس ہے۔ تین منزلہ عمارت میں 16 کمرے ہیں۔ حج کے دنوں میں اس کا کنٹرول بنگالی ٹھیکیدار سنبھال لیتے ہیں جس طرح کراچی کی ٹرانسپورٹ پر پٹھانوں کی مناپلی ہے اسی طرح مدینہ کی بلڈنگز پر بنگالیوں کا تسلط

ہے۔نہایت ہشیار لوگ ہیں۔ پیشہ وارانہ مہارت رکھتے ہیں اور دن رات محنت کرتے ہیں۔

مجھے تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ پچھلی رات میں نے آنکھوں میں گزار دی تھی بلکہ ایک آنکھ میں گزاری تھی۔ بائیں آنکھ میں ہلکا ہلکا درد شروع ہو گیا تھا۔ میں اجازت لے کر نیچے کمرے میں آیا۔ آنکھ میں دوا ڈالی اور بستر پر لیٹتے ہی سو گیا۔

صبح اگر مولوی منظور نہ جگاتا تو شاید نماز فجر قضا ہو جاتی۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور وضو کر کے باہر آ گیا۔ باہر خاصی خنکی تھی اذان ہو چکی تھی۔ لوگ ٹولیوں میں بے مسجد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ حرم شریف کے برعکس یہاں عورتوں کے لیے الگ انکلوژر بنایا گیا تھا۔ وہاں ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ مجھے دروازے کے قریب ہی جگہ مل گئی۔ نماز پڑھ کر جب میں بازار سے گزر رہا تھا تو میری نظر ایک ہوٹل کے بورڈ پر پڑی۔ مطعم نور۔ ایک لاہوری کا ہوٹل تھا۔ ہوٹل کا باورچی گھی میں پوریاں تل رہا تھا۔ حلوہ پوری' چنے' پائے' شب دیگ' نہاری ہر چیز دستیاب تھی۔ گاہک بھی کھانوں کے ساتھ پورا انصاف کر رہے تھے۔ ایسے پتہ چلتا تھا کہ شہر لاہور بنفس نفیس چل کر مدینہ پہنچ گیا ہو۔ مرغن' چٹ پٹے کھانے' ٹکا ٹک' جی تو بہت للچاتا ہے لیکن ایک عرصہ ہوا میں نے اپنے آپ کو ان سے محرام کر رکھا ہے لہٰذا میں نے چائے کا ایک کپ خریدا اور باہر کھڑے کھڑے اسے ختم کر ڈالا۔ واپس آ کر میں پھر سو گیا۔ گیارہ بجے کے قریب از خود میری آنکھ کھل گئی۔ جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ قیام چاہے سفر کے دوران کیا جائے یا بعد میں' سفر کی تھکن بدن کو شل کر دیتی ہے۔ میں نے اٹھ کر دانت صاف کیے شیو کی اور نہا کر مسجد کی طرف چل پڑا۔

نماز ظہر کے بعد ہمارا قبا قبلتین' احد اور خندق دیکھنے کا پروگرام بنا۔ رئیس وزیر صاحب کا دوست مہر سعید گاڑی لے کر آ گیا۔ رئیس صاحب کی طرح ان کے واقف کار بھی نہایت دھیما مزاج رکھتے ہیں۔ رئیس صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ذوق سلیم سے نواز ہے۔ ان میں وقت سے پہلے دیکھنے کی صلاحیت ہے۔ میں نے لمبات صاحب کو چلنے کی دعوت دی تو خوش دلی سے بولے "ایک تو زیارت اور پھر آپ کی رفاقت۔ خوشگوار سفر کا یہی مفہوم ہے۔"

مہر سعید نے شہر کے بازاروں کے چند موڑ کاٹے اور ہمیں تین میل کے فاصلے پر بنی ہوئی مسجد قبا میں لے گیا۔ اس نے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی اور بولا "آپ اندر جا کر دو رکعت نفل پڑھیں میں باہر آپ کا انتظار کرتا ہوں۔" درمیانے سائز کی مسجد تھی لیکن پتہ چلتا تھا کہ وہ از نو تعمیر کی گئی ہے۔ کافی لوگ اندر باہر آ جا رہے تھے۔ احمد لمبات کہنے لگے: "شاہ صاحب اس مسجد کو دو وجوہ سے فضیلت ہے۔ ایک تو یہ اسلام کی پہلی مسجد ہے اور اسے رسالت مآب نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ اس کی شان میں قرآن مجید کی یہ آیت اتری تھی۔ "یہ وہ مسجد ہے جس کی بنیاد روز اول سے پرہیز گاری پر رکھی تھی' تمہاری یہاں موجودگی اس کا استحقاق ہے۔ یہاں

صفائی پسند لوگ ہیں اور خدا صفائی رکھنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

"جب تعمیر شروع ہوئی تو رسالت مآب خود بھی شامل ہو گئے۔ یہ بنیادی طور پر محنت کی عظمت کا اشارہ تھا۔ لوگوں نے لاکھ کہا کہ آپ ہمیں گنہگار کر رہے ہیں' آپ آرام کریں اور ہمیں کام کرنے دیں لیکن آپ نہ مانے..... جب مرد اپنی تھکن دور کرنے کے لیے گیت گاتے۔

"وہ کامیاب ہے جو مسجد تعمیر کرتا ہے۔

اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھتا ہے۔

اور رات کو جاگتا ہے۔

تو آنحضرت بھی ہر قافیے کے ساتھ آواز ملاتے جاتے تھے۔

"یہ مسجد کب تعمیر ہوئی تھی؟" میں نے ویسے ہی پوچھ لیا۔

بولے: "چونکہ اس کی تعمیر بہت اہم واقعہ تھا اس لیے مورخین نے عرق ریزی کے ساتھ اس کی صحیح تاریخ نکالی ہے۔ یہ آٹھ ربیع الاول 13 ہجری یا 20 ستمبر 622 کو بنی تھی۔

"آپ کو بھی تحقیق کا شوق ہے؟"

بولے: تحقیق سے زیادہ تجسس۔ میرا بس چلتا تو میں ہر اس قدم کا نقشہ بناتا جو آپ نے مکہ سے چل کر مدینہ تک دھرتی پر رکھا تھا۔"

ہم نے دو رکعت نماز پڑھی۔ کچھ دیر مسجد کی دیواروں پر مینا کاری دیکھتے رہے اور پھر باہر نکل آئے۔ مہر سعید ہمارا منتظر تھا۔

"آپ نے عبادت نہیں کی!" ہم نے اس سے پوچھا۔

بولا: اپنا روزکا آنا جانا ہے۔ کبھی کر لیتا ہوں اور بعض اوقات رہ جاتی ہے۔"

"اب کہاں چلنا ہے؟" وہ ہمارا گائیڈ بھی تھا۔ کہنے لگا۔ "پہلے میدان احد چلتے ہیں۔ کفار مکہ اور مسلمانان مدینہ کی رزم گاہ' یہیں حضرت امیر حمزہ نے جام شہادت نوش فرمایا تھا پھر' مسجد قبلتین اور آخر میں مقام خندق۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے!" احمد لمبات مسکرائے۔ مہر سعید نے گاڑی مرکزی شاہراہ پر ڈال دی۔ نصف گھنٹے میں ہم میدان احد میں پہنچ گئے۔ یہ سامنے میدان احد ہے۔ جہاں معرکہ کفر و اسلام ہوا تھا۔" مہر سعید بتانے لگا۔ بائیں ہاتھ وہ پہاڑی ہے جہاں

پچاس تیا اندازوں نے نافرمانی کا مزہ چکھا تھا۔ پہاڑی کے ساتھ چار دیواری میں حضرت حمزہ کی آخری آرام گاہ ہے۔'' وہ اگر نہ بھی بتاتا تو ساری تاریخ اس سینے پر نقش تھی۔ جنگ احد معرکہ بدر کا شاخسانہ تھی۔ کفار مکہ کے معتبرین جنگ بدر میں مارے گئے تھے۔ انتقام عربوں کی لغت میں محض ایک لفظ نہیں تھا بلکہ ایک جذبہ تھا ایک قرض جس کو وہ بہر حال اتارتے تھے۔ بدر کی شکست کے بعد مکہ واپس آ کر انہوں نے اپنی نیا میں توڑ دیں۔ ایک ہی جنون ہر ذہن پر سوار تھا کہ ستر آدمیوں کا بدلہ لیا جائے۔ اس سلسلے میں عورتوں سے رزمیہ اشعار پڑھوائے گئے تا کہ جذبہ انتقام سرد نہ ہو۔ جو عورتیں رجز خوانی کر رہی تھیں ان میں ہند بنت عتبہ' ام حکیم' فاطمہ بنت ولید' ریطہ زوجہ عمرو بن العاص' برزہ بنت ثقفی اور خناس پیش پیش تھیں۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ چودہ عورتیں ہند کی سرکردگی میں آگے بڑھیں۔ وہ بڑے اشتعال انگیز اشعار پڑھ رہی تھیں۔

نحن	کنات	طارق
نمشی	علی	النمارق
ان	تقبلوا	نعانق
اوتد	بروا	نفارق

(ہم ستاروں کی بیٹیاں ہیں' قالینوں پر چلنے والی ہیں۔ اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم گلے ملیں گی اور اگر پسپائی اختیار کی تو پھر ہمارے راستے الگ ہیں)

پہلے دو بدو جنگ ہوئی۔ حضرت علی نے قریش کے علمبردار طلحہ کو واصل جہنم کیا۔ اس کے بھائی عثمان کو حضرت حمزہ نے تلوار کی نوک پر دھر لیا۔ اب گھمسان کا رن پڑا۔ کشتیوں کے پشتے لگ گئے۔ کفار کو شکست ہوئی مسلمانوں نے مال غنیمت لوٹنا شروع کیا۔ پہاڑی پر بیٹھے ہوئے پچاس تیر انداز لالچ میں نیچے اتر آئے۔ خالد بن ولید نے موقعہ پا کر پہاڑی کے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ فتح عملاً شکست میں بدل گئی۔ کئی صحابہ کام آئے۔ ہند کے وحشی غلام نے حربہ امیر حمزہ کے سینے میں اتار دیا۔ اپنے باپ عقبہ کی موت کا بدلہ اتارنے کے لیے اس نے ان کا کلیجہ چبا ڈالا۔ مسلمان کچھ سنبھلے لیکن ابتدائی نقصان ہو چکا تھا۔ کفار نے تھوڑے کو ہی غنیمت جانا اور لوٹ گئے۔ یہ جنگ جو بظاہر شکست نظر آتی تھی' دور رس نتائج کی حامل نکلی اور مسلمانوں کی فتوحات کا پیش خیمہ بن گئی۔ اس میں غالباً مصلحت پروردگار بھی تھی۔ اگر یہ جنگ بغیر قربانی کے جیت لی جاتی تو یہ تاثر ابھرتا کہ معجزہ ہوا ہے۔ اسلام نے عمل کی تعلیم دی ہے۔ مسلمانوں نے یہ بھی جانا کہ ہر کامیابی مناسب حکمت عملی کی وجہ سے ممکن ہوتی ہے اور سب سے بڑا سبق یہ تھا کہ رسول کی حکم عدولی کے کیا نتائج

نکل سکتے ہیں۔ ہم نے گیٹ سے باہر کھڑے ہو کر امیر حمزہ اور دیگر شہدائے بدر کی تصوراتی قبروں پر فاتحہ پڑھی اور ایک عجیب کرب انگیز کیفیت کے ساتھ واپس آ گئے۔

مسجد قبلتین کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں رسالت مآب صحابہ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے کہ حکم ہوا کہ مسجد اقصیٰ کی جگہ رخ کعبہ کی طرف کر دیا جائے۔ چنانچہ باقی کی دو رکعت کعبہ رو ہو کر پڑی گئیں۔ یہ مسجد کافی بلندی پر ہے۔ وہاں سے نیچے باغات کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے۔

خندق عملاً منہدم ہو گئی ہے لیکن نشانات سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت شہر کس قدر چھوٹا تھا' اب بہت پھیل گیا ہے۔ دراصل مسجد قباء اور قبلتین حدود شہر میں آ گئی ہیں۔ خندق کھود کر جنگ لڑنے کا طریقہ عربوں کے لیے نیا تھا لیکن اس نے کفار مکہ کو زچ کر دیا۔ ہر چند کہ کوئی فریق واضح برتری حاصل نہ کر سکا لیکن اس کے بعد کفار کی طاقت بتدریج کمزور ہوتی گئی۔

ہم واپس آئے تو سعید شاہ آبادی انتظار کر رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ''شوکت بھائی ہمیں بھی ساتھ لے جاتے۔''

عرض کیا ''آپ تو ہر سال آتے ہیں۔''

بولے: ''یہی تو کمال ہے۔ شوق دید ختم نہیں ہوتا بلکہ دیکھنے پر اور جوان ہوتا ہے۔''

اگلے دن میں ظہر کی نماز کے لیے مسجد نبوی میں جا رہا تھا کہ مطعم نور کے عین سامنے ملک اللہ بخش مل گئے۔ ملک صاحب بہاولپور کے رہنے والے ہیں۔ ایک طویل عرصے سے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مدینہ منورہ میں کاروبار کرتے ہیں بلکہ کاروبار سے زیادہ حاجیوں کی خدمت ان کا شعار ہے۔ میری ان سے بہاولپور میں چند ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ بڑے تپاک سے ملے۔ کہنے لگے ''مجھے آپ کا انتظار تھا۔ آپ کو یہاں آئے ہوئے تیسرا روز ہے۔''

''ارے آپ کو کیسے پتہ چل گیا؟'' میں واقعی حیران تھا۔

بتانے لگے۔ ''بورڈ آف ریونیو سے اسلم بھٹی صاحب کا فون آیا تھا۔ انہوں نے آ کی آمد کی اطلاع دی تھی۔

''تو کیا آ میرا انتظار کر رہے تھے؟''

بولے۔ ''نہیں۔ لیکن مدینہ منورہ میں تلاش مشکل کام نہیں ہے۔ جس شخص نے پانچ وقت حرم شریف میں آنا ہو' وہ بھلا کہاں چھپ سکتا ہے۔'' انہوں نے کافی کے کپ کے لیے اصرار کیا۔ اتنے میں اذان ہو گئی بولے ''کوئی بات نہیں' چلئے اکٹھی نماز پڑھتے ہیں واپسی پر کافی پی لیں گے۔'' ہم بازار سے نکل کر مسجد کے وسیع و عریض صحن میں آ گئے۔ لوگ بڑی تیزی کے ساتھ مسجد کی طرف بڑھ

رہے تھے۔اذان اور نماز میں دس منٹ کا وقفہ ہوتا ہے۔حاجیوں کی اکثریت مسجد سے قریب عمارات میں رہتی ہے۔

نماز پڑھ کر ہم باہر نکلے تو کچھ لوگ جنہوں نے مخصوص لباس پہن رکھے تھے' اپنی اپنی ریڑھیوں کے پاس کھڑے چندہ مانگ رہے تھے۔رٹے رٹائے فقرے' جہاد فلسطین' کشمیر' افغانستان کے لیے چندہ دیں۔''حکومت نے بھیک مانگنے پر پابندی لگا رکھی ہے پھر یہ کیسے بلا روک ٹوک پھر رہے ہیں؟''میں نے ملک صاحب سے پوچھا۔

بولے:''یہ حکومت کے لائسنس یافتہ ہیں۔یہ چندہ جہاد کے لیے مختلف ممالک میں جاتا ہے۔

''یہ کیسا جہاد ہے جہاں مسلمان اپنے ہی بھائی بندوں سے لڑ رہے ہیں۔''

''کم از کم یہ ایسا نہیں سمجھتے۔ان کے نزدیک یہ بھی جہاد ہے۔''

''تو کیا حکومت بھوکی ہوگئی ہے۔اپنے خزانہ سے کیوں نہیں دیتی؟''

''کون سے خزانے کی بات کر رہے ہیں؟''وہ مسکرائے۔''وہ جو امریکیوں نے خالی کر دیا ہے یا وہ جو سوئٹزرلینڈ کے بنکوں میں محفوظ ہے۔''

''کیا یہ جہاد کے معنی نہیں سمجھتے۔مسلمان افغانستان میں ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے ہیں۔

ملک صاحب نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔''بولے دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ایسی باتیں کسی اجنبی کے سامنے مت کریں۔''

''تو کیا ہوگا؟''

''کیا نہیں ہوسکتا! یہ نہ بھولیں کہ شہر رسول سے باہر بھی کئی شہر ہیں۔نازک مزاج شاہاں تاب سخن نہ دارند۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟''

''جوس پیتے ہیں۔صحن حرم کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا۔ہم نے تازہ مالٹوں کا رس پیا تو جسم میں توانائی کا احساس ہوا۔نماز عصر میں کافی وقت تھا' ہم بازار کی طرف نکل گئے۔صحن حرم کے بالمقابل جیولرز شاپس ہیں جہاں سینکڑوں کلو سونا ہر روز زیورات میں ڈھلتا ہے۔دنیا کا کوئی ایسا ڈیزائن نہیں ہے جو ان دوکانوں میں موجود نہ ہو۔یہاں غریب غربے کا دخل نہیں ہوسکتا۔عقابی نظروں والے عرب دوکاندار فوراً جانچ لیتے ہیں کہ جیب کے اندر کیا ہے۔تمام بڑی دوکانیں' بزنس سنٹر اور کمرشل پلازے سعودیوں کی ملکیت ہیں۔باہر سے آئے ہوئے لوگ محنت مزدوری یا چھوٹا موٹا کاروبار کرتے ہیں۔قانون کی رو سے غیر ملکیوں کو بڑا کاروبار شروع کرنے سے پہلے عرب حصہ دار رکھنا پڑتا ہے۔چار سو بدیشی مال کے ڈھیر لگے ہیں۔کلون' کاسمیٹکس' کاریں' فرج' ٹی

دی' الیکٹرانکس گڈز' پھل' سبزیاں حتیٰ کہ تسبیحیں اور جائے نماز بھی باہر سے درآمد کی جاتی ہیں۔ ان کے پاس صرف تیل ہے۔ عربی کھجوریں ہیں بے پناہ دولت ہے اور لوازمات لندن ہیں۔ ہر کام کے لیے ایک وقت اور مقام ہوتا ہے۔

نماز عصر کے بعد جنت البقیع کے دروازے کھل گئے۔ حرم کے بالمقابل مناسب اونچائی پر ایک بہت بڑا میدان ہے جسے قبرستان کہتے ہیں۔ لوگ زیر زمین دفن ہیں لیکن اوپر کچھ نہیں۔ چودہ سو سال سے بنی ہوئی قبروں کو چند بلڈوزروں نے مسمار کر دیا ہے۔ ہم اوپر آ گئے۔ گیٹ کراس کیا تو دل بھر آیا۔ یہاں جناب سیدہ کی لحد تھی۔ ملک صاحب نے قیافے سے نشاندہی کی۔ وہاں امام حسن دفن ہیں۔ اس جگہ حضرت عثمان آرام کر رہے ہیں۔ وہاں غالباً حضرت عباس ابدی نیند سو رہے ہیں۔ بس ملک صاحب! میرا دل پسلیوں سے ٹکرانے لگا۔ جناب سیدہ کون ہیں جن کی قبر پر مشین چلا دی گئی ہے؟ دختر رسول' بانوئے بوتراب' مادر آں مرکز پیکار عشق۔ علامہ اقبال نے کہا تھا کہ

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز
از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز

مریم کی فضیلت یہ تھی کہ وہ حضرت عیسیٰ کی والدہ تھیں۔ جناب فاطمہ زہرا کو تین نسبتیں تھیں۔ رسول کی بیٹی' امیر المومنین' علی ابن ابی طالب کی زوجہ اور شہید کربلا کی والدہ۔

حضرت عثمان نے اپنا سب کچھ دین کی خاطر لٹا دیا۔ اور امام حسن جنت کے نوجوانوں کے سردار تھے۔ بال آخر راہ حق میں جام شہادت نوش فرمایا۔ حضرت عباس حضور کے چچا تھے جن کی تیغ بے نیام جب چمکتی تھی تو کفار کی صفوں میں بجلی کوند جاتی تھی۔ کتنے نام گنواؤں۔ یہ قبرستان نہیں اسلام کی تاریخ ہے۔ کیا اپنی تاریخ مسخ کر دو گے۔ چودہ سو سال بیت گئے۔ اربوں لوگ آئے اور چلے گئے۔ یہاں یزید جیسا فاسق فاجر پیدا ہوا۔ عمر بن عبدالعزیز جیسا درویش صفت حکمران آیا۔ عرب نیرو حجاج بن یوسف کا دور گورنری رہا۔ اموی آئے' عباسی آئے' فاطمی' عثمانی خلفاء گزرے۔ کسی نے قبروں کو مسمار نہیں کیا۔ خلفائے راشدین اور رسالت مآب کے زمانے میں یہ قبریں بنیں۔ کیا چودہ سو سال کا اجتماعی شعور چند خردمندوں کے سامنے ہیچ ہے۔ کہتے ہیں حدیث رسول ہے کہ قبروں کی پوجا نہ کرو۔ ٹھیک کہا گیا ہے۔ سزا پجاری کو ملنی چاہیے۔ تم نے قبریں ڈھا دیں۔ احادیث رسول تو اور بھی بہت ہیں۔ قوم کا مال اپنی ذات پر خرچ مت کرو۔ اپنے لیے عشرت کدے نہ بناؤ۔ تکبر اور غرور کو اپنے نزدیک نہ پھٹکنے دو۔ لوگوں کو آزادی گفتار دو۔ شاہ دو عالم کی مادی جائیداد کیا تھی۔ ایک بوسیدہ کملی مصلے' ایک نمدہ۔ چند مٹی کے گھڑے اور بس۔ کعبے کے اندر جھانکتا ہوا بیس منزلہ محل بنانا کیا

ہے؟ ہر ہوٹل میں اپنی تصاویر آویزاں کرنا کیسا ہے؟ میرے وجود پر کپکپاہٹ طاری ہوئی اور میں جنت البقیع سے باہر نکل آیا۔

اگلی صبح جب میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو حیرانی اور پریشانی یکجا ہو گئیں۔ یوں گمان ہوتا تھا کہ آنکھ سے خون ٹپک پڑے گا۔ بائیں آنکھ سرخی مائل نہیں بلکہ مکمل سرخ تھی۔ نماز فجر کے بعد میں نے پاکستانی ڈاکٹر کو حج بلڈنگ میں فون کیا۔ بولا: آپ ڈسپنسری میں آ جائیں۔ بغیر معائینہ کیے میں کچھ تجویز نہیں کر سکتا۔ ناشتے کے بعد میں نے شیو کر کے کپڑے بدلے اور مہر سعید کو فون کیا کہ وہ گاڑی لے آئے۔ وہ گیارہ بجے پہنچا تو ہم دس منٹ میں ڈسپنسری میں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر میرا منتظر تھا۔ معائینہ کے بعد کہنے لگا۔ ''یہ کیسے ہو گیا ہے؟''

''جیسے ہو جاتا ہے۔'' مجھے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ دراصل وہ سوال سے زیادہ حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔

کہنے لگا آنکھ میں ہیمرج ہو گیا ہے۔ ریٹنا کے قریب بڑی نازک رگ پھٹ گئی ہے۔ آپ فوراً آئی سپیشلسٹ کو ملیں۔''

''وہ کہاں ہو گا؟''

''یہاں سے پانچ میل کے فاصلے پر ہسپتال ہے۔ میں آپ کو ریفر کر دیتا ہوں۔ جلدی کریں۔ بارہ بجے ہسپتال بند ہو جائے گا۔

''لیکن میری نماز کا کیا ہو گا؟''

بولا: یہاں پر ہر جگہ مساجد ہیں ہسپتال میں پڑھ لیں۔''

''مجھے نماز مسجد نبوی میں پڑھنی ہے۔ مسافروں کے لیے یہی حکم رسول مقبول ہے۔''

''تو آپ جنت جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔'' وہ زور سے مسکرایا۔ ''آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔''

''بالفرض صحیح نہ بھی ہو تو پھر بھی مجھے نماز تو مسجد نبوی میں ہی پڑھنی ہے۔''

''اگر صحت ہے تو نمازیں ہیں۔ آپ اس بنیادی بات کو کیوں نہیں سمجھتے۔'' اس کا لہجہ ناصحانہ ہو گیا۔

''یہی تو دکھ کی بات ہے۔ جب صحت ہوتی ہے تو انسان ان فرائض سے غفلت برتتا ہے۔''

''اب چلنے والی بات کریں وقت گزرتا جا رہا ہے۔'' اس نے ریفرل میری جیب میں ڈال دیا۔

جب ہم احد ہسپتال پہنچے تو بارہ بج چکے تھے۔ ڈاکٹر اپنے کلینک سے اٹھ کر اوپر آپریشن تھیٹر میں جا چکا تھا اس کے کلرک نے بتایا کہ ہمیں اگلے دن تک انتظار کرنا پڑے گا۔ مایوسی نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ مہر سعید کہنے لگا۔ ''ہسپتال کا ایک اہلکار میرے دوست کا عزیز ہے۔ آخری کوشش کر دیکھتے ہیں۔ اتفاق سے وہ اپنے کمرے میں موجود تھا۔ مہر سعید نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے

ہمیں اٹھنے کا اشارہ کیا۔ کہنے لگا۔ بظاہر تو یہ ممکن ہے لیکن بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ اوپر آپریشن تھیٹر میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا اور کہنے لگا ڈاکٹر ابھی ابھی آپریشن سے فارغ ہوا ہے۔ پانچ منٹ میں وہ نیچے آئے گا تو آپ کا معائینہ کرے گا۔ ڈاکٹر پانچ منٹ بعد نیچے آ گیا اور اسے اشارہ کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے آنکھ کو بڑے غور سے دیکھا۔ مشین کے زریعے اسے مختلف زاویوں سے جانچا' پرکھا اور بولا'' آپ خوش قسمت ہیں کہ آنکھ کی پتلی والا حصہ بچ گیا ہے نہیں تو بینائی مستقل طور پر متاثر ہو سکتی تھی۔ آنکھ تو ٹھیک ہو جائے گی لیکن کچھ وقت ضرور لگے گا۔ میں نسخہ لکھ دیتا ہوں۔ دوائی آپ ہسپتال کی فارمیسی سے جا کر لیں۔ اس کے کمرے سے باہر نکلے تو اذان ہو رہی تھی۔ یارسول اللہ!۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ شاید اس گنہگار کی قسمت میں چالیس نمازیں نہیں لکھی تھیں۔ مہر سعید نے میرا چہرہ بڑے غور سے دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ فارمیسی سے دوا لے کر جب ہم باہر نکلے تو میں نے اسے مشورہ دیا کہ ہسپتال کی مسجد میں نماز پڑھ لیتے ہیں۔

''کس لیے؟ وہ مسکرایا'' آپ فکر نہ کریں۔ اللہ نے چاہا تو آپ نماز مسجد نبوی میں ہی پڑھیں گے۔''

''لیکن وہ کیسے؟ مسجد یہاں سے ۵ میل دور ہے اور راستے میں ٹریفک کا اژدہام ہے۔''

''آپ درود شریف پڑھیں اور باقی کام مجھ پر چھوڑ دیں۔'' اس نے انجن اسٹارٹ کیا۔ گاڑی کا گیئر بدلا اور مرکزی شاہراہ پر آ گیا۔ ایسے پتہ چلتا تھا کہ ہم کار میں نہیں کسی روسی راکٹ میں بیٹھے ہیں اور راستے میں کوئی ٹریفک سگنل نہیں ہے' لوگ نہیں ہیں اور مخالف سمت سے کوئی گاڑی نہیں آ رہی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے گھبراہٹ میں گنتی شروع کر دی۔ ایک دو تین چار۔ کسی سکول کے بچے کی طرح وہ کس رفتار سے جا رہا تھا' کتنے غلط موڑ کاٹے' کتنے ٹریفک کے اشارے توڑے' کس قدر گاڑیوں کو رانگ سائیڈ سے اوورٹیک کیا' ٹریفک پولیس نے اس کو کیوں نہیں روکا۔ مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ آخر گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔'' آنکھیں کھولیں۔ وہ سامنے مسجد نبوی ہے! صفیں درست ہو رہی ہیں' شامل نماز ہو جائیں۔'' اس نے مجھے جھنجھوڑا۔ لوگ معجزوں کے قائل نہیں ہوتے۔ رحمت کے سائے صرف پارساؤں پر ہی نہیں پڑتے گنہگار بھی سرشار ہوتے ہیں۔ اس دن نماز پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ ایک گنہگار سرخ رو ہو گیا تھا۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ میں ابھی ابھی پل صراط گزرا ہوں۔ بخیر و عافیت' ناز و وقار کے ساتھ۔ نماز ختم ہو گئی حاجی ایک ایک کر کے باہر چلے گئے لیکن میں اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ میری نظریں اس دیوار پر گڑی تھیں جس کے پیچھے روضہ مبارک تھا۔ میں کافی دیر تک درود شریف پڑھتا رہا۔ کافی دیر حمد و ثنا کرتا رہا۔ میں شاید سارا دن اور رات وہیں گزار دیتا کہ اچانک ملک اللہ بخش آ گئے۔ کہنے لگے۔'' خیریت تو ہے کہیں اعتکاف میں تو نہیں بیٹھ گئے۔ میں مطعم نور میں کافی دیر آپ کا انتظار کرتا رہا جب آپ نہ آئے

تو مجھے گمان ہوا کہ آپ ضرور مسجد میں بیٹھے ہوں گے۔"

"دراصل آج مسجد کا ایک نیا رونظر آیا ہے اسے اپنے وجود میں اتارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"بولے۔ یہی اعجاز نبی ہے کہ یہاں آ کر ہر دفعہ انسان ایک نئے لطف سے دوچار ہوتا ہے۔ یہی بات ہے جو مجھے روکے ہوئے ہے نہیں تو کبھی کا واپس بہاولپور چلا گیا ہوتا۔ چودہ سو سال ہو گئے ہیں لیکن اس جگہ کا حسن ماند نہیں پڑا بلکہ اور نکھر آیا ہے۔"

"مہ کامل کا شہر جو ٹھہرا۔ دراصل اس شہر کا مقدر اس دن ہی چمک اٹھا تھا جس دن حضور یہاں تشریف لائے تھے۔ اس دن کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جس قدر طہارت' نفاست اور سرافت اس نگر میں ہے اور کہیں نہیں ملتی۔"

بولے۔ "یہ وجہ ہے کہ پیدائش سے لے کر دم واپسیں تک' ہر مسلمان کے لب پر ایک ہی دعا ہوتی ہے' دل میں ایک ہی خواہش کروٹیں لیتی ہے کہ اسے دیدار مدینہ ہو جائے۔"

میں نے کہا "اس کی مٹی میں عجیب سوندھی خوشبو ہے اس کی ہواؤں میں ایک سندیسہ ہے اس قدر روشن صبح اور مشکبار شامیں ہر شہر کو کہاں نصیب ہوتی ہیں۔

کہنے لگے۔ "آپ نے مسجد کا اوپر والا حصہ نہیں دیکھا۔ وہاں چلتے ہیں وہاں میں مسجد کی وسعت اور شہر کے خدوخال زیادہ واضح نظر آتے ہیں۔ ہم اٹھ کر مسجد کی چھت پر آ گئے۔ چھت سے سارا شہر دکھائی دیتا تھا۔ مسجد قباء قبلتین اور ابوذر غفاری کے صرف مینار نظر آتے تھے۔ صحن کے تین طرف برآمدے ہیں جن میں سبز قالین بچھے تھے۔ یہاں بھی نمازیوں کی کثیر تعداد نوافل پڑھ رہی تھی۔ ہم چلتے چلتے گنبد حضریٰ کے قریب پہنچ گئے۔ ایک شخص گنبد کی طرف نگاہیں کئے زاروقطار رو رہا تھا۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ میرے مولا! میرے آقا! یہ غلام حاضر ہے' دیکھ تو سہی یہ کہاں سے آیا ہے! سن میری فریاد کہ تو مشکل کشا ہے' حاجت روا ہے' غریب پرور ہے' بندہ نواز ہے۔ سن' میرے آقا' سن!" حضور ہر شخص کی فریاد سنتے ہیں۔" ملک صاحب کہنے لگے۔ "دربار نبوی پر ہر وقت رش لگا رہتا ہے۔ جب فریادی ان گنت ہوں تو مولائے کائنات بھی آرام نہیں فرماتے ہر وقت' ہر لمحہ حاجت روا ہوتے ہیں۔"

"اس میں کوئی شک نہیں" میں نے کہا۔ "صرف سنتے ہی نہیں بلکہ حکم بھی جاری کرتے ہیں۔"

ہم بھی کافی دیر وہاں کھڑے ہو کر گنبد حضریٰ کی زیارت کرتے رہے۔ روضہ اقدس ۱۶ میٹر طویل اور ۱۵ میٹر چوڑائی لیے ہوئے ہے۔ اس کی تاریخ تجسس آمیز ہے۔ صالحی عہد میں ۶ھ میں الملک المنصور قلادون نے روضہ مبارک پر ایک گنبد بنوایا تھا جو نیچے سے مربع شکل اور اوپر سے ہشت گوشہ تھا۔ اس میں لکڑی کے تختے اور سیسے کی پلیٹیں استعمال کی گئیں تھیں۔ حسن نبی محمد نے ۶۷۵ھ میں

اس کی تعمیر نو کی۔ یہ مختلف ادوار میں تعمیراتی مراحل سے گزرتا رہا۔ موجودہ ڈیزائن ۸۸۶ھ میں بنایا گیا۔ گنبد خضریٰ پر سبز رنگ عثمانی عہد کے خلیفہ محمود خان نے ۱۲۳۳ھ میں کرایا۔ مسلمانان عالم کو یہ رنگ بہت پسند آیا اور ہنوز قائم ہے۔ ۵۵۷ھ کئی اعتبار سے تاریخی نوعیت کی حامل ہے۔ اسلام اپنی روشن خیالی اور ابدی پیغام کی وجہ سے کئی قلوب میں اتر چکا تھا۔ اس کا پھیلاؤ عیسائیوں کے لیے خطرے کی گھنٹی تھا۔ لمحہ فکریہ تھا۔ چنانچہ اہل مغرب نے ایک ناپاک پالان بنایا کہ جسد مبارک کو لحد سے نکال کر بے حرمتی کی جائے اور اس طرح امت مسلمہ کی راسخ عقائد کو زک پہنچائی جائے۔ اس کام کے لیے انہوں نے دو شاطر عیسائی منتخب کئے جو سوانگ بھرنے اور بہروپ کے ماہر تھے۔ ان بدبختوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھا اور مدینہ منورہ پہنچ کر زر و جواہر پانی کی طرح لٹانے شروع کئے۔ عبادت' غرباء اور مساکین کو کھانا کھلانا ان کی زندگی کا معمول تھا۔ دن کو یہ سخی سکندر ہوتے اور رات کو وزد سیاہ کار کی طرح سرنگ کھودتے۔ سرنگ کا رخ روضہ اقدس کی طرف تھا۔ انہوں نے مسجد سے ملحق مکان خرید لیا تھا۔ اور اس کمین گاہ سے منصوبہ شروع ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ سرنگ لگاتے رہے۔ مٹی بڑی چالاکی اور ہشیاری سے جنت البقیع میں پھینک دیتے۔ جب وہ جسد مبارک کے بالکل قریب پہنچ گئے تو ایک رات مصر کے حکمران نور الدین محمود زنگی کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں نظر آئے۔ انہوں نے دو اشخاص کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ مجھے تنگ کر رہے ہیں۔ ان کی خبر لو۔''

سلطان کی گھبراہٹ میں آنکھ کھل گئی لیکن اسے پوری بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا' تیسری بار سلطان نے دیکھا کہ چہرہ مبارک پر جلالی کیفیت طاری ہے۔ اب کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ فوراً مدینہ منورہ پہنچو اور ان بدبختوں کو کیفر کردار تک پہنچاؤ۔'' سلطان اب جو اٹھا تو اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا اور وہ بید مجنوں کی شاخ کی طرح لرزاں تھا۔ اس نے فوراً اپنے کچھ سپاہیوں کو ہمراہ لیا اور مدینہ پہنچ گیا۔ اپنے وزیر جمال الدین کے مشورے پر اس نے ایک بہت بڑی ضیافت کا اہتمام کیا اور اہل مدینہ کو دعوت طعام دی۔ لوگ جوق در جوق آئے۔ آزمائش کا م و دہن ہوتی رہی لیکن سلطان کو مطلوبہ شخص نظر نہ آئے۔ اس کے وزیر نے کمال ہشیاری سے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ دو عابد پرہیز گار شخص جو ہر وقت یاد الٰہی میں مصروف رہتے ہیں اور تزکیہ نفس کی آخری منزل پر ہیں' نہیں آئے۔ سلطان نے انہیں بلوا بھیجا اور پہلی نظر میں شناخت کر لیا۔ ان کے گھر کے تلاشی لی گئی تو ایک مصلے کے نیچے سرنگ نکلی جو جسد مبارک تک کھد چکی تھی۔ سلطان کے غیض و غضب کی انتہا نہ رہی اس نے اقبالی مجرموں کو فی النار کیا اور ہزاروں من سیسہ مزار کی بنیادوں میں ڈلوا دیا تا کہ کوئی بدبخت آئندہ ایسی جسارت نہ کر سکے۔

عصر کی اذان بلند ہوئی۔ ملک صاحب کہنے لگے:

''یہیں نماز پڑھ لیتے ہیں۔''

میں نے کہا'' نیچے چلتے ہیں یہاں دل نہیں مانتا۔''

''وجہ؟'' وہ قدرے حیران ہو کر بولے۔

''یہ سوئے ظن ہے۔''

''میں پھر بھی نہیں سمجھا؟''

''روضہ مبارک نیچے ہے اوپر نماز پڑھنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔''

''کیا یہ گناہ ہے؟''

''نہیں! پھر بھی دل نہیں مانتا۔''

ہم خود کار سیڑھیوں سے نیچے اتر آئے۔ نماز کے بعد ملک صاحب کہنے لگے۔'' چلیں آپ کو مسجد ابوذر غفاری دکھاتے ہیں۔

''مہر سعید کو بلوالیں؟

''اس کی ضرورت نہیں۔ رباط مکی سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔'' ہم نے اوبرائے ہوٹل کو کراس کرتے ہوئے دائیں ہاتھ دوسرا موڑ لیا اور مسجد میں پہنچ گئے۔ چھوٹی سی مسجد تھی دراصل مسجد نبوی دیکھنے کے بعد ہر مسجد چھوٹی لگتی تھی۔ یہاں بھی قالین بچھے تھے۔

''یہ بھی صحابہ رسول تھے!''

ملک صاحب کہنے لگے۔

ہاں یقیناً تھے!''

''بڑے نیک انسان تھے!''

''اگر صحابہ نیک نہیں ہونگے تو پھر اور کون ہوگا!''

''بڑے دبنگ تھے۔ ارتکاز زر کے سخت مخالف ایک روایت ہے کہ جب حضرت علی نے انہیں گورنر کوفہ بنا کر بھیجا تو لوگوں نے ان سے شکایت کی کہ شہر میں چوریاں زیادہ ہوگئی ہیں اور وہ ساری ساری رات جاگ کر پہرہ دیتے ہیں۔ آپ نے کہا آج کے بعد نہیں ہونگی گھروں میں جا کر آرام سے سوجاؤ۔ آپ نے شہر کے کتوں کو حکم دیا کہ کوئی وزر سیاہ کار بچنے نہ پائے۔ صبح جب لوگ اٹھے تو کوئی چوری کی واردات نہ ہوئی تھی البتہ چند چوروں کو کتوں نے چیر پھاڑ ڈالا تھا۔

ہم تھوڑی دیر مسجد میں ٹھہرے۔ ''مسجد نبوی کے ہوتے ہوئے بھی لوگ دیگر مساجد میں نماز پڑھتے ہیں؟'' میں نے پوچھا:

بولے ''یہ بھی تو رسالت مآب کے حکم سے بنی تھیں۔ دراصل مدینہ کے باسیوں کے لیے پانچ وقت مسجد نبوی میں جانا ممکن نہیں ہے۔ فاصلے زیادہ ہیں البتہ ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ جمعہ کی نماز مسجد نبوی میں ادا ہو کیونکہ اس کا ثواب زیادہ ہے۔ رمضان شریف اور حج کے موقعہ پر تو بڑا روح پرور ماحول ہوتا ہے۔ رمضان شریف میں کوئی شخص گھر کھانا نہ بنائے تو بھی بھوک نہیں سو سکتا۔ سحری اور افطاری کے وقت دسترخوان سج جاتے ہیں' انواع واقسام کے کھانے پیش کئے جاتے ہیں۔ لوگ منتیں کر کے روزہ داروں کو اپنے گروپ میں بٹھاتے ہیں۔ کھانا کھلا کر ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ جو لوگ اعتکاف میں بیٹھتے ہیں ان کے آرام و آسائش کا تو خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آنحضور کو خود اپنے مہمانوں کی فکر ہوتی ہے۔''

''سبحان اللہ۔ اسی مسجد کی تعمیر کے وقت آپ نے پیٹ پر پتھر باندھے تھے وہ سب تکلیفیں اور بھوک پیاس امت کی فلاح کے لئے تھی۔

کہنے لگے ''ہر نبی کو امتحان کی منازل سے گزارا گیا ہے۔ سردار انبیا کا امتحان بھی بڑا کڑا تھا لیکن ان گنت مصائب کے باوصف ان کی پیشانی پر کبھی کوئی بل نہیں پڑا۔''

بازار حسب دستور گرم تھا۔ نمازوں سے جو وقت بچتا ہے وہ حاجی بازار میں خرید و فروخت پر صرف کر دیتے ہیں۔ بدیشی مال کی فراوانی! ہر کسی نے اپنے عزیز و اقارب کے لیے کچھ نہ کچھ خریدنا ہوتا ہے۔ تسبیحیں' جائے نماز' کھجوریں' اور آب زم زم تو لازم ہیں اس کے بغیر اگر واپس جائیں تو لوگوں کو شک ہوتا ہے کہ حج کر کے آئے ہیں یا منوڑے کا چکر لگا کر واپس آ گئے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق سال میں بیس ارب ڈالر کی Transaction ہوتی ہے۔ اس میں ٹرانسپورٹ' ہوٹل اور دیگر اخراجات شامل ہیں' دوکانیں ساری رات کھلی رہتی ہیں۔ دوکاندار تین ماہ میں جو کماتے ہیں' سارا سال مزے سے اڑاتے ہیں۔ اب کسی عرب بدو کو صحرائے نجد میں گھات لگا کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مشعلیں خود بخود آتی ہیں ہوا کی جانب۔

نماز عشاء سے فارغ ہوئے تو ملک صاحب کہنے لگے کہ آج کھانا طباق ہوٹل میں کھایا جائے۔ یہ میدنہ منورہ کا سب سے بہتر ریسٹورنٹ ہے۔ عرب بھی بڑی رغبت سے پاکستانی کھانے کھاتے ہیں۔ گو مجھے کوئی خاص بھوک نہ تھی لیکن ایک تجسس ضرور تھا کہ پاکستانیوں کے ریسٹورنٹ اور دیگر تجارتی ادارے دیکھے جائیں۔ پاکستانیوں نے عرب میں ہر جگہ کوئی نہ کوئی کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ طباق' مسجد سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ ہم نے ٹیکسی پکڑی اور ریسٹورنٹ میں پہنچ گئے۔ ملک صاحب نے درست کہا تھا۔

ریسٹورنٹ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا۔ اکثریت عربوں اور غیر ملکیوں کی تھی جو چکن تکہ اور سیخ کباب بڑی رغبت کے ساتھ کھا رہے تھے۔ ہوٹل کا عملہ پاکستانی تھا۔ عملاً کوئی عرب ہوٹلوں اور ریستوران میں کام نہیں کرتا۔ دبئی میں سارا عملہ سری لنکا' ہندو پاکستان اور فلپین سے آتا ہے یہ لوگ کھانا پکانے کے ماہر ہیں اور گاہکوں سے بات کرنے کا فن بھی جانتے ہیں۔ مالک البتہ عرب ہیں۔ ہم بیٹھے ہی تھے کہ ملک صاحب کے بڑے بھائی صاحب بھی آ گئے۔ ملک صاحب نے غالباً پہلے سے یہ پروگرام طے کر رکھا تھا۔ کھانا ضرورت سے زیادہ تھا۔ انواع واقسام کی ڈشیں تھیں ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے پاکستان میں بیٹھ کر کھا رہے ہیں۔ قیمتیں البتہ آسمان کو چھو رہی تھیں۔ ہندوؤں اور اہل وطن میں یہی فرق ہے۔ وہ قطرہ قطرہ جمع کر کے دیار بناتے ہیں ہماری خواہش ہوتی ہے کہ راتوں رات بحر الکاہل کھڑا کر دیا جائے۔ بس ذرا سا موقع ملنا چاہیے۔ بڑے ملک صاحب کہنے لگے۔ ''اللہ بخش کافی دنوں سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ میں پاکستانی اخبارات میں آپ کی کتابوں کی اقساط بڑی باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ بڑی دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔ آپ انتظامی مصروفیات کے باوجود وقت کیسے نکال لیتے ہیں؟''

عرض کیا! ''انتظامی مصروفیات سے بھی زیادہ سدراہ وہ ذہنی خلفشار ہوتا ہے جو انتظامی امور کے دوران پیدا ہوتا ہے لیکن تخلیقی عمل کے لیے بہر طور کچھ نہ کچھ وقت تو نکالنا پڑتا ہے۔

بولے ''لیکن یہ ہر کس وناکس کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔''

''ہر کوئی یہ روگ پالتا بھی نہیں ہے۔ Pangs of creation بھی Pang of birth کے مانند ہوتا ہے۔ سارا وجود ہل جاتا ہے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے ذہن کو شکنجے میں جکڑ لیا ہو۔ ایک ناقابل برداشت بوجھ کا احساس ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو جسم پر کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔''

''ایسی تخلیق کا کیا فائدہ'' ملک اللہ بخش مسکرائے۔

''اس کا تعلق سود وزیاں سے نہیں ہے۔ پکے ہوئے لاوے کی طرح خیالات کا پریشر بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ انہیں کسی یہ کسی طور پر باہر نکلنا ہوتا ہے۔''

''تو اس کا اثر صحت پر تو ضرور پڑتا ہوگا؟'' بڑے ملک صاحب نے پوچھا ''شاید! لیکن جب یہ صفحہ قرطاس پر آ جاتے ہیں تو پھر جو سکون ملتا ہے وہ بھی ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔''

''آپ نے مکہ اور مدینہ میں کیا فرق محسوس کیا؟''

عرض کیا" درحقیقت ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔لوگوں نے اپنی تفریح کے لیے انہیں شہر جلال اور شہر جمال کے نام دے رکھے ہیں۔ایک وہ' جہاں جاتے ہیبت طاری ہو جاتی ہے ڈر اور خوف دل و دماغ کو اپنے شکنجوں میں جکڑ لیتے ہیں' وجود تھر تھر لرزنے لگتا ہے۔سزا و جزا کا تصور مادی روپ دھار لیتا ہے۔جب آدمی نعرہ زن ہوتا ہے۔اور یوں محسوس کرتا ہے جسے اپنے اعمال کے پل صراط پر سے گزر رہا ہو۔گویا امتحان مکہ میں ہوتا ہے اور نتیجہ مدینہ میں نکلتا ہے۔مدینے میں آ کر اسے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے جیسے آدمی دارالامان میں آ گیا ہو۔ایک بہت بڑا حفاظتی حصار جہاں رحمت العالمین نے اس کی بخشش کا ذمہ لے لیا ہو جیسے اس نے صدیوں کا بارگراں ایک جھٹکے میں اتار دیا ہو' نور نبوت کا پرتو براہ راست اس پر پڑ رہا ہو۔چاندنی میں نہا رہا ہو۔ایک طویل سفر صحرا کے بعد اسے ٹھنڈی چھاؤں نصیب ہوئی ہو۔امن' چین' سکون قلب' طمانیت کے مفاہیم سے پہلی بار آشنا ہوا ہو۔"

"تو پھر فرق تو صاف نظر آتا ہے۔" غالباً ملک صاحب کو میرے بیان میں تضاد نظر آیا۔"

"یہ ذہنی فرق ہے۔اصل بات پھر بھی اپنی جگہ قائم ہے!"

"وہ کیا ہے؟"

"حقیقت یہ ہے کہ دونوں شہر نبی ہیں۔ایک آپ کا مولد ہے تو دوسرا پناہ گاہ۔ایک سے دین کی ابتدا ہوئی تو دوسرے میں دین مکمل ہوا۔ایک میں آپ کے اجداد ابدی نیند سو رہے ہیں تو دوسرے میں حضور صحابہ کرام اور اہل بیت کے ساتھ استراحت فرما رہے ہیں۔ایک میں جنت المعلیٰ ہے تو دوسرا جنت البقیع پہ نازاں ہے۔مکہ میں خدا کا گھر ہے تو مدینہ میں بھی جگہ جگہ حضور نے خانہ خدا بنوائے۔وہاں دن میں پانچ مرتبہ وحدانیت کی گواہی دی جاتی ہے تو یہاں بھی لاشریک کا ورد ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ایک کو اپنے نام سے منسوب کیا تو دوسرے کو اپنے حبیب کا مسکن بنا دیا اور ان کے درمیان ایک ایسا رشتہ جوڑ دیا کہ معبود تک پہنچنے کے لیے حبیب کی شفاعت ضروری ہو گئی۔

شہر ایک ہے اس کے روپ الگ الگ ہیں۔جب تک ان کا تصوراتی ملاپ نہ ہو ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ان کا الگ الگ تصور ہی انسان کو الحاد کی طرف لے جاتا ہے گویا ایمان کی تکمیل کے لیے' مسلمانی کی تشکیل کے لیے' دین حق کی دلیل کے لیے انہیں Juxtaposition میں نہیں بلکہ In conjunction دیکھنے کی ضرورت ہے۔"

ملک صاحب کہنے لگے! حیرت ہے کہ ہمیں یہاں آئے ہوئے کئی سال ہو گئے ہیں لیکن ہم نے ان زاویوں سے انہیں نہیں دیکھا۔"

"یہ محض دو شہر ہی نہیں ہیں بلکہ دین مبین کے محور و مرکز ہیں۔مسلم اتحاد و یگانگت کے ستون ہیں' لا الہ اللہ کی تفسیر ہیں۔اسلام کی تقدیر

ہیں اس کی ابتدا بھی یہیں سے ہوئی اور انتہا بھی ادھر ہی ہوتی ہے۔ اگر اس حقیقت کو فراموش کر دیا جائے تو پھر سوائے فکری انتشار کے کچھ باقی نہیں بچتا۔"

ملک صاحب پوچھنے لگے! "آپ کتنی مرتبہ حج اور عمرے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔"

"ایک مرتبہ ہی کافی ہے اگر قبول ہو جائے۔"

بولے۔ "بار بار آنے میں کوئی حرج ہے؟"

"کوئی حرج نہیں! پھر فرض جان کر نہ آئیں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر آئیں۔"

"بات تو ایک ہی ہوئی!"

"ایک بات نہیں ہے۔ ویسے میں ایمانداری سے محسوس کرتا ہوں کہ آدمی دل پر جبر کر کے اسی رقم سے کسی دوسرے عاشق کو بھیج دے تو زیادہ مناسب ہے۔"

"اور خود تڑپتا اور کلپتا رہے!"

"تڑپ اور کسک کا بھی اپنا مزا ہے میرے خیال میں رسالت مآب زیادہ خوش ہونگے۔ حضور کو اپنے ہر غلام کا اتنا ہی خیال رہتا ہے۔"

ہم کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ ہوٹل کا منیجر بھی آ گیا۔ لاہور کا رہنے والا تھا۔ بڑے شوق اور انہماک سے ہماری باتیں سنتا رہا۔ بالآخر اس سے نہ رہا گیا۔

یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ "سانوں کوئی لہوردی گل وی سناؤ۔"

"لاہور اسی جگہ کھڑا ہے جہاں آپ چھوڑ آئے تھے یقین جانئے ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔"

بولا! "شاید آپ نے مذاق میں یہ بات کی ہے ویسے حقیقت یہ ہے کہ جب لاہور ہلتا ہے تو سارا پاکستان لرز اٹھتا ہے۔"

"مجھے آپ سے اتفاق ہے" میں نے کہا۔ "اگر ملک کو جسم مان لیا جائے اور شہروں کو اعضا تو اس کی حیثیت آنکھ کی سی ہے۔ ہمدرد، غمگسار صاف دل اور روشن ضمیر۔ مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ۔

"کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ"

ملک صاحب کہنے لگے۔ "جب سے ہم یہاں آئے ہیں آپ لاہور کا ذکر خصوصاً کرتے ہیں اگر شہر سے اس قدر پیار تھا تو چھوڑا ہی کیوں تھا؟"

کہنے لگا ''آپ سرائیکی بیلٹ کے رہنے والے سادہ لوگ ہیں' لوگ اپنے شہر چھوڑتے نہیں' شہر ہی انہیں نکال باہر کرتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' ملک صاحب سمجھ نہیں پا رہے تھے۔

''معاشی ناہمواریاں۔ معاشرتی ناصبوریاں۔ تنگدستی ایسی بری چیز ہے کہ عزیز رشتہ دار بھی کنی کترانے لگتے ہیں۔ تلاش معاش میں عزیز از جان شہر کو الوداع کہنا پڑتا ہے۔''

''آخری مرتبہ لاہور کب گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

بولا ''ایک عرصہ ہو گیا ہے۔ یہ کم بخت کاروبار ہی ایسا ہے ایک دن کی غیر حاضری بھی کام بگاڑ دیتی ہے۔ میں چند دن کے لیے مکہ چلا گیا واپس آیا تو کھانوں کا ذائقہ ہی بگڑا ہوا تھا۔ سوپ پر مائع کا گمان ہوتا تھا۔ کری کے اجزائے ترکیبی دیگچے میں الگ الگ تیر رہے تھے۔ ہلدی' ادرک' مرچ' اور پیاز آپس میں دست و گریبان تھے۔''

رات بھیگنے لگی لوگ ایک ایک کر کے اٹھنے لگے۔ میں نے ملک صاحبان کا شکریہ ادا کیا۔ منیجر کو اپنے ہی شہر لاہور آنے کی رسمی دعوت دی اور واپس رباط مکی آ گیا۔

اس رات میں گہری نیند سویا' دن مصروف گزرا تھا۔ ایک طویل عرصے سے میں نے یہ عادت پال رکھی ہے کہ رات کو دیر سے سونا' علی الصبح سیر کے لیے اٹھنا اور بعد دوپہر چند گھنٹے آرام کرنا۔ دیار حبیب میں یہ ممکن نہ تھا۔ ایک تو دن محدود تھے' دیکھنے اور عبادات کی خواہش بہت زیادہ تھی پھر نماز کے اوقات ایسے ہیں کہ ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی کہ کوئی نماز قضا نہ ہو جائے۔

صبح جب مسجد نبوی کے میناروں سے اذان کی آواز بلند ہوئی تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ شاید مولوی منظور مجھے جگانا بھول گیا تھا۔ میں اس قدر جلدی میں تھا کہ گھڑی دیکھنا گوارہ نہ کیا۔ جلدی جلدی وضو کیا اور گرم چادر اوڑھ کر مسجد کی طرف چل پڑا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ مدینے کے مصروف بازار سونے سونے لگ رہے تھے۔ اکثر دوکانیں بند تھیں جو اکا دکا کھلی تھیں ان کے دوکاندار بھی اونگھ رہے تھے۔ مسجد کی طرف بڑھتے ہوئے نمازیوں کے ریلے بھی نظر نہ آئے۔ ''بات کیا ہے؟'' میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ صبح صادق کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے۔ برقی قمقمے نہ ہوتے تو شاید ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا۔ کیا میں نے خواب میں اذان سنی تھی؟'' بارش کی وجہ سے سورج نے نکلنے میں تاخیر کر دی تھی یا کوئی اور وجہ تھی۔ میں مسجد میں پہنچا تو مزید حیرانی ہوئی۔ قریباً تین چوتھائی خالی تھی لوگ الگ الگ عبادت کر رہے تھے۔ اتفاق سے احمد لمبات مل گئے۔ مجھے دیکھتے ہی قدرے حیران ہوئے۔ بولے ''اگر آپ نے تہجد اور نوافل کے لیے آنا تھا تو مجھے بتا دیتے میں آپ کو اپنے ساتھ لے آتا۔''

''میں تو نماز فجر پڑھنے آیا ہوں! میں نے وضاحت کی۔''

''لیکن اس میں تو ابھی خاصا وقت ہے۔''

''تو پھر آواز اذان کیونکر بلند ہوئی۔''

''اچھا اب سمجھا۔'' وہ مسکرائے ''یہ فجر کی نہیں بلکہ تہجد کی اذان تھی۔'' ہم نے نوافل پڑھے اور اذان کا انتظار کرنے لگے۔

روضہ مبارک کا دروازہ ابھی نہیں کھلا تھا لیکن بے شمار لوگ اس کے اردگرد پروانوں کی طرح منڈلا رہے تھے۔ بے تابی' بے قراری' انتظار بار بار یا پروردگار یا رسول اللہ کی آوازیں ان کے لبوں سے نکلتیں' دلوں کی دھڑکنیں سنی جاسکتی تھیں۔ ''اگر روضہ اطہر کے دروازے ساری رات کھلے رہیں تو اس میں کیا حرج ہے؟ میں نے احمد لمبات صاحب سے پوچھا۔ ''شاید رش کم ہو جائے۔''

بولے۔ ''کوئی حرج نہیں۔ لیکن رش کم نہیں ہوگا۔ اگر دن میں چوبیس گھنٹے بھی دروازے کھلے رہیں تو بھی رش کم نہیں ہوگا۔ شمع کے گرد منڈلاتے ہوئے پروانوں کو آپ نے کبھی تھکتے ہوئے دیکھا ہے؟ عاشقان رسول اور غلامان محمد چوبیس گھنٹے عبادت میں مشغول رہیں گے۔''

''پھر بھی! دروازے نہ کھولنے میں کیا مصلحت ہے؟''

''رموز مملکت خویش خسرواں دانند'' انہوں نے محاورے کی آڑ میں بہت ساری باتیں کہہ ڈالیں۔

''اس قسم کی ناروا پابندیاں' بعض اوقات الٹی پڑ جاتی ہیں!''

بولے ''تاریخ کا یہی تو سبق ہے کہ لوگ اس سے سبق نہیں سیکھتے۔ زعم حکمرانی میں لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ آئے کہاں سے ہیں اور انہیں واپس کہاں جانا ہے۔''

عرض کیا ''اس قدر روح پرور اور ایمان افروز ماحول میں اگر غلامان محمد کبیدہ خاطر ہوں تو رسالت مآب کو تکلیف ہوتی ہوگی۔ اصل بات تو خوشنودی رسول ہے جو درحقیقت مشیت پروردگار ہے۔

اتنے میں اذان فجر بلند ہوئی دیکھتے ہی دیکھتے وسیع و عریض مسجد نمازیوں سے بھر گئی۔ اکثر لوگوں کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے غالباً بارش تیز ہوگئی تھی لیکن اس کی کسی کو ذرا پروا نہ تھی۔ کس قدر خشوع و خضوع تھا۔

نماز پڑھ کر میں سیدھا مطعم نور آیا۔ ریسٹورنٹ ابھی کھل رہا تھا۔ ملازم میزوں اور کرسیوں کی صفائی کر رہے تھے۔ حلوہ پوری بنانے والے نے بھی دو چار جمائیوں کے بعد اسٹوو جلا لیا تھا اور پوڑیاں تلنی شروع کر دی تھیں۔ حلوہ پوری کھانے میں غالباً اتنا لطف

نہیں جتنا اسے دیکھنے میں ہے۔ جب دوکاندار میدے کے پیڑے پر بیلنا گھماتا ہے اور پھر اسے بڑے ڈرامائی انداز میں ہاتھوں پر پٹخیاں دے کر کھولتے ہوئے تیل کی کڑاہی میں ڈالتا ہے تو پوریوں کے گال ایک دم پھول جاتے ہیں اور سفید رنگت ہلکی گلابی ہو جاتی ہے۔ میدے اور گھی کی آمیزش سے اشتہا انگیز خوشبو اٹھتی ہے۔ پاکستانیوں نے اور کسی چیز میں ترقی کی ہو یا نہیں' لاہوری کھانوں کا جال سارے عرب میں پھیلا دیا ہے۔ باوجود شدید خواہش کے میں اس دن بھی حلوہ پوری نہ کھا سکا۔ یہ حیات ناپائیدار بھی عجیب ہے ہر مرحلہ عمر میں کوئی نہ کوئی پابندی لگ جاتی ہے۔ سوچتا ہوں وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں جو ان پابندیوں کی پروا نہیں کرتے۔ ان کا استدلال ایک اعتبار سے بڑا وزنی ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دوست کہنے لگے۔ وقت کے سمندر میں انسانی زندگی ایک بوند کے مانند ہے۔ حباب آسا! وہ جو ہم سے پہلے آئے تھے اور وہ جنہوں نے ہمارے بعد آنا ہے سب پیوند خاک ہو گئے ہیں یا ہو جائیں گے۔ جب فنا ہی مقدر انسان ٹھہری تو پھر پانچ سال ادھر یا ادھر کوئی خاص فرق نہیں ڈالتے۔ زندگی کی قدر کرنی چاہیے لیکن اس کو وبال جاں نہیں بنانا چاہیے۔ میں نے خالی چائے کا ایک کپ پیا اور ہوٹل سے باہر آ گیا۔

بارش تھم گئی تھی لیکن اس کی فسوں کاریاں ہر چیز سے مترشح تھیں۔ سڑکیں دھل کر صاف ہو گئی تھیں۔ دوکانوں کے چھجوں سے بارش کے قطرے موتیوں کی لڑیوں کی طرح ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ بادل اسپ تازی کی طرح مشرق سے مغرب کی جانب دوڑ رہے تھے۔ نیلا آسمان مزید نیلا اور روشن نظر آ رہا تھا۔ جب میں رباط مکی پہنچا تو مولوی منظور دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے متحیر نظروں سے مجھے دیکھا ''کیا یہ رات آپ نے مسجد نبوی میں گزاری ہے؟

''نہیں تو!''

''میں نے کمرے کا دروازہ کئی بار کھٹکھٹایا لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔''

''ہاں آج جلد آنکھ کھل گئی۔ شہر نبی کو اگر صحیح طرح سے دیکھنا ہے تو صبح جلدی اٹھنا چاہیے۔''

بولا ''ناشتہ تیار ہے۔ چلیں ناشتہ کر لیں' میں نے آلو کے پراٹھے بنائے ہیں۔''

''میں حلوہ اور پوریوں سے کنی کترا کے آیا ہوں' اب پراٹھے کھانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔''

کہنے لگا؟ ''آپ پڑھے لکھے لوگ ڈرپورک ہیں۔ ڈاکٹر کے مشورے کو حرز جاں بنا لیتے ہیں۔ مجھے دیکھیں ہر چیز کھا لیتا ہوں حالانکہ میرے عوارض کسی سے کم نہیں۔''

''تم بھی تو کسی سے کم نہیں! میں نے اسے تھپتھپایا۔ شرر سول میں روحانی انشورنس کرا کے بیٹھے ہوئے ہو اگر لاہور میں ہوتے تو اب تک

کسی نہ کسی بیماری کے شکنجے میں جکڑے گئے ہوتے۔''

''جبھی تو میں نے وطن چھوڑ دیا ہے۔'' وہ مسکرایا' بال بچوں سے عملاً الگ ہو گیا ہوں'' وہ عجیب قسم کی مسکراہٹ تھی جس میں دور افتادگی کا کرب جھلکتا تھا۔

کمرے میں آ کر میں نے کپڑے بدلے اور لیٹ گیا۔ بارہ بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو باہر ملک اللہ بخش اور مہر سعید کھڑے تھے۔ ''کیا آپ ہم صلاح و ہم مشورہ ہو کر آئے ہیں؟'' میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

بولے ''آئے تو بغیر صلاح کے ہیں لیکن مشورہ یہاں کیا ہے؟''

کونسا مشورہ کیا ہے؟''

''آج آپ کو عکول ڈیم اور جبل مدینہ دکھانا ہے۔''

''نماز کا وقت ہو چلا ہے!''

نماز پڑھ کر چلیں گے۔''

عکول ڈیم مدینے سے نو میل کے فاصلے پر ہے۔ شہر سے نکلتے ہی باغات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ کھجور کے علاوہ انار اور دیگر پھل بھی پیدا کئے جاتے ہیں لیکن مرکزی حیثیت کھجور کو ہی ہے۔ مکے اور مدینے کا موازنہ پہلے ہو چکا ہے لیکن وہ روحانی تھا۔ مکے کے پہاڑ بے آب و گیاہ ہیں۔ کالی کھردری چٹانیں جنہیں دیکھ کر آنکھیں دکھنے لگتی ہیں۔ مدینہ انہیں طراوت بخشتا ہے۔ یہ باغات رسالت مآب کے وقت بھی تھے۔ ''ہنوز'' قائم ہیں بلکہ ان میں اضافہ ہوا ہے۔ عکول ڈیم نے اس خطے کو زرخیز بنایا ہے۔ ہر چند کہ ڈیم کوئی خاص بڑا نہیں ہے لیکن پانی جس قدر بھی مل جائے غنیمت ہے۔ اس کی قدر وہی لوگ جانتے ہیں جہاں اس کی کمی ہوتی ہے۔ جب میں رحیم یار خان میں ڈپٹی کمشنر تھا تو ابوظہبی کے حکمران شیخ زید بن سلطان النہیان شکار کے لیے آئے۔ انہوں نے ہمیں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ ڈنر شروع ہوا تو ساتھ باتیں بھی ہونے لگیں۔ رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھنے لگے۔ پاکستان کے دریاؤں کا منبع کونسا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ قریباً سب دریا ہمالہ سے نکلتے ہیں۔

''اور گرتے کہاں ہیں؟'' انہوں نے مزید استفسار کیا۔

''بحیرہ عرب میں!''

بولے ''کس قدر پانی سمندر میں گرتا ہے؟''

عرض کیا ''بہت زیادہ خاص طور پر ساون کے مہینوں میں''

انہوں نے تاسف بھری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس قدر قیمتی چیز ضائع ہوجاتی ہے۔ ''آپ مجھے پانی دیں میں اس کے بدلے پاکستان کو تیل سپلائی کروں گا۔'' حیرت سے میری زبان گنگ ہوگئی۔ ندامت بھری آنکھیں جھک گئیں۔ آزادی کے چون سالوں میں چین نے سو ڈیم بنائے ہیں۔ ہندوستان بھی نصف سنچری کے قریب ہے اور ہم کہاں کھڑے ہیں۔؟ معاشی تباہی کے دہانے پر۔ دو ڈیموں کے بعد تیسرا نہیں بن پا رہا۔ سیاست' صوبائیت' شکوک وشبہات' تعصب' ہمیں کیا ہوگیا ہے۔ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں!''

ہم کافی دیر عکول ڈیم دیکھتے رہے۔ چھوٹا سا ڈیم لیکن حکومت کے عزم کی علامت۔ ایک ایک قطرہ آب استعمال میں لایا جارہا ہے۔ سمندر کے کھارے پانی کو میٹھا کر کے عوام تک پہنچایا جارہا ہے۔ ترقیاتی منصوبے بن رہے ہیں اس کے لیے سعودی حکومت تعریف کی مستحق ہے۔ تھوڑی سی فراخدلی دیگر معاملات میں بھی دکھائے تو یہ بادشاہت کے باوصف مملکت بن سکتی ہے کہ فلاح کا تعلق صرف پیٹ سے نہیں بلکہ روح سے بھی ہوتا ہے۔

اس کے بعد مہر سعید ہمیں مدینہ کی سب سے اونچی پہاڑی پر لے گیا۔ حکومت وہاں پر پکنک سپاٹ بنانا چاہتی ہے۔ کچھ تعمیراتی کام شروع ہوا ہے۔ مگر ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔ ہم نے پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہوکر مدینہ پر نگاہ ڈالی۔ سارے شہر کے اردگرد باغات تھے' سبزے کے اس سمندر میں شہر کشتی نوح کی طرح ڈول رہا تھا۔ مختلف رنگ کی عمارتیں قوس قزح کا منظر پیش کررہی تھیں۔ پہاڑی اور شہر کے درمیان مدینہ ائیر پورٹ ہے۔ جہاز ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ اترتے چڑھتے ہیں۔ اہل شہر کم سفر کرتے ہیں لیکن تمام دنیا سے آئے ہوئے حجاج کرام اور زائرین اس کی مصروفیت اور رونق میں کمی نہیں آنے دیتے۔ جب ہم واپس مدینہ پہنچے تو نماز عصر کا وقت ہورہا تھا۔

نماز عشاء کے وقت ہم مسجد نبوی پہنچے تو ملک صاحب کہنے لگے ''شاہ صاحب آج نماز گنبد خضریٰ کے سائے تلے پڑھیں گے۔ میں نے کہا ''وہاں شاید جگہ نہ ملے۔''

''زیادہ رش روضہ مبارک کے اندر ہوتا ہے۔'' ملک صاحب کی بات درست تھی۔ گنبد خضریٰ کے پہلو میں جو کمپاؤنڈ ہے وہ آدھا خالی تھا۔ ہمیں بہ آسانی جگہ مل گئی۔ یہاں پہنچ کر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ سارا مدینہ شہر مسجد نبوی کے موجودہ احاطہ کے اندر آباد

تھا۔شہر کیا تھا مٹی کے کچھ گھروندے تھے۔انصار کھیتی باڑی کر کے گزارہ کرتے تھے۔مسجد بذات خود مختصر جگہ پر بنائی گئی تھی۔مسجد سے ملحق امہات المومنین کے حجرے تھے۔کچی اینٹوں کھجور کی کڑیوں سے بنے ہوئے یہ کمرے اس قدر تنگ تھے کہ دوسری چارپائی یا گدے کی گنجائش نہ تھی۔دروازوں پر بوریے کا پردہ پڑا رہتا۔چھتیں اس قدر نیچی تھیں کہ ہاتھ کھڑا کر کے انہیں بہ آسانی چھوا جا سکتا تھا۔حضرت عائشہ حضرت سودہ اور حضرت صفیہ کے گھر ایک جانب تھے دوسری جانب دیگر ازواج رسول کے حجرے تھے۔تنگدستی کا یہ عالم تھا کہ اکثر سوائے پانی کے گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا۔شہنشاہ دو عالم اپنے ہاتھوں سے ہر کام کرتے۔اپنے جوتے خود مرمت کرتے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کو پیوند لگاتے۔حضرت ام انس نے اپنی جائیداد حضور کو پیش کی۔آپ نے قبول فرما کے اپنی دایہ ام یمن کو دے دی۔انصار مدینہ نے جس یگانگت اور بھائی چارے کا ثبوت دیا اسکی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی انہوں نے اپنا تن من دھن سب رسول اللہ کے قدموں پر نچھاور کر دیا۔مہاجرین کی تعداد پینتالیس تھی۔یہ بے خانماں لوگ وہ تھے جو اپنا سب کچھ مکہ چھوڑ آئے تھے۔رسالت ماب کے حکم پر انصار ان کو اپنی نصف جائیداد دینے پر راضی ہو گئے۔اس عمل کو مواخاۃ کہتے ہیں اس طرح ہر انصاری کے حصے میں ایک مہاجر بھائی آیا۔ہر مہاجر انصار کی نصف جائیداد کا وارث ٹھہرا۔حضرت ابوبکر حضرت خارجہ بن زید انصاری کے بھائی ٹھہرے۔حضرت عمر نے اپنا رشتہ حضرت عتبان بن مالک سے جوڑا۔حضرت عثمان کی کفالت کا بیڑا حضرت اون نے اٹھایا۔حضرت زبیر بن العوام حضرت حلامتہ بن وقش کے مہمان بنے۔حضرت عمار بن یاسر کی شکل میں حضرت حذیفہ بن یمان کے بھائیوں میں ایک اور بھائی کا اضافہ ہو گیا۔حضرت ابوذر غفاری نے حضرت منذر بن عمرو کے گھر قیام کیا۔موذن اسلام حضرت بلال حضرت ابوربیحہ کے لیے باعث فخر بنے۔بظاہر یہ ایک وقتی ضرورت تھی جس کا رسالت ماب نے حل نکالا لیکن یہ مسلمانوں کے لیے مشعل راہ بن گیا۔ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ایثار۔قربانی۔محبت اور یگانگت اسلام کے جزو لاینفک ہیں۔اصل چیز جب رسول ہے۔دولت اور مادی وسائل سب عارضی چیزیں ہیں کوئی شخص بھی اپنی جائیداد سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا حتیٰ کہ سگا بھائی دیگر بھائیوں کو حصہ دار نہیں بنانا لیکن یہ کیسا جذبہ تھا' وہ کونسی کیفیت تھی' ایثار کی کیا منزل تھی جس نے مسلمانوں کو یکجا کر دیا لیکن مہاجرین نے حتی الوسع اس سہولت سے فائدہ اٹھانے سے گریز کیا۔حضرت عبدالرحمن بن عوف نے مدینہ کے بازار میں پنیر بیچنا شروع کیا۔وہ گھی اور پنیر سر پر رکھ کر نکلتے اور سارا دن محنت کرتے۔اللہ تعالیٰ نے ان کے کاروبار میں اس قدر برکت ڈالی کہ بعد ازاں ان کی تجارت کا سامان سات سو اونٹوں پر آتا تھا۔حضرت ابوبکر نے مسخ میں کپڑے کا کارخانہ کھول دیا۔حضرت عثمان بنوقینقاع کے بازار میں کھجور کی خرید و فروخت کرتے تھے۔حضرت عمر نے اپنا کاروبار ایران تک بڑھا لیا۔حضرت علی ایک یہودی کے باغ میں مزدوری

کرتے تھے۔ انصار اور مہاجرین کا بھائی چارہ اس قدر مضبوط ہو گیا کہ اس فرمان الٰہی کی تعمیل ہو گئی۔

''جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور خدا کی راہ میں اپنے مال و جان سے جہاد کیا۔ اور وہ لوگ جنہوں نے ان کو پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ یہ لوگ باہم بھائی بھائی ہیں۔''

گویا اس نئے رشتے پر مشیت ایزدی کی مہر لگ گئی' یہ تو ابتدا تھی انصار نے آگے چل کر مزید قربانیاں دیں۔ فتوحات میں جب زمینیں دستیاب ہوئیں تب بھی انہوں نے دی ہوئی جائیداد واپس لینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے ہر مسلمان بھائی کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیا بلکہ اصحاب صفہ کے طعام کا بندوبست بھی یہی لوگ کرتے تھے۔ باایں ہمہ چار سو کسمپرسی کا عالم تھا اکثر لوگ بھوکے پیٹ نماز پڑھتے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ نماز کے دوران کوئی شخص بھوک کے ہاتھوں غش کھا کر گر پڑتا۔ رسالت مآب انہیں حوصلہ دیتے۔ اپنا ایک وقت کا کھانا بھی بھوکوں کو کھلا دیتے۔ ایک دفعہ حضرت فاطمہ نے کہا ''بابا چکی پیستے پیستے میرے ہاتھوں میں نیل پڑ گئے ہیں۔ مجھے ایک کنیز دے دیں۔'' رسالت مآب نے انکار کر دیا کہا ''یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہیں کنیز دوں اور اصحاب صفہ بھوکے رہیں۔'' یہ وہی دختر رسول تھیں کہ جب آتیں تو حضور پیار اور احترام سے کھڑے ہو جاتے۔

مسجد نبوی میں پہلی اذان حضرت بلال نے دی۔ اس سے پہلے اذان نہ ہوتی تھی۔ کچھ لوگوں نے رائے دی کہ نماز کے وقت لوگوں کو گھروں سے بلایا جائے۔ کسی نے کہا کہ مسجد میں علم کھڑا کر دیا جائے۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاں جو نماز کے طریقے تھے وہ بھی آپ نے مسترد کر دیئے۔ بالآخر صحابہ کرام کے مشورے سے اذان کا طریقہ منظور ہوا۔ اذان جس میں ایک بلاوا ہے۔ پیغام بھی ہے۔ فرمان بھی ہے۔ حکم نما مشورہ بھی دیا گیا ہے۔ اور وحدت پروردگار کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔ اس قدر جامع مفصل اور مدلل زبان میں بلاوہ عبادت کے سلسلے میں اور کوئی مذہب نہیں دیتا۔

آج مسجد اور شہر دیدنی ہیں۔ دراصل جس جگہ رسول کے قدم پڑ جائیں وہ جگہ محض خطہ زمین نہیں رہتی بلکہ مرجع خلائق بن جاتی ہے۔ خاک شفا بن جاتی ہے اس کی تقدیر بدل جاتی ہے۔ صرف وہ اپنے آپ پر ناز نہیں کرتی بلکہ سارا جہاں اس پر رشک کرتا ہے۔ خاک شفا' جسے محبان رسول آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ چومتے ہیں باوضو ہو کر اس کا لمس حاصل کرتے ہیں۔

نماز ختم ہو گئی لیکن میں ہنوز تاریخ کے حصار میں تھا۔ میرے کان وہ آخری خطبہ سن رہے تھے۔ جو رسول اللہ نے ممبر پر بیٹھ کر مسلمانوں کو دیا تھا۔ میری آنکھیں اس نقش پا کو ڈھونڈ رہی تھیں جو نبی کا تھا۔ میرا سارا وجود ریزہ ریزہ بکھر رہا تھا' قطرہ قطرہ پگھل رہا تھا۔ بوند بوند گھل رہا تھا لیکن تلاش جاری تھی۔ جستجو اور آرزو ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

حیات ظاہری کا آخری لمحہ آن پہنچا ہے۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ کون ہے؟ جناب سیدہ پوچھتی ہیں۔

''آنے دو!'' رسالت مآب فرماتے ہیں۔ ملک الموت اجازت نہیں مانگتا۔''

''لیکن اس نے تو دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔'' حضرت عائشہ کہتی ہیں۔

آپ نے فرمایا۔ ''شاید پہلی اور آخری بار کھٹکھٹایا ہے۔''

ملک الموت اندر آتا ہے۔ دست بستہ مودب۔ نگاہیں نیچے کئے ہوئے۔ ''اجازت ہے؟'' اس کی زبان میں لکنت آ جاتی ہے۔

''ہاں! اپنا فرض سرانجام دو'' رسالت مآب زیر لب تبسم کرتے ہیں۔ زور کی آندھی چلتی ہے۔ شہر میں بھونچال آ جاتا ہے۔ سورج غم سے اپنا چہرہ چھپالیتا ہے۔ دھرتی کا سینہ چاک ہو جاتا ہے۔ سمندروں کو پسینہ آ جاتا ہے۔ اتنے میں فضا میں ایک آواز گونجتی ہے۔

''اے لوگو! سنو! رسول اللہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں۔'' پہلے تو لوگ مبہوت کھڑے رہتے ہیں ایک سکتہ سارے شہر پر چھا جاتا ہے۔ سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں دل گھڑی کے پنڈولم کی طرح پسلیوں سے ٹکراتے ہیں۔ پھر اچانک ایک کہرام بپا ہو جاتا ہے۔ آہ و بکا' گریہ وزاری' مجمع ماتم کناں' دریائے اشک آنکھوں سے رواں' یہ کیا ہو گیا ہے' یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ جس نے ایک مردہ قوم کو زندہ کیا تھا' ابدی نیند سو گیا ہے' وہ جس نے ایک جغرافیائی وحدت کو ملک بنایا تھا۔ دو گز زمین چاہتا ہے۔ وہ جس کے دہن مبارک سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو لوگ موتی سمجھ کر چن لیتے ہیں۔ خاموش ہو گیا ہے۔

پھر مجمع سے ایک اور آواز ابھرتی ہے۔ ''لوگو! محمد' مر نہیں سکتے وہ جو اپنی پیدائش سے پہلے زندہ تھا' جس نے آدم علیہ السلام کے پیکر کی مٹی گوندھی' جو ہر نبی کے لیے خضر راہ بنا' جس نے ہر نبی کو مشکلات سے نکالا' وہ کیسے انتقال کر سکتا ہے۔ یہ معاملات تم نہ سمجھ پاؤ گے'' پروردگار اور اس کے محبوب کے درمیان جو باتیں طے پاتی ہیں انہیں ذہن انسان نہیں سمجھ پاتا۔

پتہ نہیں نماز کس وقت ختم ہوئی تھی۔ ملک صاحب نے مجھے جھنجھوڑا'' شاہ صاحب ہوش میں آئیں۔ زیارت وداع کا وقت نکلا جا رہا ہے۔'' زیارت سے پہلے مجھے بہت سی دعائیں یاد تھیں جو روضہ مبارک پر پڑھنی تھیں۔ حضور سے بہت کچھ مانگنا تھا' اپنے لیے' اپنی اولاد کے لیے' احباب کے لیے' یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ہاتھوں نے جالی کو تھام لیا لیکن زبان گنگ تھی۔ ذہن ماؤف تھا۔ چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور آنکھوں میں برسات تھی۔

ایک عجیب حقیقت پہلی بار آشکار ہوئی۔ شاید ساری زندگی میں نے آنسو اس لمحے کے لیے بچا کر رکھے تھے۔ ''میں رخصت ہو رہا ہوں۔ یا رسول اللہ۔ میں اجازت چاہتا ہوں۔'' میرے اندر سے ایک آواز اٹھی۔ ''مجھے پتہ ہے کہ آپ مجھے نہیں روکیں گے۔

کروڑوں جانثاروں نے یہاں حاضری دینی ہے کوئی بھی واپس نہیں جانا چاہتا۔ وہ روضہ مبارک میں بیک وقت کہاں سما سکتے ہیں۔ ہر کسی نے رحمت کی اسی سبیل سے سرشار ہونا ہے انہی قدموں میں سر کو جھکانا ہے اور اس جگہ نوافل پڑھنے کی کوشش کرنی ہے۔ عرض داشتیں بھی یہیں پیش کرنی ہیں۔ بس اک نگاہ کرم آقا ایک نظر التفات کہ یہی سرمایہ حیات ہے' حاصل زندگی ہے' مقصود انسانیت ہے۔"

"سب لوگ باہر چلے جائیں وقت ختم ہو گیا ہے۔" کانوں میں گارڈ کی آواز اس طرح پڑی جیسے پھولوں کی سیج پر کوئی خار مغیلاں آن گرا ہو۔ کرب کی ایک لہر تھی جو چار سو پھیل گئی۔ کوئی شخص جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ جالی پر رکھے ہوئے ہاتھ جم گئے۔ بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ سب نگاہیں ایک تیر کی طرح اس کے چہرے کی طرح بڑھیں اتنے میں اس کے چند اور مددگار آ گئے۔ جلدی' جلدی ان کا لہجہ تحکم آمیز تھا۔ دروازے بند کرنے ہیں۔ دروازے بند ہو جائیں گے!"

روضہ رسول کے دروازے بند کرنے والو۔ اپنے دل و دماغ کے دروازے تو کھولا! تاریخ کے اندر جھانکو۔ تاریخ کو سمجھو! اس سے سبق سیکھو۔ اللہ تعالیٰ کی امان اور رسول کی شفاعت مانگو' سرخروئی اور سلامتی کا یہی واحد راستہ ہے۔

ہم روضہ اطہر سے باہر نکل آئے۔ کچھ دیر خاموش رہے جیسے اب کچھ کہنے کو باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ہم چلتے چلتے باب عبدالعزیز تک آ گئے ہر دروازے کا نام شاہی خاندان کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔ ان سے بہتر نام بھی تھے۔ سرکار مدینہ کے جانثاروں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ خلفائے راشدین۔ امہات المومنین۔ صحابہ کرام۔ وہ جنہوں نے اسلام کی خاطر گھر بار چھوڑے وہ جنہوں نے زندگی کا ہر سکون تج دیا' سب کچھ مٹا دیا وہ جو توتلی زبان میں اذان دیتا تھا۔ وہ جس نے وفور عشق میں اپنے سب دانت توڑ ڈالے تھے۔ وہ جن کے بے گور و کفن لاشے صحرا میں تڑپتے رہے۔ ذبیح اعظم سے لے کر' ذبح عظیم' تک ایک طویل فہرست ہے جب تک اسلام رہے گا ان کے نام سنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔ یہ لوگ دین کی اساس ہیں اسلام کا سرمایہ ہیں۔

"چلئے کھانا کھا لیں۔ مطعم طور بند ہونے والا ہے!" ملک صاحب نے خاموشی کا طلسم توڑا۔

"نور کے سمندر سے گزر کر آ رہے ہیں' مطعم تک جانے کی حاجت نہیں۔"

"تو پھر کیا کیا جائے؟" انہوں نے میری طرف استفسار طلب نگاہوں سے دیکھا۔

"چلئے جنت البقیع میں جاتے ہیں۔ خفتگان خاک سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"کیا خفتگان خاک بھی باتیں کرتے ہیں؟" انہوں نے جنت البقیع کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ وہ لوگ تھے جن کے وجود سے دھرتی شفا بن جاتی ہے۔''

بولے ''دروازے بند ہو چکے ہیں اور باہر سنگ راہ ہے۔''

''زبان کی نزاکتیں ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ماہرین لسانیات نے نقطوں کے ہیر پھیر سے محرم کو مجرم بنا دیا۔''

ملک صاحب کچھ سمجھتے ہوئے کچھ نہ سمجھتے ہوئے مسکرائے۔

ہم سیڑھیاں چڑھ کر جنت البقیع کے مرکزی گیٹ تک پہنچ گئے۔ گیٹ بند تھا۔ ایک نہایت وزنی تالہ غالباً اس خیال سے لگایا گیا تھا کہ کوئی توڑ نہ سکے۔ ۱۹۵۰ء کے وسط میں ہزاروں ایرانیوں نے حفاظتی دیواریں توڑ ڈالی تھیں۔ پچاس ہزار لوگوں نے اندر جا رک جب گریہ وزاری شروع کی تو اقتدار کے ایوانوں میں لرزہ طاری ہوا۔ اس کے بعد محدود وقت کے لیے زیارت کی اجازت دے دی گئی۔ ہم نے باہر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی اور دوسری سیڑھیوں سے نیچے اتر آئے۔ ہم چلتے چلتے گورنر مکہ کے دفتر کے سامنے آ گئے۔ ملک صاحب نے گورنر کے متعلق بتایا کہ وہ شاہی خاندان سے ہے۔ نہایت زیرک اور بیدار مغز ہے اور مسجد کی مزید توسیع کا خواہاں ہے۔

''کوئی ایسی اہم پوسٹ بھی ہے جس پر عوام میں سے کوئی فائز ہو۔'' میں نے پوچھا۔

کہنے لگے ''جو کچھ کیا گیا ہے وہ منطقی طور پر درست ہے۔''

''اچھا وہ کیسے؟''

''سلطنت کے استحکام کے لیے' بہتر انتظام کے لیے۔ خاندان کی حفاظت کے لیے.....!'' اچانک میری نظروں کے سامنے شیکسپیئر کا ایک کردار شاہ میکبتھ ابھرا جو اپنے کسی مشیر کو کہہ رہا تھا۔

To be thus (is nothing than to be safely a thus.(king

ملک صاحب اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے۔ ''کہنے کو تو لوگ بہت کچھ کہتے ہیں۔ لکھنے کے زاویے بھی بے شمار ہوتے ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی کسی طور انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شاہی خاندان نے سلطنت کو استحکام بخشا ہے۔ حرمین شریفین کی توسیع اور تزئین و آرائش کا فریضہ پورا کیا ہے۔ معیشت مضبوط کی ہے اور لوگوں کا معیار زندگی بلند کیا ہے۔ یہاں کی بادشاہت کئی جمہوریتوں سے بہتر ہے۔''

''چلیں آپ کا استدلال مان لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''لفظ چلیں پر آپ نے کچھ زیادہ زور ڈال دیا ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرائے۔

ہم چلتے چلتے ثقیفہ بنی ساعدہ پہنچ گئے۔ عمارت نہیں تھی صرف کھجوروں کے چند درخت تھے اور جنگلہ لگا کر جگہ محفوظ کر لی گئی تھی۔ یہ مسلمانوں کی پہلی اسمبلی تھی۔ تمام اجتماعی فیصلے اسی جگہ پر ہوتے تھے۔ آنحضور کی رحلت کے بعد جب خلافت کا مسئلہ اٹھا تو وہ بھی اسی جگہ حل کیا گیا تھا۔ انصار کا اپنا استدلال تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے نوزائیدہ اسلام کو پناہ دی تھی' رسالت مآب کے لیے دیدہ دول فرش راہ کیا تھا جو ہر مہاجر کے لیے اپنی نصف جائیداد سے دستبردار ہو گئے تھے۔ وہ جانشین رسول بننا چاہتے تھے۔ مہاجرین کا اپنا نکتہ نظر تھا۔ خلافت صرف مدینے تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کا دائرہ کار بہت دور تک پھیلا تھا۔ افہام وتفہیم کے ذریعے مسئل حل ہو گیا۔ انصار نے ایک بار پھر بے پناہ قربانی کا مظاہرہ کیا۔

سقیفہ بنی ساعدہ کے ساتھ ہی سڑک کے دوسری جانب ہوٹلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہوٹلوں کے علاوہ بے شمار پلازے ہیں جن کے مالکان زائرین کو کمرے کرایے پر دیتے ہیں۔ حج اور رمضان المبارک کے مہینے میں کرائے کئی گنا زیادہ ہو جاتے ہیں۔ انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل سے دو بلاک کے فاصلے پر اوبرائے ہوٹل ہے۔ ملک صاحب بتانے لگے۔ ''جب بھی آپ کو اس کے نیچے دو کالے رنگ کی مرسیڈیز کھڑی نظر آئیں اور ان کے ساتھ چار گارڈز ہوں تو سمجھ جائیں کہ میاں نواز شریف زیارت کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ میاں صاحب بڑے تسلسل کے ساتھ مسجد نبوی میں نماز پڑھنے آتے ہیں۔

اس رات ہم بڑی دیر تک مدینے کی گلیوں اور بازاروں میں گھومتے رہے۔ صبح مجھے واپس جدہ جانا تھا۔ حکومت کی طرف سے مقرر کردہ وقت (۱۰ یوم) پورا ہو گیا تھا۔ میرا پاسپورٹ معلم کی حراست میں تھا۔ میرے پاس صرف کڑا اور تصویر تھی۔ شرائط کڑی تھیں لیکن شاید درست تھیں۔ پچیس لاکھ لوگوں کی آمد و رفت کو ریگولیٹ کرنا پڑتا ہے نہیں تو کسی نہ کسی حادثے کا احتمال رہتا ہے۔ پہلے ہر سال ہزاروں لوگ مرتے تھے۔ خیموں میں آگ لگ جانے سے' رمی کرتے وقت' موٹر ایکسیڈنٹ اور بیماریوں کی وجہ سے۔ حکومت نے بہتر پلاننگ کر کے کافی حد کت ان پر قابو پا لیا ہے۔ جہاں ہم تنقید کرتے ہیں وہاں مثبت کارنوموں کا ذکر نہ کرنا بھی زیادتی ہے۔ کراؤن پرنس بڑا بیدار مغز ہے۔ آداب حکمرانی اور ڈپلومیسی اس کو ورثے میں ملے ہیں۔ انہوں نے اپنی ذہانت سے انہیں آگے بڑھایا ہے۔ جہاں ضرورت پڑی ہے انہوں نے جرات و ہمت اور فہم و فراست کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ سپر پاورز سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کی ہیں سرنیوڑا کر جی حضوری نہیں کی۔ ہوسکتا ہے کہ کراؤن پرنس کی یہ روش کئی آنکھوں میں کھٹکتی ہو لیکن لاکھوں آنکھوں کا تارا بھی اسی جذب دروں سے بنا جا سکتا ہے۔

جب ہم رباط مکی پہنچے تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ مولوی منظور انتظار کر رہا تھا۔ بولا۔ ''بڑی دیر لگا دی چلیں احمد لمبات' سعید شاہ آبادی اور مولانا مطیع الرحمن آپ کا انتظار کر رہے ہیں'' ہم اوپر گئے تو سب لوگ کھانا کھا رہے تھے' ہم بھی شامل ہو گئے۔ مولوی منظور بہر سے کھانا لایا تھا۔ چکن بریانی۔ مرغ مسلم اور قورمہ۔

''مولوی! کیا بات ہے۔ آج زبردست ضیافت کا اہتمام کیا ہے کہیں لاٹری تو نہیں نکلی؟'' میں نے ازراہ تفنن پوچھا۔

''اس کی منگنی ہو گئی ہے دوسری شادی کر رہا ہے۔'' احمد لمبات صاحب نے گرہ لگائی۔

''پہلی تو سنبھالی نہیں جاتی دوسری کو بھی خوار کرے گا۔'' مولانا مطیع الرحمن مسکرائے۔

''کیا واقعی شادی کر رہے ہو؟'' ملک اللہ بخش کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ بولا ''تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ میں ساٹھ سال کا جوان ہوں بس ایک مسئلہ ہے۔'' وہ ایک لمحے کے لیے رکا ''میری تنخواہ میری توبہ ہے۔'' سب محفل کشت زعفران بن گئی۔

''اس کی فکر نہ کرو سب خرچ میں برداشت کروں گا۔'' احمد لمبات اسے گھیرتے ہوئے بولے۔

''تو پھر تلاش بھی آپ کے ذمے رہی۔'' مولوی منظور نے معنی خیز نظروں سے انہیں دیکھا۔

بولے! ''تم ہاں تو کرو۔ وہ بھی ہو جائے گا۔ حیدر آباد (ہندوستان) میں دس ہزار روپے پر شادی کے لیے دلہن مل جاتی ہے۔''

حیدا آباد نہیں' افریقہ۔ افریقہ' نئی نویلی' کالی کلوٹی' دلہن۔'' مولانا مطیع الرحمن نے لقمہ دیا۔

احمد لمبات کہنے لگے۔ ''میں نے اس کو ٹکٹ بھیج کر افریقہ بلایا تھا لیکن عورتوں کو دیکھ کر یوں بدکتا ہے جیسے اڑیل گھوڑا اپنے سائے سے ڈرتا ہے۔''

''اب اس کو گھوڑے سے تو تشبیہ نہ دیں۔'' مولوی کڑوا بولے۔

''تو اور کس چیز سے دوں؟''

''کسی سے بھی نہیں'' مولوی منظور مسکرایا؟ یہ زردہ کھائیں میں نے خصوصی طور پر آپ لوگوں کے لیے بنایا ہے۔''

کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ احمد لمبات کی شخصیت نے بھی بڑا متاثر کیا تھا۔ محبت سادگی' زہد و تقویٰ یکجا ہو گئے تھے۔

ایک بار پھر ممتاز قانون دان' ایک اچھا رفیق' رقیق القلب' مجھے جنوبی افریقہ آنے کی دعوت دی' کہنے لگے۔ ''میں سپانسر شپ لیٹر اور ٹکٹ بھیج دوں گا۔ سنا ہے کہ آپ کو کرکٹ کا بڑا شوق ہے۔ فروری میں وہاں ورلڈ کپ ہو رہا ہے۔ آپ جیسے نیک لوگ آئیں تو شاید پاکستان ورلڈ کپ جیت جائے۔''

عرض کیا'' کرکٹ بورڈ' زاہدوں اور پارساؤں سے بھرا پڑا ہے۔
ایک سے بڑھ کر ایک بلکہ اب تو پارسائی کناروں سے چھلکنے لگی ہے۔''
''میں کچھ سمجھا نہیں'' قدرے حیران ہو کر بولے۔''
'' کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔'' ملک صاحب برجستہ بولے۔
''اب کچھ کچھ سمجھ گیا ہوں!'' احمد لمبات مسکرا پڑے۔

وقت کس قدر تیزی سے گزرتا ہے اس کا احساس حجاز مقدس میں ہوا۔ تیس دن گزر گئے۔ تیس سن جو ساری عمر پر محیط تھے۔ تیس یوم جو حاصل زندگی تھے' جہاں گرد اپنے وجود سے اترتی ہوئی دیکھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دل و جان ہر بوجھ سے آزاد ہو گئے ہوں۔ صدیوں کا بارگراں بھاپ بن کر فضا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ تعصب' انا' رقابتیں پاش پاش ہو گئی تھیں۔ پینتیس سال تک میں سرکاری نوکری کے تنے ہوئے رسے پر ایک بازی گر کی طرح جھولا تھا۔ آدھا وقت نوکری کی اور باقی اس کی حفاظت میں گزر گیا۔ ہزار وسوسے ذہن کے زندان میں پڑے رہتے۔ لاکھ اندیشے ہر موڑ پر دامن گیر ہوتے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ جب میں رحیم یار خان میں ڈپٹی کمشنر تعینات ہوا تو جاپان سے پاکستانیوں نے دعوت دی۔ وہ ٹوکیو میں میری کتاب ''اجنبی اپنے دیس میں'' کی تعارفی تقریب کروانا چاہتے تھے۔ کسی دوست نے مشورہ دیا۔ ہرگز نہ جانا۔ تم تازہ تازہ ڈی سی لگے ہو۔ باہر گئے تو تار کھینچ جائے گی۔ یہاں لوگ حج پر جاتے ہیں تو واپسی پر تبادلے کا پروانہ ائیر پورٹ پر وصول کرتے ہیں۔ میں ڈر گیا اور معذرت کر لی۔ اب جبکہ میں خود حج پر آیا تھا تو مجھے کوئی ڈر خوف نہ تھا۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ شاہ دو عالم کے دربار میں آنے والے شاہوں سے کہاں ڈرتے ہیں۔ بیوروکریسی کے حقیر کل پرزے میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ یہ لوگ جن کی تمام زندگی منافقت سے عبارت ہے۔ سازش خون کی طرح ان کی ہر رگ میں دوڑتی ہے جو خواب کی حالت میں بھی پندار مناصب میں گرفتار رہتے ہیں جو زعم اقتدار میں ہر اخلاقی قدر کو پائمال کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں سے کیا ڈرنا ہے!

تو چرا باشی بفکر مبتلا
کار سازما بفکر کارما
فکر ما' در کار ما' آزار ما

صبح کو جب میں مدینہ میں آخری نماز کے لیے اٹھا تو دل پر بڑا بوجھ تھا۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا' میں نے چار سو نگاہ

دوڑائی۔ یہ خواب نہیں تھا۔ دیوار کا کلاک مسلسل ٹک۔ ٹک کر رہا تھا۔ احباب کے لیے خرید کردہ کھجوروں کی مہک نے سارا کمرہ معطر کر رکھا تھا۔ رات کو ملک اللہ بخش نے سامان کو جس طرح نائیلون کی رسیوں سے کس جکڑ کر باندھا تھا اسی حالت میں تھا دروازے پر مانوس دستک ہوئی۔ ''شاہ صاحب'' یہ مولوی منظور کی آواز تھی۔ ''اٹھئے کہ اب تو لذت خواب سحر گئی۔'' اس نے باہر سے ہنکارا بھرا۔ لذت واقعی ہاتھ سے نکلتی جا رہی تھی لیکن یہ خواب سحر کی نہیں بلکہ شب بیداری کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ دیار حبیب میں کوئی چیز نہیں سوتی وہ جو بظاہر سو رہے ہوتے ہیں وہ بھی حقیقتاً بیدار ہوتے ہیں اس صبح مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے نماز جلد ختم ہو گئی تھی امام صاحب نے مختصر آیات پڑھی تھیں۔ جیسے سورج خلاف معمول جلد نکل آیا تھا۔ پرندے اپنے گھونسلوں بلاوجہ باہر نکل آئے ہوں۔

مطعم نور میں میں نے چائے کا پہلا گھونٹ ہی پیا تھا کہ ہوٹل کا کارندہ محمد خان آ گیا۔ ''صاحب جی! آپ جا رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں اور کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''پھر کب آئیں گے؟''

''جب مولا نے بلاوا بھیجا آ جائیں گے۔''

کہنے لگا ''میرا ایک کام ہے اگر کچھ مدد کر سکیں۔''

''بتاؤ! میرے لیے اس سے بڑھ کر اور خوشی کیا ہوگی۔''

''میرے بھائی کو لودھراں میں شریکوں نے مار ڈالا ہے۔ ملزم صاف بچ گئے ہیں اور اب دندناتے پھرتے ہیں۔ رو رو کر میری ماں کی نظر دھندلا گئی ہے۔ میرے بوڑھے باپ کی کمر دہری ہو گئی ہے۔ میں یہاں نوکری کرتا ہوں لیکن ذہن پیچھے ہے۔ صاحب جی ہماری مدد کریں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں اسے کیا بتاتا کہ اب جب کہ عدالت نے فیصلہ دے دیا ہے میں اس کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ انگریز نے قانون کی بنیاد اس مفروضے پر رکھی تھی کہ چاہے سو گنہگار بچ جائیں ایک بے گناہ کو سزا نہیں ہونی چاہیے۔ میں اسے کیونکر سمجھاتا کہ یہاں سو گنہگار تو بچ جاتے ہیں لیکن ایک آدھ بے گناہ ضرور لٹک جاتا ہے۔ لوگ گھر سے قسم کھا کر نکلتے ہیں کہ عدالتوں میں سچ نہیں بولنا۔ عدالت کے اپنے مسائل ہیں۔ انصاف اس قدر مہنگا ہو چکا ہے کہ غریب آدمی کی پہنچ سے باہر ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک وکیل بحث کے وقت کمرہ عدالت میں زور زور سے میز پر ہاتھ مار کر کہہ رہا تھا۔

''I want favour, I want favour, I want favour''

''کیا کہا؟'' جج نے غصے سے اس کی طرف دیکھا! ''ہم یہاں انصاف کرنے کے لیے بیٹھے ہیں؟''

''That is favour in this country, My Lord.''

اس نے برجستہ جواب دیا۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں ہر ماہ کے آخری منگل اور بدھ کو ملتان اور جمعرات کو بہاولپور میں عدالت لگاتا ہوں۔ آپ کے والدین مجھ سے مل لیں انصاف کے حصول کے لیے مجھ سے جو کچھ ہو سکا کروں گا۔''

جب میں رباط مکی پہنچا تو ملک اللہ بخش اور مہر سعید میرا انتظار کر رہے تھے۔ ملک صاحب گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''جلدی کریں جہاز کی روانگی کا وقت قریب آ رہا ہے۔''

''آپ لوگوں نے کیوں تکلیف کی۔ میں ٹیکسی پکڑ لیتا۔ ائیر پورٹ تک تو جانا ہے۔''

''اب اس سعادت سے ہمیں محروم نہ کریں۔'' مہر سعید بولے

''ماں باپ نے آپ کا نام بڑا سوچ سمجھ کر رکھا ہوگا۔'' میں ان کے خلوص سے متاثر ہو کر بولا۔

ہم نصف گھنٹے میں مدینہ ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ چھوٹا سا صرف ستھرا ائیر پورٹ جہاں زیادہ گہما گہمی اور چہل پہل نہ تھی' اکا دکا لوگ ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ ملک صاحب نے بورڈنگ کارڈ بنوایا۔ ہم لوگ غالباً آخری مسافروں میں سے تھے۔ جلد ہی مائیک پر اعلان ہوا کہ مسافر لاؤنج میں تشریف لے جائیں۔ میں ملک صاحب اور مہر سعید سے گلے ملا۔ مجھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان کے خلوص اور محبت کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں' شاید اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اعضا کی بھی اپنی زبان ہوتی ہے اور کس فصاحت و بلاغت اس میں ہوتی ہے اس کا اظہار لفظوں سے نہیں ہو سکتا۔

جہاز فضا میں بلند ہوا تو میں نے شہر دیکھنے کی کوشش کی۔ پاس ادب کی وجہ سے کوئی جہاز ان دو شہروں کے اوپر سے نہیں گزرتا۔ نیچے صرف کھجور کے جھنڈ اور باغات نظر آئے۔ جلد ہی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بے آب و گیاہ پہاڑ۔ میں مسلسل انہیں دیکھ رہا تھا۔ صرف ایک خیال ہی میں غرق رہا۔ حضور نے ہجرت کے وقت کونسا پہاڑی راستہ اختیار کیا تھا۔ خیال میں ان قدموں کے نشانات کو تلاش کرتا رہا جنہوں نے دھرتی کا مقدر چمکایا تھا۔ ''آپ کیا پئیں گے؟'' اسٹیوارڈ میرے انہماک میں مخل ہوا۔''

کچھ بھی نہیں! بس مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔'' پینتیس منٹ کی پرواز تھی۔ وقت پلک جھپکنے میں گزر گیا اتنے میں اسی اسٹیوارڈ کی آواز

گونجی۔حفاظتی بیلٹس باندھ لیں۔ہم جدہ ائیر پورٹ پر اترنے والے ہیں۔''

جدہ ائیر پورٹ یقیناً دنیا کے بڑے اور اہم ائیر پورٹس میں سے ایک ہے بلکہ ایک اعتبار سے اسے کائنات کا پہلا ہوائی مستقر قرار دیا جا سکتا ہے۔حضرت حوا جنت سے پرواز کر کے یہاں اتری تھیں اس وقت سے ہی ابن آدم کے دل میں پرواز کی خواہش کروٹیں لیتی رہی۔انسان بڑی حیرت اور حسرت سے خلاؤں کو گھورتا رہا۔فضاؤں کو حسرت سے تکتا رہا۔اس درمیانی عرصے میں صرف حضرت سلیمان کو ہوائی قالین عطا ہوا لیکن وہ خود ہی اس پر ہلارے لیتے رہے۔اپنے بھائی بندوں کو شریک نہ کیا۔صرف ایک دفعہ درسخاوت کھلا تو وہ بھی ملکہ بلقیس کے لیے جس کے حسن کی پرواز مادی سہاروں کی محتاج نہ تھی۔

جدہ میں کافی دیر تک پھرتا رہا اس کے بازاروں' عمارتوں' محلوں کو دیکھتا رہا اور جب پرواز سے تین گھنٹے قبل میں پی آئی اے کے کاؤنٹر پر پہنچا تو ڈیوٹی افسر نے مجھے بڑے غصے سے گھورا۔

''آپ لیٹ ہیں۔فلائٹ کلوز ہوگئی ہے۔''اس نے کندھے اچکائے۔

''ابھی تین گھنٹے باقی ہیں۔''میں عام پرواز کا عادی تھا۔

بولا''کارڈ میں لکھا ہوا ہے کہ آٹھ گھنٹے پہلے رپورٹ کریں۔اب آپ کو دو تین دن ائیر پورٹ پر انتظار کرنا ہوگا۔''

''دو تین دن اس ائیر پورٹ پر جہاں بنچ تک نہیں ہے۔''اس کے لفظ وزنی ہتھوڑے کی طرح میرے کانوں پر گرے۔میں برا پھنسا تھا بہر حال ہمت کرتے ہوئے میں نے کہا صاحب کچھ کریں میں پاکستانی ہوں۔

کہنے لگا''یہاں ہر مسافر پاکستانی ہے۔''

''میں ملازم سرکار ہوں۔''میں نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔

''ان کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے۔''

''میں ممبر بورڈ آف ریونیو ہوں۔''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''اس نے استفسار کیا۔

مجھے پی آئی اے کا جمبو فضا میں بلند ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

گھبراہٹ میں میں نے آخری حربہ استعمال کیا۔شاید میں ٹھیک طرح سے اپنا تعارف نہیں کرا سکا۔میں سابق کمشنر بہاولپور ہوں۔''

''رکو!رکو!''اس نے اپنے دوسرے ساتھی کو آواز دی جو کاغذات کا پلندا اٹھائے سعودی امیگریشن کی طرف جا رہا تھا۔کہنے لگا۔''کمشنر

صاحب اگر آپ مزید پانچ منٹ بھی لیٹ ہوتے تو میں بھی کچھ نہ کرسکتا۔ جب ایک دفعہ کاغذات سعودیوں کے پاس پہنچ جائیں تو پھر ہماری عملداری ختم ہوجاتی ہے۔ ''ٹکٹ نکالیں میں آپ کو بورڈنگ کارڈ دیتا ہوں۔ شاید زیادہ آرام دہ سیٹ نہ دے سکوں کیونکہ تاخیر کی کچھ نہ کچھ سزا تو ملنی چاہیے۔''

''وہ مجھے مل چکی ہے!'' میں نے کہا۔

''وہ کیسے؟''

بس میں واپسی کا سفر نہ کرنے کا ۹۵ ریال کا ری فنڈ ووچر کیش نہیں کرا سکتا۔ دیر جو ہوگئی ہے۔''

میں نے بورڈنگ کارڈ لیا۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ سامان کی بکنگ دوسرے گیٹ پر تھی جو ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ٹرالی کو دھکیلتا ہوا بھاگم بھاگ وہاں پہنچا اور بورڈنگ کارڈ بنوایا۔ کسٹم اور امیگریشن کے کاؤنٹر پر لمبی قطار لگی تھی۔

جہاز رات کو دو گھنٹے کی تاخیر سے چلا۔ ظاہر ہے کہ اس میں سب حاجی تھے۔ سب کے چہروں پر ایک طرح کے تاثرات تھے بالکل ایسے جیسے ایک کوہکن کے چہرے پر پہاڑ کی چوٹی سر کرنے کے بعد ہوتے ہیں۔

سکون۔ طمانیت۔ تفاخر اور ہلکا سا تکبر۔ حج بھی ایک روحانی ہمالہ ہے۔ برس ہا برس کی خواہش اور تپسیا کے بعد لوگ یہاں تک پہنچتے ہیں۔ خالق کائنات کے حضور گڑگڑاتے ہیں اور اپنے پہلے گناہ بخشوا کر چلے جاتے ہیں۔ بالکل جس طرح میونسپلٹی کا ڈرین برسات میں دھل کر نہر کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور وقتی طور پر اس کا سارا تعفن ختم ہوجاتا ہے۔

جہاز میں سارا عرصہ خاموشی رہی۔ میرے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھا ہوا ایک دیہاتی مجھے بار بار گھور رہا تھا۔ پہلے تو میں نے کچھ نوٹس نہ لیا لیکن جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ شاید کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن ہمت نہیں کر پا رہا۔ ''خیریت تو ہے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''ایک بات پوچھوں؟ اس نے رکتے رکتے کہا۔

''ہاں، ہاں..... ضرور!'' میں نے سمجھا کوئی شرعی مسئلہ پوچھنا چاہتا ہے۔

''تو پھر پوچھ لوں؟'' اس کے لہجے میں ہنوز ہچکچاہٹ تھی۔

''بھئی کہہ جو دیا ہے، کیا تم کسی تکلیف میں ہو؟''

بولا ''ذہن میں تھوڑی سی کھد بھد ہو رہی ہے۔''

''تو اسے صاف کر ڈالو۔''

پوچھنے لگا ''آپ کون ہیں؟''

''میں بھی تمہاری طرح گوشت پوست کا بنا ہوا انسان ہوں۔''

''وہ تو ہیں! لیکن آپ کی وردی جہاز کے عملے سے مختلف ہے'' اس نے میرے سفاری سوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ''سر پر آپ نے استرا بھی نہیں پھروایا۔ ابھی آپ مکے سے آرہے ہیں! آپ حاجی تو نہیں لگتے۔ آپ کون ہیں؟''

''کیہ جاناں میں کون؟'' اچانک بلھے شاہ میری نگاہوں کے سامنے ابھرا۔ میں نے اسے تھپتھپاتے ہوئے کہا ''میں خود بھی اپنی تلاش میں گھر سے نکلا ہوں۔ جس دن مجھے پتہ چل گیا تمہیں خط لکھ دوں گا۔''

جہاز لاہور نہ اتر سکا۔ موسم خراب تھا۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی' کراچی میں ہمیں چند گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ بال آخر جب جہاز لاہور ائیر پورٹ پر اترا تو صبح صادق پھوٹ رہی تھی اور ہر چیز تیز بارش میں دھل کر نکھر گئی تھی۔ درخت، پتے، عمارات صاف نظر آ رہے تھے۔

''آپ حاجی تو نہیں لگتے!'' اس دیہاتی کے لفظ میرے کانوں سے ٹکرائے۔ میں نے اپنے اندر جھانکا۔ کیا تیز بارش نے میرے من کو بھی اجلا کر دیا تھا؟

◆◆◆